روایاتِ تمدّنِ قدیم

علی عبّاس جلالپوری

روایاتِ تمدّنِ قدیم

علی عبّاس جلالپوری

اکرم آرکیڈ، ۲۹۰ ٹمپل روڈ (صفاں والا چوک) لاہور۔ پاکستان فون: ۷۲۳۸۰۱۴

نام کتاب : روایاتِ تمدنِ قدیم

ناشر : تخلیقات، لاہور۔

اہتمام : لیاقت علی

سنِ اشاعت : 2012ء

پرنٹر : اکرم پریس لاہور۔

ضخامت : 288 صفحات

قیمت : -/320 روپے

حامد رضا
کے
نام

مشمولات

پیش لفظ ―――― ۹

۱۔ عراق ―――― ۱۱

۲۔ مصر ―――― ۳۹

۳۔ کنعان ―――― ۶۰

۴۔ بنی اسرائیل ―――― ۸۰

۵۔ یونان ―――― ۱۲۲

۶۔ ایران ―――― ۱۵۱

۷۔ ہند ―――― ۱۸۳

۸۔ چین ―――― ۲۴۵

پیش لفظ

علم الانسان کے طلبہ لکھتے ہیں کہ ہر وہ کام جو بنی نوع انسان نے بہ حیثیت انسان ہونے کے سرانجام دیا ہے تہذیب یا کلچر کے ضمن میں آجاتا ہے۔ دوسری طرف ابن خلدون اور سپنگلر نے تمدّن کو شہری زندگی تک محدود کر دیا ہے۔ بعض اہلِ علم نے تہذیب اور تمدّن کے معانی میں تفریق کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمدّن انسان کی خارجی ترقی کا نام ہے جب کہ تہذیب سے مُراد اُس کا داخلی یا ذہنی اِرتقا ہے۔ راقم الحروف اِس تفریق کا قائل نہیں ہے۔ اُس کے خیال میں جس طرح علم ذہن اور مادے کے باہمی عمل و ردِّ عمل کی مربوط و بامعنی صُورت ہے اِسی طرح تمدّن بھی انسان کے خارجی ماحول اور اُس کے ذہن کے باہمی عمل و ردِّ عمل ہی کی ایک تخلیقی شکل ہے چنانچہ اُس نے تمدّن کی ترکیب کو وسیع تر مفہوم میں اِستعمال کیا ہے یعنی اِس میں تہذیب بھی مشمول ہے۔

زرعی اِنقلاب کے ساتھ جب انسان نے فصلیں اُگانے کا راز دریافت کر لیا تو شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بجائے وہ دریاؤں کے کناروں پر کھیتی باڑی کرنے لگا، بستیاں بسا کر رہنے لگا اور خوراک فراہم کرنے کے بجائے خوراک پیدا کرنے لگا۔ اِس مرحلے پر وہ وحشت کے دَور سے نکل کر تمدّن کے دَور میں داخل ہو گیا۔ مُتمدّن زندگی کے آغاز پر کم و بیش دس ہزار برس گُزر چکے ہیں۔ یہ عرصہ آفاقی زمان و مکان کی بے پناہ وسعتوں اور پہنائیوں میں تبسّمِ شرار سے

زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن اسی فرصتِ قلیل میں انسان نے شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں اور اُس کے قدم مردانہ وار آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس ترقّی کا راز شروع ہی سے اُس کی محنت و مشقّت میں مخفی رہا ہے جس سے اُس کے ذہنی جوہر کو نشو و نما پانے کی تحریک و تشویق ہوتی رہی ہے۔ اُس کی سوچ نے اُس کے ہاتھوں کو کام کرنے پر آمادہ کیا اور اُس کے کام نے اُس کے ذہن و دماغ کی جلا کا سامان بہم پہنچایا۔ مُشکلات کا شعُور اور ان کے حل کی کاوش ــــــ یہی تمدّن نوعِ انسان کے آغاز و ارتقار کا مرکزی نقطہ ہے۔

قدیم تمدّن کا مطالعہ بوجوہ ضروری ہے۔ اِس سے ایک تو یہی نوعِ انسان کی فکری و ذوقی یکجہتی کا ثبوت ملتا ہے، دوسرے اِس حقیقت کا اِنکشاف ہوتا ہے کہ ایک ہی جیسے مسائل کو سُلجھانے کے لیے اقوامِ عالم مختلف وسائل سے کام لیتی رہی ہیں، تیسرے یہ راز کُھل کر سامنے آتا ہے کہ عالمی تمدّن کی تشکیل میں تمام اقوام و ملل نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے اور ایک دوسرے سے اِستفادہ بھی کیا ہے، چوتھے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دَور کے مسائل کی تہ تک پہنچنے کے لئے بھی اُنکی جڑوں کا کھوج قدیم زمانوں تک لگانا ضروری ہے۔ کسی بھی مسئلے کا عالمی تمدّن کے تناظر سے ہٹ کر مطالعہ کرنا گُوناگُوں مغالطوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ ' روایاتِ تمدّنِ قدیم ' میں یہی تناظر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جلال پور شریف
۷۔ اگست ۱۹۶۸ء

علی عباس جلالپوری

عراق

جس ملک کو آج کل عراق کہتے ہیں اسے عہدنامہ قدیم میں "ارم نہرین" (دو دریاؤں کے درمیان کا ملک) کہا گیا ہے۔ یونانی زبان کے لفظ میسوپوٹیمیا کا معنیٰ بھی یہی ہے۔ عہدنامۂ قدیم کا باغِ عدن اسی دوآبے میں لگایا گیا تھا۔

"اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لیے اچھا تھا زمین سے اُگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا اور عدن سے ایک دریا باغ کے سیراب کرنے کو نکلا اور وہاں سے چار ندیوں میں تقسیم ہوا۔ پہلی کا نام فیسون ہے جو حویلہ کی ساری زمین کو جہاں سونا ہوتا ہے، گھیرے ہوئے ہے اور اُس زمین کا سونا چوکھا ہے اور وہاں موتی اور سنگ سلیمانی بھی ہیں اور دوسری کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری سرزمین کو گھیرے ہوئے ہے اور تیسری کا نام دجلہ ہے جو اسور کے مشرق کو جاتی ہے اور چوتھی کا نام فرات ہے۔"

عراق کا میدان اُس چکنی مٹی سے بنا ہے جو دریائے دجلہ و فرات اپنے ساتھ پہاڑوں سے بہا کر لاتے رہے ہیں۔ زرخیزی کے باعث اِس میدان کو ہلالِ زرخیز کا نام بھی دیا گیا ہے۔ دریائے دجلہ آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلتا ہے اور دریائے فرات کوہ طارس سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ خلیج فارس میں گرنے سے پہلے دونوں دریا باہم مل جاتے ہیں۔ مقامِ اتصال سے آگے اِسے شط العرب کہا جاتا ہے۔ اس میدان کی زرخیزی کے باعث گرد و پیش کی صحرانشین قومیں قدیم زمانے سے اِسے رشک اور حرص کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہیں اور بار بار اِس پر حملہ آور ہوتی رہی ہیں۔ اِس دوآبے کے زیریں حصے کو بابی لونیا یا کالدیا کہتے تھے۔ سُمیریوں، اکادیوں، اشوریوں، ایرانیوں اور عربوں نے اپنے اپنے دورِ تسلّط میں دجلہ و فرات کے کناروں پر بڑے بڑے بارونق شہر آباد کئے جن میں اُور، کِش، بابل، نینوا، مدائن، بغداد اور بصرہ نے شُہرت پائی۔

صدیٔ رواں کے اوائل تک مورخین کا خیال تھا کہ وادیٔ نیل تمدّنِ نوعِ انسانی کا اوّلین گہوارہ ہے لیکن معاصرین کی اکثریّت نے اِس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ تمدّن کی داغ بیل عراق میں ڈالی گئی تھی۔ اور اِس پہلو سے سُمیریوں کو شرف اولیّت حاصل ہے۔ شروع شروع میں سُمیریوں کو اکادی کہا جاتا تھا لیکن فرانسیسی عالم ژوولے اور پرت نے انہیں سُمیری کا نام دیا اور یہی نام دُنیائے عِلم میں رواج پا گیا۔ سُمیریوں کے اصل و نسل کا راز ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ کہاں سے آئے تھے۔ البتّہ یقینی بات یہ ہے کہ وہ سامی الاصل نہیں تھے اور سامیوں سے بہت پہلے تمدّن کے برکات سے رُوشناس ہو چکے تھے۔ یہ تمدّن پانچ ہزار برس قبل از مسیح تک کا پرانا ہے۔

عراق کے میدانوں میں بارش کم ہوتی ہے اور سال کا بیشتر حصہ تیز دھوپ چمکتی ہے اس لیے کھیتی باڑی کے لیے آب پاشی نہائت ضروری ہے۔ سُمیریوں نے دریائے فرات پر بند باندھ کر نالیاں نکالیں اور تپتی ہوئی زمین کو لہلہاتے ہوئے سرسبز و شاداب کھیتوں میں بدل دیا۔

انھوں نے آب رسانی کا ایک باقاعدہ محکمہ قائم کیا۔ وہ اپنے کھیتوں میں جَو، زیتون، سَن اور انگور کی کاشت وسیع پیمانے پر کرتے تھے۔ خوراک کی فراوانی اور فراغت کے باعث سُمیریوں کو علوم و فنون کو ترقّی دینے کے مواقع مِل گئے۔ رفتہ رفتہ اُن کی بستیاں بڑے بڑے شہروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ ان میں اریدو، لگاش، اُور، لارسہ اور نِپّور کی شہری ریاستیں تاریخ عالم میں مشہور ہیں۔

مرورِ زمانہ سے اُور کا شہر سب ریاستوں پر غالب آگیا۔ (۲۱۵۰ء ـــــ ۲۰۵۰ء ق۔م) اور اس دوران میں سُمیری تمدن معراجِ کمال کو پہنچ گیا۔

سُمیریوں کے ہر شہر میں ایک حاکم اعلٰے ہوتا تھا جو نظم و نسق کو بحال رکھتا تھا اُسے 'اَن سی' کہتے تھے۔ سُمیریوں نے دنیا کے سب سے پہلے شہر تعمیر کیے۔ وہ اپنے مکان اینٹوں کے بناتے تھے جنہیں دھوپ میں سُکھا لیا جاتا تھا یا پزاوے میں پکایا جاتا تھا۔ اُن کے شہروں کی کھُدائی سے اِس بات کا انکشاف ہوا ہے کہ وہ مکان ایک دوسرے سے مِلا کر بناتے تھے۔ گلیاں تنگ ہوتیں، شہر کے گِرد فصیل تعمیر کرتے تھے جس کے باہر غریب مزدوروں کے جھونپڑے ہوتے تھے جو کہگِل سے بنائے جاتے تھے۔ ہر شہر میں ایک سات منزلہ زغورط ـــ لغوی معنی مُقدّس پہاڑی۔ تعمیر کرتے تھے۔ اِس منارے کی بالائی منزل پر دیوتا کا معبد ہوتا تھا۔ منارے کی بنیاد ایک بلند چبوترے پر رکھی جاتی تھی۔ معبد کے قریب پُجاریوں کے حُجرے ہوتے تھے اور ان سے مُتصّل سرکاری کارندوں، شراب کشید کرنے والوں، موچیوں، بافندوں اور گانے بجانے والوں کے مکان ہوتے تھے۔ معبد کے نواح میں اُن بھیڑ بکریوں کے باڑے بھی تھے جنہیں قُربانی کیلئے رکھا جاتا تھا۔ سُمیریوں نے بیل، بکری، بھیڑ اور کُتّے کو سدھا لیا تھا۔ انھوں نے ہل ایجاد کی اور پہیّہ بنایا جو لکڑی کا ایک بھدّا سا چکر ہوتا تھا اور جسے چھکڑوں میں لگاتے تھے۔ دریاؤں میں کشتیاں رواں دواں تھیں جنہیں رسّے باندھ کر کنارے سے کھینچتے تھے ان میں بادبان بھی لگائے جاتے تھے۔ جناب مسیح کی پیدائش سے تین ہزار برس قبل سُمیریوں نے کانسی کے ہتھیار اور اوزار بنانا شروع کر دیئے تھے جو تانبے کے ہتھیاروں سے زیادہ مضبوط تھے۔

شہری صنعتوں کو ترقی ہوئی تو خشکی اور تری دونوں راستوں سے مختلف شہروں میں تجارت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ بعض آثار سے مفہوم ہوتا ہے کہ سُمیریا کے بحری جہاز وادیٔ سندھ میں بھی جاتے تھے۔ شمال کی طرف خشکی کی ایک راہ شام کو جاتی تھی اور دوسری بحیرۂ رُوم کے ساحلی علاقوں کی طرف گھُوم جاتی تھی۔

سُمیری مجسمہ تراشی میں مہارت رکھتے تھے اُور کے قبرستان کی کھدائی میں ۲۷۰۰ ق م کا ایک صندوق ملا ہے جس میں بیلوں، شیروں اور گیدڑوں کے سیپ، چاندی اور سونے کے بنائے ہوئے خوش وضع مجسّمے دستیاب ہوئے ہیں۔ سُمیری ایک خاص فنِ تحریر کے موجد بھی ہیں۔ اُن کی رسمِ تحریر قدیم ترین سمجھی جاتی ہے۔ ابتدا میں اُنھوں نے بھی دوسری اقوام کی طرح تصویر کشی کو اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا تھا لیکن بعد میں علامتیں استعمال کرنے لگے۔ وہ نوک دار قلم یا ناخن سے گِلی الواح پر لکھتے تھے جنہیں دھوپ میں سُکھا کر یا آگ میں رکھ کر پکا لیا جاتا تھا۔ علمائے آثارِ قدیمہ نے اِس نوع کی ہزاروں گِلی الواح سُمیریا کے کھنڈروں سے برآمد کی ہیں۔ اِن میں سے بعض تین ہزار برس قبل از مسیح سے بھی پُرانی ہیں۔ سُمیری لکیروں اور میخوں کے نشانات سے جو اُن کی تحریری علامتیں تھیں لکھا کرتے تھے۔ انہیں میخوں کی رعایت سے اُن کے رسمِ تحریر کو خطِ میخی[1] کہا جاتا ہے۔

یہ رسمِ تحریر شروع سے آخر تک علامتوں ہی میں محصور رہی اور سُمیریوں نے فنیقیوں کی طرح حُروفِ ابجد مُرتّب نہیں کئے۔ اُن کے مدرسے معبدوں کے ساتھ ملحق ہوتے تھے جہاں پروہت بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ خطِ میخی خاصا مشکل تھا۔ سب سے پہلے اُستاد تختی کی بائیں جانب لکھتا جسے بچہ دائیں طرف نقل کرتا تھا۔ غلطی کو ہاتھ سے رگڑ کر مٹا دیتے

---

[1] انگریزی میں اسے CUNEIFORM کہتے ہیں جس کا مادہ لاطینی زبان کا لفظ CUNEUS (بہ معنی میخ) ہے۔

تھے۔ طالب علم سب سے پہلے تین میخی علامتوں کی مشق کرتا تھا۔ افقی، عمودی اور خم دار یعنی ــــ
۲ اور ۸، پھر انہیں ملا کر لکھتا جیسے ــــ ۲ ۷ جس کا تلفظ ہے "رلم"۔ اس قسم کے
سیکڑوں مرکبات حفظ کرنا پڑتے تھے اس کے بعد مذہبی کتابیں نقل کرائی جاتی تھیں۔
بچوں کی تختیوں سے بعض اہم کتابوں کے ابواب نقل کئے ہوئے ملے ہیں۔ دائیں سے
بائیں لکھنے کا رواج تھا۔ بعد میں بابلیوں نے بائیں سے دائیں لکھنا شروع کیا۔ طلبہ کو ریاضی
کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ سمیریوں کی گنتی ۱۰ کے ہندسے پر مبنی تھی جسے وہ ۶ سے ضرب دے کر
اگلا ہندسہ بناتے تھے۔ پھر ۶۰ کو ۱۰ سے ضرب دیتے اور پھر ۶۰۰ کو ۶ سے ضرب دیتے تھے۔
۶۰ کے ہندسے میں خوبی یہ ہے کہ اسے ۲۰، ۱۵، ۱۲، ۱۰، ۵، ۴، ۳، ۲ پر تقسیم کیا جا سکتا
ہے۔ ہم نے دائرے کو ۳۶۰ درجوں میں تقسیم کرنا سمیریوں ہی سے سیکھا ہے اور درجن کا تصور
بھی انہیں سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح دن رات کو گھنٹوں، دقیقوں اور ثانیوں میں تقسیم کرنا سمیریوں
سے لیا گیا ہے۔ سمیریوں نے معیاری اوزان اور پیمانے بھی بنائے تھے۔ ان کا وزن مِنا ساٹھ
شیکل پر مشتمل تھا اور آج کل کے ½ سیر کے برابر تھا۔ ساٹھ مِنا مل کر ایک ٹیلنٹ بناتے
تھے۔ بعد میں یہ اوزان بابلیوں کے واسطے سے مغربی ممالک یونان وغیرہ میں رواج پا گئے۔
سمیریوں کے یہاں سکوں کا رواج نہیں تھا۔ چاندی کے اوزان ہی سے سکوں کا کام بھی لیا جاتا
تھا۔

سمیریوں میں ذاتی املاک کے تحفظ کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنی تمام اشیاء حتیٰ کہ ملبوسات
اور جوتوں کی فہرستیں بھی بناتے تھے۔ کاروباری معاملات میں دستاویز لکھنے کا رواج تھا۔ شہر
کے بڑے دروازے پر کاتب بیٹھتے تھے جن سے دستاویزات لکھوائی جاتی تھیں۔ ان پر
خریدار اور بیچنے والے اپنی اپنی مہریں ثبت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ میخی علامات میں ہر قسم
کے علوم و فنون منتقل ہونے لگے۔ مذہبی احکام و روایات، تاریخ و سیر، فوجداری اور
مال کے قوانین، نظمیں، داستانیں وغیرہ گلی الواح میں محفوظ ہم تک پہنچی ہیں۔ بعد میں بابلیوں

اور اشوریوں نے میخی علامتوں کو اپنی اپنی زبانوں میں رواج دیا لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ سمیری تحریر مذہبی اور قانونی معاملات تک محدود ہو کر رہ گئی اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں فنیقیوں کے مرتب کئے ہوئے حروفِ تہجی رواج پا گئے۔ ڈنمارک کا ایک مساحت دان نی بوہر میخی تحریر کی ایک نقل اپنے ساتھ یورپ لے گیا۔ ایک جرمن فاضل جارج فریڈرک گروٹ فنڈ نے ایک مدت کی کاوش کے بعد میخی تحریروں کو پڑھنے کا راز دریافت کر لیا۔ دنیائے علم میں یہ کارنامہ ایک عظیم انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے۔

سمیری اپنے مکانوں میں ڈاٹ کا استعمال کرتے تھے۔ اُور کے معبد کی ایک ڈاٹ جو ۔ ۲ ق م میں بنائی گئی تھی، دریافت کی گئی ہے۔ بابل اور اشور کے واسطے سے یہ ڈاٹ ہر کہیں رواج پا گئی۔ اہلِ مغرب سکندر کے حملے کے ساتھ ڈاٹ کے استعمال سے روشناس ہوئے تھے۔ قوانین بھی پہلے پہل سمیریوں نے مرتب و مدون کئے تھے۔ حمورابی کا ضابطۂ قوانین جو سوسہ کے آثار سے برآمد ہوا ہے سمیری الاصل ہے۔ سمیریوں کا نظامِ معاشرہ مادری تھا جس میں عورت کو مرکزی حیثیت دی گئی تھی۔ بچے باپ کی بجائے ماں کے نام سے منسوب ہوتے تھے۔ ملک بھر میں 'نانا' دیوی یا دھرتی مائی کی پوجا کی جاتی تھی۔ اِس دیوی کا لقب 'مقدس پہاڑ کی ملکہ تھا۔ سمیریوں میں شمن مت بھی پھیل گیا تھا جس کا اساسی عقیدہ یہ تھا کہ اِس دنیا پر سعید اور شقی روحوں کا تصرف ہے جنہیں سحر و افسوں سے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔

سمیریوں کے ہاں بڑے معبود تین تھے۔ انو آسمان کا دیوتا جو خداوند خدا تھا اور شہر اُور کا بڑا دیوتا تھا، اَن لِل فضا اور زمین کا دیوتا جو شہر نپور کا سرپرست تھا، ایا پانی کا دیوتا جو دانش و خرد کا پاسبان تھا۔ بعد میں شمش یا آفتاب دیوتا خداوند خدا بن گیا۔ ان کے علاوہ ہر شہر کے مخصوص دیوتا تھے جن کے معبدوں میں ہر روز بھیڑ بکریوں کی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ بعض اوقات انسانی قربانی بھی دیتے تھے۔ وہ اپنے گھروں میں دیوتاؤں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے بنا کر رکھتے اور صبح و شام ان کی پوجا کرتے تھے۔

سُمیریا کی دیومالا کا مذاہبِ عالم پر گہرا اثر ہوا۔ اُن کا تکوین و تخلیق کا قصہ یہ تھا کہ ابتداً میں دُنیا ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی صورت میں تھی جس میں ایک مادہ اژدہا تیامت نام کی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ دیوتا ظاہر ہوئے اور اُنھوں نے فسادؔ و انتشار کو رفع کرنا چاہا۔ تیامت مانع ہوئی اور اژدہاؤں کی فوج لے کر مقابلے پر ڈٹ گئی۔ دیوتا اَن لِل نے ہواؤں کو مدد کے لیے بلایا۔ جب تیامت ایک عظیم اژدہے کی صورت میں منہ کھولے آگے بڑھی تو اَن لِل نے ہواؤں سے اس کا پیٹ بھر دیا اور وہ اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ تب اَن لِل نے اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا نیچے پھیلا کر زمین کا فرش بچھایا اور دوسرا اوپر تان کر آسمان کا شامیانہ کھڑا کیا۔ دیوتاؤں نے تیامت کے خاوند اژدہے کو بھی قتل کر دیا اور اُس کے خون میں مٹی گوندھ کر آدم کا پُتلا بنایا۔

ایک قصّے میں عالمگیر سیلاب کا ذکر آیا ہے جس میں اتناپشتم نے اپنی کشتی میں تمام حیوانات اور پرندوں کے جوڑوں کو پناہ دے کر سب کی جانیں بچائی تھیں۔ اس کے ساتھ گِل گامش کا رزمیہ ہے۔ گِل گامش شہر اروک سے شجرِ حیات کی تلاش میں نکلا اور ایک مدت تک خطرات و مصائب کا سامنا کرنے کے بعد بالآخر اُس کی یافت میں کامیاب ہو گیا۔ معاً پانی سے ایک سانپ نکلا اور شجرِ حیات چُرا کر بھاگ گیا۔ اس رزمیہ کا شمار دنیا کی قدیم ترین نظموں میں ہوتا ہے۔ گِل گامش کے رزمیے میں عالمگیر سیلاب کا قصہ بھی ملتا ہے جو اتناپشتم کی زبانی بیان ہوا ہے۔

"بنی نوعِ انسان کا شور و غل برداشت سے باہر ہو گیا ہے[۲]

---

[۱] CHAOS

[۲] ترجمہ سید سبطِ حسن۔ اشور بنی پال کے کہنے پر اسی نظم کو سمیری زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا۔

اور اُن کی بکواس کے باعث اب سونا محال ہے
پس دیوتاؤں کے دل میں سیلاب کا خیال آیا
لیکن میرے آقا ایا نے مجھے خواب میں خبردار کر دیا
اس نے دیوتاؤں کی باتیں چھپکے سے میرے جھاؤ کے گھر کو بتادیں
او شرّوپاک کے انسان یوبارا تُو تو کی اولاد !
اِس گھر کو ڈھا دے اور ایک کشتی بنا . . .

تیرے جہاز کا ناپ یہ ہو
اُس کی شہتیر اس کے طُول کے برابر ہو
اُس کے عرشے کی چھت محرابی ہو
اُس قوس کی مانند جو عالمِ سفلی کو ڈھانپے ہوئے ہے
تب تمام جاندار مخلوق کے تُخم کشتی میں رکھ لے . . . .
طلوعِ سحر کی پہلی تابانی کے ساتھ میرے گھر کے لوگ میرے گرد جمع ہوئے
بچے رال لے آئے اور مرد ضرورت کی دُوسری چیزیں
پانچویں دِن میں نے جہاز کا پیندا بنایا اور خمدار لکڑیاں جوڑیں
اور تب میں نے تختہ بچھایا
جہاز کی نچلی منزل کا رقبہ ایک ایکڑ تھا
اور بالائی عرشے پر ہر چہار جانب ساٹھ گز تھا
اُس کے نیچے میں نے چھ طبقے بنائے کُل سات
اور اُن کو میں نے نوطبقوں میں تقسیم کر دیا
اور حسب ضرورت پچڑ بھی ڈالے
میں نے چھوٹوں اور لمبے شہتیروں کا بندوبست بھی کرلیا

اَور ضرورت کی سب چیزیں فراہم کرلیں
بار بردار پیپوں میں تیل لے آئے
میں نے تارکول، ڈامر اور تیل کو بھٹی میں ڈالا
جہاز کی درزیں بند کرنے میں بہت سا تیل خرچ ہُوا . . . .
میں نے سونا چاندی، زندہ مخلوق، گھر کے لوگ عزیز رشتہ دار
مویشی، جنگلی اور پالتو جانور اور سب کاریگروں کو
جہاز میں بھر لیا . . . .
تب شام ہوئی اور طوفان کے راکب نے بارش شروع کی
میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو موسم نہایت خطرناک تھا
پس میں بھی جہاز میں سوار ہوگیا اور دروازے کو بند کر لیا
اب سارا انتظام مکمل تھا۔ دروازہ بند کر دیا گیا تھا . . . .
طوفان سارا دن شور مچاتا رہا
اور اُس کی برہمی ہر لمحہ بڑھتی رہی
طوفان کے تھپیڑے فوجی حملوں کی مانند لگتے رہے
بھائی اپنے بھائی کو نہ دیکھ سکتا تھا
اور زمین کے رہنے والے آسمان سے بھی نظر نہ آتے تھے
یہاں تک کہ سیلاب نے دیوتاؤں کو بھی دہشت زدہ کر دیا . . .
چھ دن اور چھ رات آندھی چلتی رہی
بارش، طوفان اَور سیلاب نے دُنیا پر غلبہ پالیا
ساتواں دِن طلوع ہوا تو جنوبی طوفان تھم گیا
سمندر پُرسکون ہوگیا اور سیلاب رُک گیا

میں نے رُوئے زمین پر نگاہ دوڑائی تو وہاں کامل سکوت تھا اور انسان مٹّی کے ڈھیر بن گئے تھے . . . .

اِکیس کوس کے فاصلے پر مجھے ایک پہاڑ نظر آیا اور میری کشتی وہاں جا لگی

میری کشتی کوہ نصیر پر رُک گئی اور پھر ہلائے نہ ہلی . . . .

پانچواں دن طلوع ہُوا تو میں نے ایک فاختہ کو آزاد کیا

وہ اُڑ گئی مگر اُسے بیٹھنے کے لئے کوئی خشک جگہ نہ ملی اور وہ واپس آ گئی

تب میں نے ایک ابابیل کو آزاد کیا

وہ اُڑی مگر بیٹھنے کے لیے کوئی خشک جگہ نہ پا کر واپس آ گئی

تب میں نے ایک کوّے کو آزاد کیا

اُس نے دیکھا کہ پانی پیچھے ہٹ گیا ہے

پس اُس نے اپنا پیٹ بھرا، اِدھر اُدھر اُڑتا اور کاؤں کاؤں کرتا رہا مگر واپس نہ آیا

تب میں نے جہاز کے دروازے اور کھڑکیاں کھول دیں

میں نے قُربانی کی اور پہاڑ کی چوٹی پر شراب لنڈھائی

میں نے سات دیگچے چولہے پر رکھے

اور لکڑی، بید، دیودار اور [illegible] کا انبار لگایا۔

اُن کی خوشبو دیوتاؤں تک پہنچی

تو وہ مکھیوں کی طرح چڑھاوے کے گرد جمع ہو گئے''

—— عہد نامۂ قدیم میں طوفانِ نوحؑ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے

''اور خُدا نے نوحؑ سے کہا کہ تمام بشر کا خاتمہ میرے سامنے آ پہنچا ہے کیونکہ اُن کے سبب سے زمین ظلم سے بھر گئی، سو دیکھ میں زمین سمیت اُن کو ہلاک کروں گا۔ تو گوفر کی لکڑی کی ایک کشتی اپنے لیے بنا۔ اِس کشتی میں کوٹھریاں تیار

کرنا اور اس کے اندر اور باہر رال لگانا۔ ۔ ۔ ۔ تو اور تیرے ساتھ تیرے بیٹے اور تیری بیوی اور تیرے بیٹوں کی بیویاں اور جانور کی ہر قسم میں سے دو دو اپنے ساتھ کشتی میں لے لینا کہ وہ تیرے ساتھ جیتے بچیں۔ ۔ ۔ ۔ سات دن کے بعد زمین پر چالیس دن اور چالیس رات پانی برساؤں گا اور ہر جاندار شے کو جسے میں نے بنایا زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔ ۔ ۔ سمندر کے سب سوتے پھوٹ نکلے اور آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور چالیس دن اور چالیس رات زمین پر بارش ہوتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ کشتی ارارات کے پہاڑوں پر ٹک گئی اور پانی دسویں مہینے تک برابر گھٹتا رہا اور دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں اور چالیس دن کے بعد یوں ہوا کہ نوحؑ نے کشتی کی کھڑکی جو اس نے بنائی تھی کھولی اور اس نے ایک کوے کو اڑایا سو وہ نکلا اور جب تک زمین پر سے پانی سوکھ نہ گیا ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر اس نے ایک کبوتری اپنے پاس سے اڑا دی تاکہ دیکھے کہ پانی زمین پر گھٹا یا نہیں پر کبوتری نے پنجے ٹیکنے کی جگہ نہ پائی اور اس کے پاس کشتی کو لوٹ آئی۔ کیونکہ تمام روئے زمین پر پانی تھا تب اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا اور اپنے پاس کشتی میں رکھا اور سات دن ٹھہر کر اس نے کبوتری کو پھر کشتی سے اڑایا اور وہ کبوتری شام کے وقت اس کے پاس لوٹ آئی اور دیکھا تو زیتون کی ایک تازہ پتی اس کی چونچ میں تھی۔ تب نوحؑ نے معلوم کیا کہ پانی زمین پر سے کم ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ تب نوحؑ نے خداوند کے لیے ایک مذبح بنایا اور سب پاک چوپایوں اور پاک پرندوں میں سے تھوڑے سے لے کر اس مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور خداوند نے ان کی راحت انگیز خوشبو لی۔"

عہد نامہ قدیم کا یہ بیان ظاہراً سُمیری قصے سے ماخوذ ہے۔ لیونارڈ وولے جس نے

شہر اُور کی کھدائی کی تھی اِس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گل گامش کے رزمیہ کا سیلاب اور طوفانِ نوحؑ واحد الاصل ہیں۔ ہندوؤں کا سیلاب کا قصہ بھی بابل کے واسطے سے سمیریا ہی سے اخذ کیا گیا تھا۔ اس کا ذکر تمدنِ ہند کے ضمن میں آئے گا۔

سمیریوں کے شہر ارُوک میں دیوی اِنی نی کی پوجا کی جاتی تھی جو سامیوں کے ہاں دیوی عشتارہ کے روپ میں نمودار ہوئی۔ یونانیوں کی حسن و عشق اور توالد و تناسل کی دیوی افرودائتی بھی اِس کی مثیل ہے۔ سمیری چاند دیوی کو 'ہِن' کہتے تھے۔ اِس کے سر پر ہلال کا نشان تھا جو بعد میں مسیحی اولیاء کی تقادیر اور بعض اقوام کے پرچموں میں نمودار ہوا۔ سمیریوں کا عقیدہ تھا کہ ہر شے ذی روح ہے۔ روح موت کے بعد زندہ رہتی ہے، اس لئے وہ اپنے مُردوں کے ساتھ ہتھیار اور دوسرا ساز و سامان بھی دفن کرتے تھے۔ ان کے ہاں تموز دیوتا زرخیزی اور بارآوری کی علامت تھا اور عشتارہ کا بدنصیب عاشق تھا۔ یونانی دیومالا میں وہ ادونس بن گیا۔

سمیریا کے مختلف شہروں کے حکمران ہمیشہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے تھے۔ ۲۳۰۰ ق-م کے قریب سامی النسل بادشاہ سارگن نے سمیریا پر حملہ کیا اور یکے بعد دیگرے سارے شہر فتح کر لئے۔ اُس کی پیدائش کی کہانی کو روشن کبیر، کرشن، رومولس اور جنابِ موسیٰ کے احوال سے ملتی جلتی ہے یعنی اُس کی ماں نے پیدا ہوتے ہی اُسے ٹوکری میں رکھ کر دریا میں بہا دیا تھا جہاں ایک ملاح نے ترس کھا کر اُسے نکالا اور اُس کی پرورش کی۔ سارگن نے ایک شاندار سلطنت کی بنیاد رکھی جسے اموری شہنشاہی کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اس خانوادے کا سب سے شاندار حکمران حمورابی تھا جس نے شہر بابل تعمیر کرایا جو رفتہ رفتہ تمام زیریں عراق کا دارالسلطنت بن گیا۔ تاریخی اور لسانی پہلوؤں سے بابل کی یہ شہنشاہی سمیریوں اور سامیوں کے اتحاد کا ثمرہ تھی۔ ابتدا میں اموری اجڈ اور خانہ بدوش تھے۔ سمیریا کے متمدن لوگوں میں مل جل کر رہنے سے وہ تمدن کے برکات سے روشناس ہوئے اور محکوموں سے قوانین، فنون و علوم، طرزِ تحریر، ریاضی

صنعت وحرفت وغیرہ کے اصول ومبادی سیکھے اور بعد میں ان میں بیش بہا اضافے بھی کیے۔ اس طرح تمدن کا جو بیج سمیریوں نے بویا تھا وہ بابل اور اشور میں پھل پھول کر ایک تناور درخت بن گیا۔

شاہ حمورابی نے شہر بابل کو تہذیب وتمدن، صنائع بدائع، فنونِ لطیفہ اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا۔ اس نے عظیم الشان معبد تعمیر کرائے جن کے برجوں میں بیٹھ کر کاہن مطالعۂ افلاک اور پروہت سمیریوں کے مذہبی نوشتے نقل کیا کرتے تھے۔ حمورابی کا سب سے بڑا کارنامہ اس کا ضابطۂ قوانین ہے جو دراصل شاہ اورنگر سمیری کے اسی نوع کے ضابطے پر مبنی تھا۔ اس کا اصل اصول ہے "دانت کے بدلے دانت، آنکھ کے بدلے آنکھ"۔ البتہ حمورابی کی تعزیرات سمیریوں سے زیادہ سخت ہیں۔ مثلاً سمیری قانون اجازت دیتا ہے کہ زانیہ کا خاوند دوسری شادی کر لے اور زانیہ دوسری بیوی کی کنیز بن کر رہے۔ حمورابی نے اس کے لئے موت کی سزا رکھی ہے جس کا طریقہ یہ تھا کہ زانیہ کو دریائے فرات کی منجدھار میں پھینک دیتے تھے۔ وہ بچ نکلتی تو بے گناہ سمجھی جاتی تھی۔ زنا بالجبر، اغوا، قزاقی، چوری، محرمات سے زنا، بھگوڑے غلاموں کو پناہ دینے اور میدان جنگ میں بزدلی دکھانے کی سزا موت تھی۔ وہ طبیب جس کے علاج سے کسی شخص کی آنکھ ضائع ہو جاتی مجرم سمجھا جاتا تھا اور اس کے ہاتھ کی انگلیاں کاٹ دی جاتی تھیں۔ ڈاکو کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ اگر ڈاکو پکڑے نہ جا سکتے تو جس شخص کا مال لوٹا جاتا وہ دیوتا کے سامنے اپنے سامانِ مسروقہ کی فہرست بنا کر رکھ دیتا اور شہر یا علاقے کے حاکم کو اس نقصان کی تلافی کرنا پڑتی تھی۔ مقدمہ بازوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ ضابطۂ حمورابی کا پہلا قانون ہے "اگر کوئی شخص کسی پر جرم کے ارتکاب کا الزام لگائے لیکن اسے ثابت نہ کر سکے تو الزام لگانے والے کو جان سے مار دیا جائے گا"۔ اس ضابطے میں دو سو پچاسی قوانین ہیں جنہیں ذاتی املاک، تجارت، کاروبار، خاندان، محنت کشی وغیرہ عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ ان قوانین کی رو سے فرد کی جگہ ریاست کو انتقام کا حق

دیا گیا ہے۔ قانون کی تاریخ میں یہ ایک انقلاب آفریں اقدام تھا۔ بحیثیت مجموعی اسے عہدِ قدیم کا جامع ترین ضابطۂ قوانین سمجھا جا سکتا ہے۔ حمورابی کا دعویٰ تھا کہ یہ ضابطہ اُسے خداوند خدا نے خود عطا کیا تھا۔ چنانچہ ایک نقش میں حمورابی کو دیوتا سے یہ ضابطہ لیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس ضابطے کا اصل منشا بے شک ذاتی املاک کا تحفظ ہے لیکن اس میں زیر دستوں اور کمزوروں کے حقوق کی پاسبانی بھی کی گئی ہے۔

حمورابی ضابطے کے دیباچے میں کہتا ہے

"اس وقت دیوتاؤں نے اپنے اس خدمت گار حمورابی کو پکارا جو نیکوکار تھا، محتاجوں کی مدد کرتا تھا جس نے ملک کو خوشحالی بخشی، جس نے طاقت وروں کو کمزوروں پر ظلم کرنے سے روکا۔ دیوتاؤں نے اُسے پکارا کہ عوام کی بہبود میں اضافہ کرے۔"

آغازِ تمدن ہی سے سلاطین اور روساء غلاموں اور زیر دستوں پر تشدد کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے رہے ہیں۔ حمورابی کی روشن خیالی اور بیدار مغزی اُس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ مغربی علماء کے خیال میں یہودیوں کی شریعت کے احکامِ عشرہ[1] اسی ضابطے سے ماخوذ ہیں۔

اشوریوں نے ۷۰۰ ق م کے لگ بھگ بابل کو فتح کر کے اپنی سلطنت قائم کی۔ اس تاخت و تاراج میں بابل کا شہر پیوندِ زمین ہو گیا۔ اشوری بھی بابلیوں کی طرح سامی النسل تھے اور اُن کی زبان بابلی زبان کے مشابہ تھی۔ انہوں نے اشور اور نینوا کے شہر بسائے۔ اُن کے قومی دیوتا کا نام اشور تھا جو جنگ و جدال کا دیوتا تھا۔ اس کی پرستش معبودِ واحد سمجھ کر کی جاتی تھی۔ اشوریوں نے حطیتوں سے لوہا ڈھالنے کا استعمال سیکھا اور اس کے ہتھیار بنانے لگے۔ انہوں نے گھڑ سواروں کے رسالے مرتب کیے جن سے اُن کی جنگی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ وہ طبعاً جنگجو تھے اور ہر وقت خونریزی پر کمربستہ رہتے تھے۔ معاصر اقوام پر اُن کی طاقت اور شجاعت

---

[1] TEN COMMANDMENTS

کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ اُن کی سنگ دلی کا اندازہ اِس بات سے بخوبی ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے مظالم کی داستانیں مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔ شام اور فلسطین میں حطیتوں اور مصریوں کو زوال آگیا تو اشوریوں نے پیش قدمی کی۔ شاہ تگلت پلیسر سوم (۷۴۵ ـــ ۷۲۷ ق-م) نے دمشق فتح کرلیا۔ سارگن ثانی (۷۲۲ ـــ ۷۰۵ ق-م) اشوریوں کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا۔ اُس نے اِسرائیل کو فتح کر کے اُسے اپنی مملکت میں شامل کرلیا اور تئیس ہزار اسرائیلیوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس کے بیٹے سینخرب (۷۰۵ ـ ۶۸۱ ق-م) نے فنیقیوں کے مشہور تجارتی شہر صور اور صیدون فتح کئے۔ راشرحدون (۶۸۱-۶۶۹ ق-م) نے مصر پر قبضہ کرلیا۔ اشوربنی پال (۶۶۹ ـــ ۶۲۶ ق-م) نے جو اشوریوں کا آخری بڑا حکمران تھا ایلم کو فتح کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ ۶۸۹ ق-م میں بابل کو فتح کر کے مسمار کرا دیا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دریا کا پانی گلیوں کی طرف موڑ دیا جائے جس سے عالیشان عمارتیں زمین بوس ہوگئیں۔ پھر ان عمارتوں کے ملبے کو کشتیوں میں بھر بھر کر اِدھر اُدھر بکھیر دیا گیا۔ اشوری بڑے دبدبے اور جاہ و جلال کے مالک تھے۔ اُن کا ذکر عہد نامۂ قدیم میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے

لہ "دیکھ اسور لبنان کا بلند دیو دار تھا جس کی ڈالیاں خوبصورت تھیں اور پتیوں کی کثرت سے وہ خوب سایہ دار تھا اور اُس کا قد بلند تھا اور اُس کی چوٹی گھنی شاخوں کے درمیان تھی۔ پانی نے اُس کی پرورش کی، گہراؤ نے اسے بڑھایا۔ اُس کی نہریں چاروں طرف جاری تھیں اور اُس نے اپنی نالیوں کو میدان کے سب درختوں تک پہنچا دیا۔ اس کے پانی کی کثرت سے اس کا قد میدان کے سب درختوں سے بلند ہوا اور جب وہ لہلہانے لگا تو اس کی شاخیں فراوان اور اس کی ڈالیاں

لہ حزقی ایل

دراز ہوئیں۔ ہوا کے سب پرندے اس کی شاخوں پر اپنے گھونسلے بناتے تھے اور اس کی ڈالیوں کے نیچے سب وحشی حیوان بچے دیتے تھے اور سب بڑی بڑی قومیں اس کے سایہ میں بستی تھیں۔"

اشوریوں کو بابل کا تمدّن ورثے میں ملا تھا۔ اُن کے ایک بادشاہ اشوربنی پال نے نینوا میں گلی الواح کا کتب خانہ قائم کیا اور سمیری الواح کی نقلیں تیار کروائیں۔ یہ گلی کتب خانہ کھنڈروں سے دستیاب ہوا ہے اور معلومات کا خزانہ سمجھا جاسکتا ہے۔ اشوریوں کو فنِ سنگ تراشی میں کمال حاصل تھا۔ اُن کے سنگی مجسموں میں سر اور ڈاڑھی کے ایک ایک بال کو نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے۔ لباس کی سلوٹیں اور چنٹیں نہایت ماہرانہ انداز سے نکھار کر دکھائی گئی ہیں۔ تزئین اور آرائش میں تفصیل نگاری کی یہ خصوصیت فنیقیوں اور بابلیوں کے فن سے یادگار ہے۔ اشوری جنگلی جانوروں کے لیے رمنے بنواتے تھے جن کے چاروں طرف لکڑی کا احاطہ ہوتا تھا۔ انہیں وہ پیرا دوزا[1] کہتے تھے۔ وہ شیروں کا شکار بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ اُن کا یہ شوق سنگ تراشی میں بھی منتقل ہوگیا۔ انھوں نے شیر ببر اور سانڈ کی نقش گری میں مشاہدے کی دقت کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اپنی دیواروں پر چُونے کے پتھر کو پیس کر استرکاری کرتے اور ان پر اپنی جنگی مُہمات اور شکار کی تصویریں بنواتے تھے۔ ان نقوش میں جانوروں کے پیکر اس قدر نفیس اور دلکش ہیں کہ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنے معبدوں اور محلوں کے دروازوں پر عظیم الجثّہ بیلوں اور شیروں کے مُجسّمے نصب کرتے تھے جن کے چہرے انسان کے تھے اور بازوؤں میں پَر لگے ہوئے تھے۔

سارگن ثانی نے نینوا کے شمال میں ایک بے نظیر محل تعمیر کرایا تھا جو پچیس ایکڑ سے زائد رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور ایک ہزار کمروں پر مشتمل تھا۔ اِس کے قریب ہی سات منزلہ زِگورط تھا

---

[1] انگریزی کا PARADISE عربی میں فردوس

جس کے کھنڈر ملبے کے ڈھیروں کی صورت میں بکھر گئے ہیں۔ اس محل کے سامنے پَر دار بیلوں کے مجسّمے ہیں جن کی بلندی سولہ فٹ تھی۔

اشوّری زرگری میں بھی ماہر تھے۔ بغداد کے عجائب گھر میں ایک اشوّری بادشاہ کا خود محفوظ ہے جو خالص سونے کا ہے اور نہایت خوش وضع ہے۔ ہخامنشی عہد کی سنگ تراشی میں اشوری اسالیبِ فن کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ بعد میں اشوریوں کے خاندانی نشانات بھی ساسانیوں نے اپنا لئے تھے۔ اشوّری سیمرغ کا فنّی نشان بھی ساسانی پارچوں میں دکھائی دیتا ہے۔ طاقِ بُستان میں خسروِ دوم کے لباس میں اژدہا نما مور کا نقش اور دوسرے عفریت نما جانوروں کے نقوش ساسانیوں نے اشوریّوں ہی سے اخذ کئے تھے۔

ریشے گروسے لکھتا ہے:[1]

"اشوّری بڑے قوی ہیکل اور تنومند جنگ جُو تھے۔ اُن کے بشرے پر مردانگی اور شہامت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اِن نقوش میں مصریوں جیسی فطرت نگاری نہیں ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انھوں نے برہنہ مجسّمے تراشنے سے احتراز کیا جس سے جسم کے زاویوں اور قوسوں کے مشاہدے کا زیادہ موقع مل سکتا تھا البتّہ گھوڑے اور شیرِ ببّر کے جو نقوش اُنھوں نے تراشے ہیں اپنی دلآویزی اور شگفتگی کے لئے بے نظیر ہیں۔"

اشورنبی پال کی وفات پر اشوّریوں کے دشمنوں نے ایکا کر لیا۔ ۶۱۲ ق م میں میدیوں اور بابلیوں کی متحدہ فوجوں نے نینوا کا محاصرہ کر لیا۔ نینوا کے آخری بادشاہ سنشر اشکون نے اپنی بیویوں اور کنیزوں سمیت آگ میں جل کر خودکشی کر لی اور اپنے ساتھ سارا مال و متاع اور خزانہ بھی غارت کر دیا۔ خشارشیا نے نینوا کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اشوّری بادشاہت

---

[1] CIVILIZATIONS OF THE EAST

کا خاتمہ ہو گیا۔

اشوّر کے زوال پر بابل کی دوسری شہنشاہی عالمِ وجود میں آئی تھی۔ اِس کا بانی نابوپولاسر تھا جس نے ایرانیوں کی مدد سے اشوریّوں کی طاقت کو پامال کیا اور بابل پر قبضہ کر لیا۔ اُس نے بابل کو نئے سِرے سے تعمیر کرایا۔ اُس کا بیٹا بنوکدنضر اس خانوادے کا سب سے عظیم الشان بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کیا اور فلسطین اور مصر پر فاتحانہ یلغار کی۔ اُس نے یروشلم کو فتح کر کے غارت کیا اور تمام یہودیوں کو قید کر کے بابل لے گیا۔ اُس کے عہدِ حکومت میں بابل کو جو شہرت اور عظمت نصیب ہوئی وہ اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہیروڈوٹس نے بنوکدنضر کے ڈیڑھ سو برس بعد بابل کا شہر دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شہر ایک مُربّع کی شکل میں تھا جس کا ہر ضلع ۲۰ فرلانگ تھا۔ اِس کے بازار زاویہ قائمہ پر ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے اس میں بنوکدنضر نے اپنے شہرۂ آفاق باغاتِ معلّقہ تعمیر کرائے جن کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا تھا۔ پانی کی نالیاں محلوں کی چھتوں تک پہنچائی گئیں جہاں روشوں میں درخت اور پھولوں کے پودے اُگائے گئے تھے۔ ان کی ہوا میں لہراتی ہوئی سرسبز ڈالیاں دُور سے آنے والے مسافروں کے لئے جنّتِ نگاہ سے کم نہ تھیں۔ اِس میں بابلیوں کے خداوند خدا بعل مردوخ اور دھرتی دیوی عشتار کے معبد تعمیر کیے گئے تھے۔ ہیروڈوٹس نے ۴۵۸ ق۔م میں زغورط کو دیکھا تھا جسے تاریخ میں منارۂ بابل کہا گیا ہے۔ اِس کی سات منزلیں تھیں اور اُوپر جانے کا راستہ گولائی کے ساتھ ساتھ کناروں پر سے بل کھاتا ہوا جاتا تھا۔ منارے اور معبد کی کُل بلندی ۲۸۸ فٹ تھی، سب سے نچلی منزل میں بعل مردوخ کا نیم انسانی نیم حیوانی وضع کا بُت تھا جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔ اُسے سونے کی ایک بڑی میز کے ساتھ تخت پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ تخت، میز اور بُت کا کُل وزن آٹھ سو ٹیلنٹ تھا۔ بعل مردوخ کے بُت کا وزن چھبیس ٹیلنٹ تھا۔ بُت کے پاؤں میں اُس کے مقدّس جانور سروش یا اژدہا کے بابل کا مجسمہ تھا جس کے چار پاؤں تھے اور لمبی ٹانگیں تھیں۔ پچھلے پاؤں نکیلے خاردار تھے اور

جسم پر چھپکلی تھی۔ لمبی گردن پر سانپ کا سر بنا ہوا تھا جس کی زبان منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ کھوپڑی میں ایک سینگ تھا۔ زغورط کی بالائی منزل پر صرف ایک سونے کی بنائی ہوئی میز رکھی تھی۔ اِس کمرے میں ایک حسین دوشیزہ کے سوا کوئی شخص قیام نہیں کر سکتا تھا۔ اُسے دیوتا بعل مردوخ کی دُلہن کہتے تھے۔ زغورط کی بیرونی دیواروں پر سُنہری مائل سبز کاشی گری کا کام تھا۔ دُھوپ میں ان دیواروں کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ مذہبی جلوس بابِ عشتار سے گزر کر بعل کے منارے تک جاتے تھے۔ عشتار دیوی کا معبد بھی نہایت شاندار تھا۔

اپنے زمانے میں بابل متمدن دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اصل شہر دریائے فرات کے دائیں کنارے پر آباد تھا۔ بنوکدنضر نے دریا پر پل تعمیر کروایا اور شہر کی توسیع بائیں کنارے تک کی۔ اِس کے کُل پچیس بازار تھے۔ ہر دروازے پر پیتل کا ایک ٹھوس اور مضبوط پھاٹک لگایا گیا تھا۔ مکانات دو منزلہ یا چہار منزلہ تعمیر کئے جاتے تھے۔ شہر کی فصیل چھپن میل لمبی تھی اور اتنی چوڑی تھی کہ اس پر دو رتھ آسانی سے پہلو بہ پہلو دوڑائے جا سکتے تھے۔ بابل دو ہزار برس تک تمدنِ عالم کا مرکز بنا رہا۔

بابلیوں کا طرزِ تحریر اور اُن کی زبان بحیرۂ رُوم کے ممالک اور مصر تک رائج تھی اور ہر مُلک کے پڑھے لکھے لوگ اُسے سیکھتے تھے۔

بابل مشرق کی بہت بڑی تجارتی منڈی بن گیا تھا جہاں خشکی اور تری کے راستوں سے ہزاروں میل دُور کے ممالک کا سامانِ تجارت آتا تھا۔ غیر مُلکی تاجر سامانِ تجارت کیساتھ ساتھ بابل کے علُوم وفنُون، صنائع بدائع، سحر و نیرنگ اور دیومالا کے قصے لے جاتے تھے چنانچہ اِس شہر کے واسطے سے ایشیا اور یورپ کے ممالک بابلی ہیئت اور صنعتی فنُون سے آشنا ہوئے۔ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل کے تاجر چین کو بھی جاتے تھے اور وہاں سے ریشمی کپڑا لا کر سلاطین کے درباروں میں بیچتے تھے۔ بابل کو مغربی ایشیا کی غلّے کی بہت بڑی منڈی

بھی سمجھا جاتا تھا۔

بابل کی دیو مالا قدیم سمیریا کے تصوّں پر مبنی تھی لیکن مرورِ زمانہ سے اِس میں نئی نئی کہانیوں کا اِضافہ بھی ہو گیا۔ بابل کے مذہب کو بجا طور پر صابیئت[1] یا سیارہ پرستی کا نام دیا جاتا ہے۔ بابلی سات سیاروں کو ذی رُوح ہستیاں مانتے تھے جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

وہ مشتری کو مردوخ، تیر کو بنو، مریخ کو نرگل، آفتاب کو شمش، چاند کو سِن، عطارد کو نِنب اور زہرہ کو عشتار کہتے تھے۔

اُن کا عقیدہ تھا کہ اِن کی گردش انسانی طالع کو متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ ان کی گردش کے مطالعے ہی نے علم ہیئت اور علم نجوم کو جنم دیا تھا۔ ان میں بعل مردوخ اور شمش سب سے بڑے دیوتا تھے۔ عشتار[2] حسن و عشق کی دیوی تھی۔ دیوتاؤں کے مذبحوں پر بھیڑ بکریاں قربان کی جاتی تھیں۔ قربانی کی رسوم بڑی پیچیدہ تھیں جن کے لیے پروہتوں کی خدمات حاصل کرنا پڑتی تھیں۔ بابلیوں کا مذہب رسومِ قربانی تک ہی محدود تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کے ہاتھ پاؤں قطع کر کے انہیں آگ میں پھینک دیتے تھے۔ مذہبی تہواروں پر شاندار جلوس نکالے جاتے تھے جن کے آگے آگے بادشاہ مُلک کے سب سے بڑے پروہت کی حیثیت سے چلتا تھا۔ سیکڑوں کاہن اپنے مذہبی لباس میں قطار اندر قطار مردوخ کے مجسّمے کے پیچھے پیچھے مناجات کے گیت گاتے ہوئے جاتے تھے۔ بتوں کو عطریات میں بسایا جاتا تھا۔ اُن کے سامنے بخور جلاتے تھے اور انہیں بیش قیمت لباس اور زیورات پہناتے تھے۔ دیوتاؤں کی زوجیت میں حسین و جمیل

---

[1] صبا سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے سیارے کا طلوع ہونا۔

[2] فارسی کا لفظ ستارہ اور انگریزی کا STAR۔ اِسی دیوی کے نام کی بدلی ہوئی صورتیں ہیں۔

لڑکیاں دی جاتی تھیں۔

بابلیوں کا مذہب سراسر عملی اور دُنیوی مفادات کے حصول پر مبنی تھا۔ وہ حیات بعد ممات سے چنداں اِعتنا نہیں کرتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ سب انسانوں کی رُوحیں موت کے بعد ایک تاریک گڑھے میں چلی جاتی ہیں۔ بہشت صرف دیوتاؤں کے لیے مخصوص تھا۔ سحرِ بابل دُنیا بھر میں مشہور رہا تھا۔ جادو کی مدد سے بابلی رُوحوں کی تسخیر کا عمل کرتے تھے۔ جادوگروں کا دعویٰ تھا کہ وہ منتر پڑھ کر انسانوں کی رُوحیں حیوانات کے قالب میں منتقل کر سکتے ہیں۔ آسیب اور جِنّ کو دفع کرنے کے لئے بڑے پیچیدہ طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ گلی الواح میں تسخیرِ جِنّ کے ٹُونے ٹوٹکے لکھے ہوئے ملے ہیں۔

بابلی مذہب کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی کہانت تھی۔ کاہن غیب بینی کرتے تھے اور وجد و حال کے عالم میں مُقفّیٰ اور مُسجّع جملوں کی صورت میں پیش گوئیاں کرتے تھے جو اکثر ذومعنی ہوتی تھیں۔

وحی اور الہام کے ساتھ از خود رفتگی کا جو تصوّر وابستہ رہا ہے وہ بابلیوں ہی سے یادگار ہے۔ انسانوں اور حیوانوں میں کلیجے کو رُوح اور ذہن کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ جادوگرنیاں راستے چلتوں کا کلیجہ نکال لیتی تھیں۔

زمانے کے گزرنے کے ساتھ دیوتاؤں کی تعداد میں اِضافہ ہو گیا تھا۔ نویں صدی قبل مسیح میں دیوتاؤں کی مردم شماری کی گئی تو اُن کی تعداد پینسٹھ ہزار نکلی تھی۔ معاشرے پر پروہتوں کا تسلّط تھا۔ بادشاہ کی تاجپوشی کی رسم بڑا پجاری ادا کرتا تھا۔ اِس تقریب پر بادشاہ پروہت کا لباس پہنتا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے مُلک کا بھی پجاری ہے۔ اِس طرح ریاست اور معبد کا اِتحاد عمل میں آیا۔ بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا کُفر تھا۔

بابلی سانپ کو مقدّس مانتے تھے اور بہشتی درخت کی شبیہ بنا کر اُسے پوجتے تھے۔ اِس کا نام اشیرا تھا۔ اِن کی تقدیس جنّتِ عدن کی روایت سے وابستہ ہے جس میں سانپ

کے بہکاتے پر آدم نے سیب کا ثمرِ ممنوعہ کھایا تھا۔ ہمارے زمانے کے اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہ سیب دوشیزگی کی علامت تھی جو حوّا نے آدم کو پیش کی تھی۔ مقدّس کھمبے کی پوجا اُسے لنگ کی علامت سمجھ کر کرتے تھے۔

بابلیوں کا خداوند خُدا بعل مردوخ تھا۔ اِس کے معبد میں انسانی قربانی دی جاتی تھی بعد میں انسانوں کی جگہ بکریاں قُربان کرنے لگے۔ مردوخ کا مجسّمہ ایک پردار بیل کی شکل کا تھا جس کا چہرہ انسانی تھا۔ ابتداء میں بعل زرخیزی اور آب پاشی کا دیوتا تھا بعد میں آسمان دیوتا بن گیا جو بارش برسا کر زمین کو سیراب کرتا تھا۔

بعل کے ساتھ عشتار دیوی کی پرستش بھی بڑے ذوق سے کی جاتی تھی عشتار دھرتی ماتا تھی اور حُسن و عشق کی دیوی بھی تھی۔ اس کے پجاری اُسے مُقدّس دوشیزہ اور دوشیزہ ماں کہتے تھے۔ زمین کی زرخیزی کو تحریک دینے کے لئے اِس دیوی کے مندر میں دن رات عصمت فروشی کا بازار گرم رہتا تھا۔ اُس کی دیوداسیاں مُقدّس کسبیاں تھیں جن سے مقامی اور زائرین معاوضہ دے کر تمتّع کرتے تھے۔ یہ رقم دیوی کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ظاہراً پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی۔ دیوی کے مندر کے وسیع و عریض صحن میں سیکڑوں جوان دیوداسیاں رنگ برنگ کے ریشمیں سراپردے لگا کر اور بن سنور کر زائرین کے انتظار میں بیٹھتی تھیں۔ وہ عصمت فروشی کو مذہبی فریضہ سمجھتی تھیں۔ جو لوگ اُن سے فیض یاب ہوتے تھے وہ بھی انہیں مُقدّس جان کر اُن کی عزّت کرتے تھے۔

عشتار کے سالانہ تہوار پر جنسی بے راہ روی کے عجیب و غریب مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ اِس موقعہ پر نوجوان لڑکیاں زائرین سے ہم کنار ہو کر اپنی دوشیزگی دیوی کی بھینٹ کرتی تھیں۔ بابل کی ہر عورت پر مذہباً فرض تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار مندر میں آ کر کسی نہ کسی زائر کے ساتھ خلوت میں جائے۔ ہیروڈوٹس اِس رسم کے بارے میں لکھتا ہے۔

"ہر[1] بابلی عورت پر فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک بار وینس[2] کے معبد میں جا کر کسی نہ کسی اجنبی سے ہمکنار ہو۔ اُمراء کی عورتیں جو عام عورتوں سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔ پردے دار گاڑیوں میں سوار ہو کر آتی ہیں اور غُلاموں اور کنیزوں کے جُھرمٹ میں معبد میں داخل ہوتی ہیں۔ اکثر عورتیں معبد میں اپنے بالوں کو فیتے سے باندھ کر بیٹھتی ہیں۔ مندر میں عورتوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ صحن میں لکیریں کھینچ کر راستے بنا دیئے گئے ہیں جن پر سے گزر کر زائرین عورتوں کے پاس جاتے ہیں اور اپنی پسند کی عورت منتخب کر لیتے ہیں۔ جب کوئی عورت اِس مقصد کے لیے مندر میں آتی ہے تو جب تک وہ کسی اجنبی سے چاندی کے سِکّے کے عوض ہمکنار نہ ہولے باہر نہیں جا سکتی۔ سکّہ پھینکنے والا کہتا ہے "میں دیوی مُلیتا[2] کی مِنّت کرتا ہوں کہ وہ تجھ پر مہربان ہو" اشوری وینس کو ملیتا کہتے ہیں۔ چاندی کا سِکّہ خواہ کتنا ہی حقیر ہو عورت کو قبول کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ مُقدّس ہوتا ہے اور اسے ٹھکرانا پاپ ہے۔ جب کوئی متمنی شخص کسی عورت کی طرف سِکّہ پھینکتا ہے تو وہ بلا چون و چرا اُٹھ کر اُس کے ساتھ چلی جاتی ہے اور اِس فرض سے سبکدوش ہو کر گھر کی راہ لیتی ہے۔ اِس کے بعد خواہ اُسے کتنے ہی دھن دولت کی پیشکش کی جائے وہ سُپردگی پر آمادہ نہیں ہوتی۔ خوبصورت اور خوش گل عورتیں اِس فرض سے جلدی سبکدوش ہو جاتی ہیں جب کہ بدصُورت عورتوں کو خاصی مُدّت تک مندر میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ اِس

---

[1] تاریخ

[2،3] ان سے عشتار ہی مُراد ہے

قسم کی کئی عورتیں دو دو تین تین برس تک کسی اجنبی کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہیں۔"

مقدّس عصمت فروشی کا یہ کاروبار بابل میں ۳۲۵ء بعد از مسیح تک جاری رہا اور دوسرے ممالک میں بھی پھیل گیا۔ مصر کی دیوی آئسس، یونانی افرودائتی، رومی وینس اور جنوبی ہند کے مندروں میں صدیوں تک مذہب کے نام پر عصمت فروشی کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی ذمے داری پروہتوں پر عائد ہوتی ہے جن کی جیب میں ان مقدّس دیوداسیوں کی کمائی جاتی تھی۔

بابلیوں نے جن علوم کو فروغ دیا اُن میں ہیئت، ریاضی اور مساحت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ بابل کے پروہت راتوں کو مناروں پر بیٹھ کر مشاہدۂ افلاک کیا کرتے تھے۔ جس سے علم ہیئت کی بنیاد پڑی۔ انھوں نے تیر کی گردش کا جو حساب لگایا تھا وہ ہپارکس اور بطلیموس کے حساب سے زیادہ قرینِ صحت ہے۔ آج کل کے بہترین آلات سے چاند کی گردش کا جو حساب لگایا گیا ہے اُس میں اور بابلیوں کے حساب میں صرف چار سیکنڈ کا فرق ہے۔ وہ وقت کی پیمائش آبی گھڑی سے کرتے تھے۔ دھوپ گھڑی بھی تھی۔ یہ غالباً اُنھیں کی اختراع ہے۔ وہ سُورج گرہن اور چاند گرہن کی صحیح پیش گوئیاں کرتے تھے۔ یونان کے پہلے فلسفی طالیس نے سُورج گرہن کی پیش گوئی کرنے کا راز اہلِ بابل ہی سے معلوم کیا تھا۔ یُونانی زبان میں فلک کے بُروج، دھاتوں، اوزان، پیمانوں، آلاتِ موسیقی اور دوائیوں کے نام بابلی زبان ہی سے لئے گئے ہیں۔ کاروبار اور تجارت کے اصول اُنھیں سے ماخوذ ہیں۔ زمان کی حرکتِ مستقیم[1] کا تصور جو مجوسیت اور یہودیت کا سنگِ بنیاد ہے بابلیوں ہی سے مستعار

---

[1] زمان کی حرکتِ مستقیم کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کا آغاز بھی تھا اور انجام بھی ہو گا۔ آریا اقوام یونانی اور ہندو اِس کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے خیال میں (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے۔ اسی طرح شیطان، جنوں اور فرشتوں کے تصورات بابلی الاصل ہیں۔ اہلِ بابل نے کوئی بلند پایہ ادب ورثے میں نہیں چھوڑا کیونکہ بنیادی طور پر وہ عملی اور کاروباری لوگ تھے۔ کاردبار نے ریاضی کو جنم دیا جس میں ایشیا اور مغرب کی اکثر اقوام اُن کی شاگرد ہیں۔

بابل کی تمدنی میراث کا تاریک ترین پہلو جادو اور توہم پرستی ہے چنانچہ آج بھی بعض خاصے پڑھے لکھے لوگ علم نجوم، دست شناسی، فال گیری، غیب بینی اور کشف و انشراح پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ حاضرات ارواح۔ تسخیرِ جن کے منتر جنتر، تعویذوں اور ٹونے ٹوٹکوں کی میراث بھی بابل ہی سے ملی ہے۔ سکندر بڑا روشن خیال تھا لیکن بابل کے فال گیروں کی ایک جماعت ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

حمورابی کے ضابطۂ قوانین سے بابلی معاشرے پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ڈاک اور پولیس کے محکمے موجود تھے۔ معاشرہ تین طبقات میں بٹا ہوا تھا، روساء، مالک مزارعین، غلام۔

بردہ فروشی کا رواج عام تھا۔ غلاموں اور کنیزوں کو کھلی منڈی میں فروخت کیا جاتا تھا۔ مقروض کو غلام بنا لینا قانوناً جائز تھا لیکن اکثر غلام جنگی قیدی ہوتے تھے۔ اشیاء و اجناس کی زیادہ سے زیادہ قیمتیں اور مزدوروں کی اُجرت حکومت خود مقرر کرتی تھی۔ حمورابی نے اپنے ضابطے کو ایک ستون پر کندہ کرایا تھا اور اُس کی نقلیں تمام شہروں کو بھجوا دی تھیں۔ اِس لیے ہر کہیں بابلی طرزِ معاشرت رواج پا گیا۔

تصاویر اور نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ بابلی سوتی چغہ پہنتے تھے جو پاؤں تک جاتا تھا۔ سر پر لمبے بال رکھنے اور پگڑی پہننے کا رواج تھا۔ اُمراء ریشمی لباس پہنتے تھے اور اپنے کپڑوں اور بدن کو عطریات میں بساتے تھے۔ ہر شخص اپنے ہاتھ میں عصا رکھتا تھا۔

زمان کی حرکت دائرے میں ہوتی ہے۔

اور اپنے نام کی مُہر کی انگشتری پہنتا تھا۔ عصا کے سرے پر سیب، پھول، عقاب وغیرہ کی شبیہہ تراشی جاتی تھی۔ بابلیوں کا من بھاتا کھاجا مچھلی تھی۔ مچھلی کھانے کا طریقہ یہ تھا کہ اُسے سُکھا کر کوٹ پیس کر آٹا بنا لیتے اور اُس کی ٹکیاں تل کر کھاتے تھے۔

بابلی معاشرے میں عورت کا مقام مصری عورت سے کم تر تھا۔ کثرتِ ازدواج کا رواج تھا۔ اُمراء سیکڑوں کنیزیں حرم میں ڈال لیتے تھے جن کی حفاظت پر خواجہ سرا موجود تھے۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ محاصرہ طول پکڑ جاتا تو عورتوں کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتے تھے تاکہ خوراک کی بچت ہو۔ اُسی کی ایک روایت ہے کہ اِفلاس و احتیاج کی حالت میں باپ اپنی جوان بیٹی سے پیشہ کرانا جائز سمجھتا تھا۔ کسی عورت کا شوہر تجارت یا جنگ کی صورت میں طویل مدت تک گھر سے غیر حاضر رہتا اور اپنی زوجہ کے نان و نفقہ کی کفالت نہ کر سکتا تو وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ تعلق زناشوئی قائم کرنے کی مجاز تھی اور پہلے شوہر کے لوٹ آنے پر اُس کے پاس واپس چلی جاتی تھی۔ ہیروڈوٹس نے شادی کی ایک عجیب رسم کا ذکر کیا ہے:

> "جن لوگوں کی بیٹیاں جوان ہو جائیں وہ سال میں ایک مرتبہ اُنہیں ایک مقررہ جگہ پر لیجاتے ہیں جہاں تماشائیوں کا ٹھٹ لگ جاتا ہے۔ ایک سرکاری کارندہ باری باری اُن لڑکیوں کو بلاتا اور اپنے سامنے کھڑی کر کے بولی دے کر بیچ دیتا ہے۔ وہ بولی کا آغاز حسین ترین لڑکی سے کرتا ہے اور اُس کا خطیر معاوضہ وصول کر کے دوسری لڑکیوں کو بلاتا ہے۔ لڑکی اِس شرط پر بیچی جاتی ہے کہ خریدار اُس سے نکاح کرے گا۔"

ایک اور عجیب رسم یہ تھی کہ میاں بیوی وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے بعد بخور جلا کر ساری رات اُس کے سامنے بیٹھے رہتے اور صبح سویرے غُسل کرتے تھے۔ بابل میں کوئی شخص بیمار پڑتا تو اس کے اعزہ اُسے لے جا کر شہر کے چوک میں لِٹا دیتے۔ رہگذر

اُس کی مزاج پُرسی کرتے۔ اِن میں سے بعض لوگ ایسے بھی نکل آتے جنہیں خود یہ مرض لاحق ہوا تھا چنانچہ وہ اُسے علاج بتلاتے اور مریض شفایاب ہو جاتا تھا۔

بنوکد نضر کی فتوحات کا سلسلہ مصر تک پھیل گیا تھا لیکن اُس کی موت کے بعد اِس عظیم بادشاہت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بلشاظر کے عہدِ حکومت میں کوروش کبیر شاہِ ایران نے ۵۳۹ ق م میں بابل کا محاصرہ کیا اور اُسے فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ بابل کا شہر سکندرِ اعظم کے حملے تک بارونق تھا لیکن سلطنت کا مرکز نہ رہنے کے باعث اُس کی اہمیت ماند پڑ گئی اور پارتھیوں کے زمانے تک وہ مٹی کے ٹھیکروں میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ آج دریائے فرات کے قریب ریگستان میں اُس کے کھنڈر میلوں تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

کتابِ مقدس میں لکھا ہے

"اے کنواری دُخترِ بابل! تو بے تخت زمین پر بیٹھ کیوں کہ اب تُو نرم اندام اور نازنین نہ کہلائے گی۔ ۔ ۔ ۔ اے کسدیوں کی بیٹی! چُپ ہو کر بیٹھ اور اندھیرے میں داخل ہو کیوں کہ تُو اَب مملکتوں کی خاتون نہ کہلائے گی۔"

اہلِ بابل کی اوّلیات اور اثرات گراں قدر ہیں۔ بابلی صابئین کے مذہبی عقائد، دیو مالائی قصّوں اور رسومِ عبادت نے اسرائیلی مذاہب پہ گہرے نقوش چھوڑے۔ یہودی بابل کی اسیری کے دوران میں جو کم و بیش اسّی برسوں پر محیط تھی پہلی بار شیطان اور فرشتوں کے تصورات سے آشنا ہوئے اور انہیں اپنے مذہب میں شامل کیا۔ اِس سے پہلے وہ اپنے قبائلی معبود یہواہ ہی کو خیر اور شر کا خالق اور مبدا سمجھا کرتے تھے۔

صابئین میں کہانت کی صورت میں اِلہام کا تصوّر صدیوں سے موجود تھا یعنی کاہن

از خود رفتگی کے عالم میں پیش گوئیاں کیا کرتے تھے۔ صابئین دن رات میں سات نمازیں پڑھتے تھے جن میں رکوع و سجود کرتے تھے۔ اُن کی یہ نمازیں سورج کے طلوع، عروج، زوال اور غروب کے ساتھ وابستہ تھیں۔ وہ صبح صادق، طلوع آفتاب اور دوپہر کے وقت شکرانے کی نمازیں پڑھتے تھے کہ سورج نے رات کی اتھاہ تاریکیوں سے جنم لے کر دوبارہ دنیا کو روشن کر دیا ہے اور سب کو زندگی بخشی ہے۔ اس کے بعد دو نمازیں زوال کی اور ایک غروب کی پڑھتے تھے جو تشویش کی نمازیں تھیں۔ مغرب کے بعد خطرے کی نماز پڑھی جاتی تھی کہ سورج تاریکی کے عالم میں چلا گیا ہے ممکن ہے لوٹ کر آئے یا نہ آئے۔ ایک نماز آدھی رات کے وقت پڑھتے تھے جس میں سورج کی حیاتِ نو کے لئے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ نماز پڑھنے سے پہلے وہ باقاعدہ وضو کرتے تھے۔ سورج گرہن، چاند گرہن اور جنازے کی نمازیں بھی پڑھتے تھے۔

اہلِ عراق نے سب سے پہلے آب پاشی کو رواج دیا، ہل ایجاد کی، انگور اور زیتون کی کاشت کی، چھکڑوں میں پہیے لگائے، بیل کو سدھایا، عمارتوں میں ڈاٹ، ستون اور گنبد کی ساخت کو رواج دیا، سونے چاندی کو لین دین کا سکّہ بنایا۔ کانسی کے بھاری ہتھیار بنائے، ہیئت اور ریاضی کے اصول وضع کئے، سال کو بارہ مہینوں، مہینے کو تیس دنوں، دن کو چوبیس گھنٹوں، گھنٹے کو ساٹھ دقیقوں اور دقیقے کو ساٹھ ثانیوں میں تقسیم کیا، سیاروں کی گردش کا مشاہدہ کر کے علمِ ہیئت کی بنیاد رکھی، دستاویزیں لکھیں اور ان پر مہریں لگانے کو رواج دیا، فنِ تحریر ایجاد کیا، گلی الواح کی صورت میں کتب خانے قائم کئے۔

اشور بنی پال کا کتب خانہ جو نینوا کی کھدائی سے ملا ہے اس میں الواح کا ایک مجموعۂ لغات بھی ہے جس میں سُمیری اور اکادی زبانوں کے ہم معنی الفاظ دیئے گئے ہیں۔ اہلِ عراق نے ایک جامع ضابطۂ قوانین مرتب کیا، دیو مالا کی تدوین کی، رزمیہ نظمیں لکھیں، تاریخ نگاری کا آغاز کیا، شہر مربع صورت کے تعمیر کئے جن کے بازار ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ پر قطع کرتے تھے اور ۲۲۰۰ ق م میں سب سے پہلے سیمنٹ کا استعمال کیا۔ اہلِ عراق کی یہ علمی و عملی فتوحات میراثِ نوعِ انسان کا بیش قیمت حصّہ سمجھی جاتی ہیں۔

مصر

مصر کو بجا طور پر تحفۂ نیل یا دنیا کا سب سے بڑا نخلستان کہا جاتا ہے۔ دریائے نیل میں ہر سال برسات کے موسم میں طغیانی آتی ہے اور اس کا پانی کناروں کے ساتھ ساتھ دور دور تک چکنی مٹی بکھیر دیتا ہے جس سے گیہوں، کپاس، گنے وغیرہ کی فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ قدیم مصر آج کل کے مصر سے بہت کچھ مختلف تھا۔ بارشیں متواتر ہوتی تھیں اور دریائے نیل کا دہانہ ابھی نہیں بنا تھا۔ وادیٔ نیل کے اندرونی حصے تک سمندر موجزن تھا۔ دونوں طرف سطح مرتفع تھی جس پر گھاس کے میدان تھے۔ اس زمانے کے باشندے شکار کھیل کر اور مواشی پال کر گذر اوقات کرتے تھے۔ وہ پتھر کے کلہاڑے اور تیر کمان سے کام لیتے تھے۔ ماقبل تاریخ کے اس انسان کے آثار ریت کے تودوں کے نیچے مدفون ملے ہیں۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ جغرافیائی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن سے بارشیں رک گئیں، دریائے نیل میں ہر سال طغیانی آنے لگی اور اس کا مستقل دہانہ بن گیا۔ لوگوں نے دریا کے کناروں پر بستیاں بسالیں اور کھیتوں کو نیل کے پانی سے سیراب کر کے گیہوں کی کاشت کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے کشتیاں بنانے کا فن سیکھ لیا اور روغنی برتنوں کی ساخت سے بھی واقف ہو گئے۔ وہ ہاتھی دانت کے زیور بنانے لگے اور پتھر کے بت تراشنے لگے۔ اس زمانے میں ملک دو حصوں میں بٹا ہوا تھا مصر صعید (اوپر کا مصر) جو نیل کے دہانے پر مشتمل تھا اور مصر زیریں یا ملک کا نچلا حصہ جو نیل کے کناروں کے ساتھ ساتھ آباد تھا۔

تمدن مصر کا شمار دنیا کے قدیم ترین تمدنوں میں ہوتا ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت اسرائیلی قبائل نے عراق سے فلسطین کی طرف پہلے پہل ہجرت کی اس وقت

اہرام مصر کی تعمیر پر ایک ہزار برس گذر چکے تھے۔ مصر پر تین ہزار برسوں میں جن فراعین[1] اور خانوادوں نے حکومت کی اُن کے نام اور حالات مذہبی پیشواؤں نے اپنی تصویری تحریروں میں محفوظ کر لیئے۔ ۲۸۰ء (ق م) کے لگ بھگ ایک کاہن من ہوہتپ نے فراعین مصر کو تیس خانوادوں میں تقسیم کیا تھا۔ جدید دور کے مؤرخین نے خانوادوں کی بجائے تاریخ مصر قدیم کو ادوار میں تقسیم کیا ہے یعنی قدیم بادشاہی، درمیانی بادشاہی اور نئی بادشاہی۔ ان ادوار کو فساد و انتشار، تنزّل اور طوائف الملوکی کے زمانے ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ مذہبی تحریروں کی شہادت ۳۱۰۰ء ق م تک جاتی ہے۔ کم و بیش اسی زمانے میں ملک کے دونوں حصوں نے مل کر ایک ریاست کی صورت اختیار کی۔ ایک روایت یہ ہے کہ مصر صعید کے حکمران می نس نے یہ اتحاد قائم کیا تھا۔ وہ دو مصروں کا پہلا بادشاہ بنا اور دوہرا تاج پہننے لگا، شمال کا سُرخ تاج اور جنوب کا سفید تاج۔

می نس کے بعد کئی فراعین کے حالات پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں حتّٰی کہ ہم فرعون وجوسر کے عہد تک آجاتے ہیں جس کا دارالحکومت ممفس تھا جو نیل کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ اس دور کے عظیم معمار امہوتپ نے وجوسر کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا جس کے آثار آج بھی سقارا میں موجود ہیں۔ اس مقبرے سے مصری فنِ تعمیر میں اہرام تعمیر کرنے کی روایت کا آغاز ہوا۔ ابوالہول جس کا جسم شیر کا اور چہرہ فرعون خافرع کا ہے اسی زمانے سے یادگار ہے۔ قدیم بادشاہی کم و بیش پانچ صدیوں تک قائم رہی۔ یہ مصر کی خوشحالی اور امن و امان کا دور تھا۔ اس عہد کے ایک فرعون پے پی (۲۷۳۸ء — ۲۶۴۴ء ق م) نے ۹۴ برس حکومت کی جو تاریخ عالم کا طویل ترین عہدِ حکومت سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کے تاریخی آثار خصوصاً اہرام، مجسّموں اور دیواری نقوش سے اُس کی شان و شوکت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان سنہری صدیوں میں مصرِ قدیم کے فنونِ لطیفہ معراجِ کمال کو پہنچ گئے۔ یہ بادشاہی ۲۲۰۰ء ق م کو ختم ہوئی اور انتشار کا دور شروع ہوا۔

درمیانی بادشاہی کا آغاز (۲۰۵۰ء ق م) سے ہوا جب نھی کس کے حکمران نے مصر کو دوبارہ متحد

---

[1] قبطی زبان میں فرعون کو پیرو کہتے تھے جس کا لغوی معنیٰ ہے "بڑا گھر"۔

کیا اور ایک طاقت ور حکومت کی بنیاد رکھی۔ مرورِ زمانہ سے تھیبس اپنے زمانے کا عظیم ترین شہر بن گیا۔ فراعین نے فیوم میں آب پاشی کا وسیع نظام قائم کیا نیوبیا کی کانوں سے کثیر مقدار میں سونا اور تانبہ نکالنے لگے۔ تھیبس میں مصر کے سب سے بڑے دیوتا آمن کے عظیم الشان معبد کارنک کی تعمیر شروع ہوئی۔ دو صدیوں کے امن و امان کے بعد پھر طوائف الملوکی کا زمانہ آگیا۔ ۱۸۰۰ء ق م کے لگ بھگ بیرونی حملہ آوروں نے مصر قدیم کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فاتحانہ یلغار کی۔ یہ حملہ آور جو غالباً آریائی نسل سے تھے شمال سے آئے تھے اور ہکساس (چرواہے) کہلاتے تھے۔ وہ جنگ میں گھوڑے اور رتھ سے کام لیتے تھے اور اعلیٰ درجے کی کمانیں استعمال کرتے تھے۔ مصری فوج جو پیدلوں پر مشتمل تھی رتھوں کی تاب نہ لا سکی اور شکست کھا کر تتر بتر ہو گئی ہکساس نے آگے بڑھ کر ملک پر قبضہ کر لیا لیکن وہ مصر صعید پر اپنا تسلّط نہ جما سکے اس لئے تھیبس میں بدستور فراعین حکومت کرتے رہے۔ آخر مصریوں نے بھی جنگی گھوڑے اور رتھ کو اپنا لیا۔ آح موس کے عہد میں انہوں نے تھیبس پر حملہ کیا اور ہکساس کو شکست دے کر ملک سے نکال باہر کیا۔ یہیں سے نئی بادشاہی کا آغاز ہوا۔

نئی بادشاہی کو شہنشاہی کا دور بھی کہا جاتا ہے گھوڑ سواروں اور رتھوں سے مسلّح ہو کر مصریوں نے ہمسایہ ممالک پر حملہ کر دیا اور ہر کہیں فتح و نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ فرعون تت موس کے عہد میں شہنشاہی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ تت موس کا شمار دنیائے عظیم ترین سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔ اُس نے ایشیا میں نمایاں فتوحات حاصل کیں اور اپنی سرحدوں کو دریائے فرات تک پہنچا دیا۔ مفتوح ممالک سے لاکھوں کنیزیں اور غلام لائے گئے۔ دیواری نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ نیوبیاء بابل، شام اور فلسطین کے غلام گروہ در گروہ خراج کے سامان سے لدے ہوئے مصر میں وارد ہوتے رہتے تھے۔ ملکہ مصر شپ سوت نے کارنک کے مندر میں توسیع کی اور دیر البحری میں ایک نہایت حسین معبد تعمیر کرایا۔ امن ہوتپ سوم نے لکسر کا معبد تعمیر کرایا جو اعجوبۂ روزگار سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اہرام[۱] مصر تعمیر کرانے کے بجائے سنگلاخ چٹانیں تراش کر اپنے مقبرے بنواتے شروع کئے۔ قبور سلاطین کی اس وادی میں چالیس فراعین دفن کئے گئے۔ ایک فرعون توت انخ آمن

---

[۱] جمع ہرم کی ہے۔ لغوی معنی ہے بڑھاپا، پرانی عمارت، گنبد۔

کا مقبرہ چوروں کی لوٹ کھسوٹ سے محفوظ رہا اور ۱۹۲۲ء میں دریافت کیا گیا۔ اس کے بیش قیمت دفینے صحیح و سالم دستیاب ہوئے ہیں۔ ان سے اُس دور کی خوشحالی کا علم ہوتا ہے توت انخ آمن کے پچاس برس بعد رع میسس دوم نے کارنک کا عظیم ہیکل مکمل کرایا اور وہاں اپنے سنگین مجسّمے نصب کرائے۔

رع میسس دوم ایک عظیم فاتح تھا۔ اُس نے ایک لشکرِ جرّار لے کر ایشیائی ممالک پر تاخت کی اور جو صُوبے مصریوں کے ہاتھوں سے نکل گئے تھے انہیں دوبارہ فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ ان فتوحات کے سلسلے میں لاکھوں یہودی غُلام بنا کر مصر میں لائے گئے۔ رع میسس ثانی کو خروج کا فرعون سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے عہد میں جنابِ موسیٰ[1] نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ رع میسس کے حرم میں سینکڑوں باندیاں تھیں۔ وہ ایک سو بیٹے اور پچاس بیٹیاں چھوڑ کر مرا۔ رع میسس سوم کے عہد میں کاہنوں کا بڑا زور ہو گیا۔ اُس کے زمانے کے ایک ہیرو غلیفی مسوّدے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک لاکھ سات ہزار غلام رکھتے تھے جو مصر کی آبادی کا ۱/۵۰ حصہ تھے۔ ان کی املاک میں پانچ لاکھ مواشی تھے ساڑھے سات لاکھ کھاؤں اراضی تھی جو مُلک کے کاشت کردہ رقبے کا ۱/۷ حصہ بنتی تھی۔ مصر اور شام کے ۱۶۹ شہروں کی آمدنی اُن کی جیب میں جاتی تھی اور اسی تمام املاک پر سرکاری محصولات معاف تھے۔

رع میسس سوم کے بعد پھر بدامنی کا دَور شروع ہوا۔ ۹۵۴ء ق م میں لیبیا کے باشندوں نے تُرک تاز کر کے ہر طرف تباہی پھیلا دی ۷۲۷ء ق م میں جنوب کی طرف سے حبشیوں نے حملہ کر دیا اور دُور دُور تک لُوٹ مار کی۔ ۶۷۶ء ق م میں اشوریوں نے زبردست حملہ کیا اور مصر شاہ سارڈاناپالس کا باجگزار بن کر رہ گیا۔ کُچھ عرصے کے بعد سیت کے شہزادے سام تک نے حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ اِس کے طویل دورِ حکومت کو احیائے فنون کا نام دیا جاتا ہے۔ ۵۲۵ء ق م میں ایرانی فوج شاہ کمبوجیہ کی قیادت میں حملہ آور ہوئی اور مصر کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا۔ ۳۲۲ء ق م میں سکندر نے مصر پر قبضہ کر لیا اور اپنے نام سے مشہور شہر سکندریہ بسایا۔ ۳۰ء ق م میں قدیم مصر رُوم کا ایک صوبہ بن کر ہمیشہ کے لئے صفحۂ تاریخ سے غائب ہو گیا۔

---

[1] موسیٰ قبطی نام ہے جس کا معنیٰ ہے "پانی کے قریب"

قدیم مصریوں کا اوڑھنا بچھونا مذہب تھا۔ اُن کے یہاں طوطم مت سے لے کر الٰہیات تک مذہب اپنے تمام مراحل ارتقاء میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ مذہب بڑا ہمہ گیر ہے اور اُس کے اثرات اُن کے معاشرے، فنون لطیفہ اور علم و ادب میں ہر کہیں دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی دیو مالا میں سینکڑوں دیوتا ہیں جن میں کم و بیش تمام پرندے اور جانور دکھائی دیتے ہیں، مینڈھا، بیل، گائے، مگرمچھ، بلی، سانپ، گیدڑ، گبریلا، بندر، عقاب، چیل، وغیرہ مختلف دیوتاؤں سے منسوب تھے اور مقدس مانے جاتے تھے۔ ان کے لئے معبد بھی تعمیر کئے جاتے تھے اور انہیں جان سے مارنے کی سزا موت تھی۔ اوزیرس کے بیل اور مندیز کے بکرے کی زوجیت میں حسین عورتیں دی جاتی تھیں۔ یہ دونوں جانور قدیم مصریوں کے ہاں جنسی قوت اور رجولیت کے مظاہر سمجھے جاتے تھے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کے چہرے کسی نہ کسی پرندے یا جانور کے اور جسم انسان کے بنائے جاتے تھے البتہ آئسس دیوی کا جسم اور چہرہ انسان کا تھا اور سر پر گائے کے سینگ تھے گائے آئسس دیوی کی علامت تھی اور بیل اور بچھڑے کے ساتھ نہایت مقدس سمجھی جاتی تھی۔ اسے جان سے مارنا اور اس کا گوشت کھانا ایک سنگین جرم تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ زمین گائے کے سُموں کے نیچے ہے۔ آفتاب سب سے بڑا دیوتا تھا۔ کبھی اسے خداوند خدا رع کی صورت میں پوجتے تھے جو آسمانی باپ تھا کبھی اسے ہورس کا نام دیتے تھے جس کا مقدس پرندہ شاہین تھا۔

قدیم مصریوں کے بڑے بڑے دیوتا تھے۔ رع (جنوب میں اسے آمن کہتے تھے)، اوزیرس، آئسس دیوی اور ہورس بعد کی صدیوں میں رع، آمن اور پتاح (خالقِ کائنات) ایک ہی خداوند خدا کے تین پیکر قرار دیے گئے۔ فرعون آمن رع کا بیٹا ہونے کا مدعی تھا اور خود بھی دیوتا تھا جو مقررہ وقت کے لئے ملک و دنیا کو منور کرنے کے لئے ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے سر پر شاہین کا مُکٹ ہوتا جو ہورس دیوتا کا علامتی مظہر تھا۔ تمام ملک کا طوطم سمجھا جاتا تھا۔ فرعون اپنی پیشانی پر پھن اٹھائے ہوئے سانپ کی شبیہہ پہنتا تھا۔ سانپ دانش کی علامت تھا۔ فرعون اپنے ہاتھ میں درانتی اور غلّہ کوٹنے والا چھڑا پکڑتا تھا جو ملک کی زرخیزی کی علامتیں تھیں۔ فرعون اپنے ملک کا سب سے بڑا پروہت بھی تھا۔ جب کبھی تہواروں پر دیوتاؤں کے جلوس نکلتے تو سب سے آگے چلتا تھا۔ فراعین اسی مذہبی مقام کی بنا پر صدیوں تک بلا خوف و خطر حکومت کرتے رہے۔

آئسس دیوی اوزیریس کی بہن اور زوجہ تھی۔ ایک لحاظ سے وہ اپنے عظیم شوہر پر بھی برتری رکھتی تھی کہ وہ حیات اور بار آوری کی دیوی تھی۔ مصری روایت کے مطابق آئسس ہی نے بیج بونے اور فصلیں اُگانے کا راز دریافت کیا تھا۔ مصر کے باشندے نہایت عقیدت اور شیفتگی سے اُس کی پوجا کرتے تھے وہ اس کے مجسموں میں ہیرے جواہرات جڑتے اور اُسے مادرِ خداوند اور مقدس ماں کہتے تھے۔ اُس کے عظیم معبد میں صبح و شام سیکڑوں پجاری جن کے سر منڈے ہوتے اُس کی مناجات میں خوش الحانی سے بھجن گاتے تھے۔ ہورس اس کا مقدس بیٹا تھا جو آفتاب دیوتا تھا۔ دسمبر کے اواخر میں جب ہورس یا آفتاب نئے سرے سے جنم لیتا تھا تو آئسس کے معبد میں بڑے جوش و خروش سے تہوار منایا جاتا تھا۔ آئسس کو اپنے ننھے بچے ہورس کو ایک اصطبل میں دودھ پلاتے ہوئے دکھایا جاتا تھا جس کا حمل اُسے بطور ایک معجزے کے ہوا تھا۔ ان نیم شاعرانہ نیم حکیمانہ علائم و رموز کے اثرات کلیسیائے روم کی رسوم عبادت اور مذہبی شعائر پر بڑے دوررس ہوئے چنانچہ دورِ اول کے بعض نصرانیوں کو آئسس اور ہورس کے مجسموں پر مریم عذرا اور ننھے یسوع کا دھوکا ہوتا تھا اور وہ اُن کے سامنے عقیدت سے سرنگوں ہو جاتے تھے۔ آئسس اور ہورس فی الاصل اِس قدیم روایت کی ترجمانی کرتے تھے جس میں عورت (حیات کا نسائی اصول) نے زندگی کی تخلیق کی اور بالآخر مادرِ خداوند بن گئی۔ ؁[1]

ابتدائی صدیوں میں اوزیریس دریائے نیل کا دیوتا تھا جس کی موت اور احیاء کے تہوار ہر سال منائے جاتے تھے۔ دریائے نیل میں پانی گھٹ جاتا تو لوگ سمجھتے کہ اُس کی موت واقع ہو گئی ہے جس پر وہ نوحہ خوانی اور سینہ زنی کرتے تھے۔ دریا میں دوبارہ طغیانی آنے پر خوشی کا جشن منایا جاتا تھا۔ اوزیریس کے بُت میں اُس کے تناسلی اعضاء کو بڑھا کر پیش کرتے تھے اِس کا لِنگ توالد و تکاثر کی علامت تھا۔ مذہبی تہواروں میں عورتیں اُس کے لکڑی کے لِنگ بنا کر انہیں چھکڑوں پر نصب کر لیتیں اور رسّی سے کھینچ کھینچ کر اسے اچھالتی تھیں اور گیت گاتی تھیں۔ لِنگ کے نشان ہر کہیں مجسموں اور دیواری نقوش کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ جنسی اختلاط کی علامت اُن کے ہاں انکھ (☥) کی صورت میں موجود تھی یعنی صلیب جس کا دستہ ہوتا

---

[1] FRAZER, J.G.: ADONIS

تھا۔ مصری اسے بارآوری اور حیات کی علامت سمجھتے تھے اور بطور تبرک و تفاؤل اسے گلے میں لٹکاتے تھے۔
جیسا کہ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے قدیم مصری تناسخ اور حیات بعد ممات کے قائل تھے۔
اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان کی رُوح موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور تین ہزار برس مختلف قالبوں کا چکر
کاٹ کر اپنے اصل جسم میں واپس آجاتی ہے۔ اس رُوح کو وہ "با" کہتے تھے "با" کے ساتھ وہ انسانی جسم میں قوّتِ
حیات کے قائل تھے جسے وہ "کا" کا نام دیتے تھے۔ "کا" جسم میں اسی طرح رہتی ہے جیسے درختوں کے جھنڈ میں
پَر پھڑپھڑاتا ہوا پرندہ"۔ وہ میّت کو حنوط کر کے محفوظ کر لیتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ خم دار اوزاروں
سے مغزِ سر نتھنوں اور کانوں کے سوراخوں سے باہر نکال لیتے تھے اور انتڑیاں مقعد کے راستے نکال دیتے تھے۔
اس کے بعد سر اور جسم میں خوشبویات اور مسالے بھر کر اس کی ممّی بناتے۔ لفظ ممّی فارسی کے لفظ مومیائی
سے نکلا ہے جو ان مسالوں کا جزوِ اعظم تھی۔ مسالے بھرنے کے بعد جسم کو کپڑے کی پٹیوں میں لپیٹ کر
تابوت میں بند کر دیتے تھے۔ ممّی بنانے کا رواج فراعین اور روسا تک محدود تھا۔ عوام کو مرنے کے بعد
ریت کا گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا تھا۔ دیوتاؤں کے مقدس جانوروں بیل، بکرے، بلّی، لنگور، مگرمچھ
گدھ وغیرہ کی کچھ ممیاں تھیباس کی کھدائی سے برآمد ہوئی ہیں۔

مصریوں کے خیال میں زندگی حیات بعد ممات کی طرف ایک سفر کے مماثل تھی۔ اُن کے عقیدے کے
مطابق مُردے کی رُوح اوزیریس (خداوندِ مُردگاں) کے حضور محاسبے کے لئے پیش کی جاتی تھی۔ وہ اُسے
ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ کر شُتر مرغ کے پَر کے ساتھ اُسے تولتا تھا۔ جو رُوح کم عیار ثابت ہوتی
اُسے تاریک گڑھے میں مقید کر دیا جاتا تھا جہاں وہ بھوک پیاس میں تڑپتی رہتی تھی۔ اِس گڑھے
یا دوزخ کو مصری امن تی کہتے تھے۔ اِس امن تی یا دوزخ میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو دوسری
اقوام کے تصورات میں بھی شامل ہو گئیں مثلاً کُتا، کشتی بان، پُل، آگ، ترازو، نرسنگھا، رینگنے
والے جانور، سانپ، بچھو وغیرہ ۱؎

۱؎ MEW, JAMES.: TRADITIONAL
ASPECTS OF HELL.

مصریوں کا مقدس ترین جانور دیوتا پتاح کا بیل اے پیس تھا۔ اے پس کے لیے ایک علیٰحدہ شاندار معبد تعمیر کیا گیا تھا جہاں اُس کی پوجا بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی مرنے کے بعد اُس کی ممی بنا کر جملہ رسوم ادا کی جاتی تھیں اور اُس کی جگہ لینے کے لیئے نئے اے پیس کی تلاش شروع ہو جاتی تھی جس کا رنگ سیاہ ہو اور ماتھے پہ سفید تثلیث کا نشان ہو۔ اے پیس کے لیئے شاندار مقبرے تعمیر کرائے جاتے تھے۔ جب کمبوجیہ شاہ ایران نے مصر فتح کرنے کے بعد حبشہ پہ حملہ کیا اور ناکام لوٹا تو دیکھتا کیا ہے کہ مصری جشن منا رہے ہیں، معلوم ہوا کہ انہیں نیا اے پیس مل گیا ہے۔ کمبوجیہ نے سمجھا کہ حکم دیا کہ اس بیل کو ذبح کر دیا جائے حکم کی تعمیل ہوئی اور جشنِ شادی دیکھتے دیکھتے ہنگامۂ نوحہ و بکا میں بدل گیا۔ اہل مصر نے کمبوجیہ کو یہ گناہ کبھی نہیں بخشا یہی اسرائیل کے بچھڑا اپنا کر اُسے پوجنے کی روایت مصریوں کی اے پیس پوجا ہی سے لی گئی تھی۔

موت کے بعد عذاب سے بچانے کے لیئے مکار پروہت کتابِ مُردگاں گراں قیمت پر بیچتے تھے جیسے بعد میں پاپائے روم نے معافی ناموں کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس کتاب میں اوزیریس دیوتا کو خوش کرنے یا اُسے فریب دے کر بچ نکلنے کے طریقے اور منتر درج تھے گناہ بخشوانے اور جنت میں جانے کے لیئے تعویذ گنڈے بھی دیے جاتے تھے۔ جادو کا رواج عام تھا۔ خود دیوتا بھی ایک دوسرے پر جادو کرتے تھے نظرِ بد اور خبیث ارواح کے شر سے بچنے کے لیے بھی گنڈے دیے جاتے تھے۔ فرعون آمن ہوتپ چہارم نے (۱۳۷۵ - ۱۳۵۸ ق م) پروہتوں کی دکان آرائی اور ابلہ فریبی کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس فرعون کا شمار تاریخ عالم کی عظیم ترین ہستیوں میں ہوتا ہے۔ اُس نے تخت نشین ہوتے ہی دیوتا آمن کی پرستش کو خلاف قانون قرار دیا، بُت پرستی سے منع کیا اور سیکڑوں دیوداسیوں کو جو مندروں میں عصمت فروشی کرتی تھیں اور جن کی آمدنی پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی معبدوں سے باہر نکال دیا۔ اُس نے آمن کے منبع پر مینڈھوں کی قربانی کو بھی منسوخ کر دیا اور حکم دیا کہ آمن دیوتا کا نام تمام مذہبی صحائف سے حذف کر دیا جائے۔ اُس نے سحر و ساحری اور تعویذ گنڈوں کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اُس نے اعلان کرایا کہ بُت پرستی جُہلا کا شیوہ ہے اور آمن مت محض ایک ڈھونگ ہے جو پروہتوں نے ذاتی منفعت کے لیے رچا رکھا ہے۔ اُس نے بتایا کہ خدا ایک ہے جو آتن یا روح

آفتاب کی صورت میں جوہرِ حیات اور اصولِ نمو بن کر کائنات میں طاری و ساری ہے۔ آمن ہوتپ نے اپنا نام بدل کر اخناتن رکھا جس کا معنی ہے "جس میں آتن مطمئن ہے"۔ اخناتن ایک خوش گو شاعر بھی تھا۔ اُس نے آتن کی حمد میں پُرجوش بھجن لکھے جن میں سے ایک نہایت فصیح و بلیغ بھجن ہم تک پہنچا ہے۔ علمائے مصریات کے خیال میں اِس بھجن اور عہد نامۂ قدیم کی بعض نظموں کے مابین گہری معنوی مماثلت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے بھجنوں میں کہتا ہے کہ آتن ایک ہے، وہ معبودِ واحد ہے، خالق اور پروردگار ہے۔ آتن جنگ و جدال یا فتح و نصرت میں نہیں ملتا بلکہ پودوں اور پھولوں میں مخفی ہے، حیات و نمود کے تمام پہلوؤں میں اُسی کا وجود ہے، آتن وہ مسرّت ہے جس سے بھرپور بھیڑیں اُچھلتی ہیں اور جس سے سرشار ہو کر پرندے دلدلوں کے سرکنڈوں میں اپنے پَر پھڑپھڑاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آتن کی تابش زندگی بخشتی ہے۔ وہ شفیق باپ، مہربان ہے، رحیم ہے، امن و آشتی کا خدا ہے، بے رنگ و بے صورت ہے۔ اُس نے آتن کے مجسّے تراشنے سے منع کر دیا اور تاریخ نوعِ انسان میں پہلی بار بُت پرستی اور کثرت پرستی کے خلاف آواز اُٹھائی۔ وہ اپنی ملکہ نفرتیت سے بڑی محبت کرتا رہا۔ اُس کے ساتھ پیار اور وفاداری کی زندگی بسر کر کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوا۔ اُس کا دین بھی اُسی کے ساتھ ختم ہو گیا کیوں کہ اُس کے داماد اور جانشین توت انخ آمن نے اُس کی مذہبی اصلاحات کی تنسیخ کر دی اور دوبارہ آمن مت کو نافذ کر دیا۔ اخناتن نے آتن کے نام پر ایک شہر بھی بسایا جو اُس کی موت کے بعد اُجڑ کر رہ گیا۔

مصریوں کو فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ فنِ تعمیر، مجسّمہ سازی، مصوّری اور شاعری میں اُنھوں نے ناقابلِ فراموش شاہکار پیش کیے۔ اُن کے اہرام کا شمار عجائباتِ عالم میں ہوتا رہا ہے۔ اہرام کی تعمیر پر دو ہزار برس گزر چکے تھے جب یونانیوں نے انہیں دُنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا تھا۔ اُن کی مضبوطی اور پائیداری کے بارے میں ایک عرب شاعر نے کہا تھا "تمام چیزیں زمانے سے خائف ہیں لیکن زمانہ اہرام سے خائف ہے"۔

اہرام دراصل مقبرے ہیں جو فراعین کی ممیوں اور ساز و سامان کو محفوظ رکھنے

کے لئے بنائے گئے تھے۔ تمدنِ مصر کے ابتدائی دور میں مُردوں کو ریت کے گڑھوں میں دبا دیا جاتا تھا، بعد میں ریت کو اپنی جگہ سے سرک جانے سے روکنے کے لئے اُن پر پتھر کے چبوترے بنانے لگے، پھر اُن پر کمروں کا اضافہ ہوا اور اہرام کی تعمیر کا آغاز ہوگیا۔ جب کوئی فرعون تخت نشین ہوتا وہ اپنا مقبرہ بنانے کا اہتمام کرنے لگتا تھا۔ چنانچہ ایک ہزار برس تک فراعین اہرام تعمیر کرتے رہے۔ قاہرہ کے نواح میں آج بھی چھوراسی اہرام کے آثار موجود ہیں۔ تین بڑے اہرام دریائے نیل کے مغربی کنارے پر تعمیر کرائے گئے تھے کیونکہ آفتاب مغرب میں ڈوبتا ہے اور مصریوں کا خیال تھا کہ مُردوں کا گھر بھی مغرب ہی میں ہوگا۔ یہ اہرام غزہ کے قریب آسمان سے سر بھڑائے کھڑے ہیں۔ سب سے بڑا ہرم خوفو نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا رقبہ چودہ ایکڑ ہے اور بلندی چار سو اکاسی فٹ کی ہے۔ اس کی تعمیر پر تیس لاکھ بڑے بڑے پتھر صرف ہوئے جن کا وزن اڑتالیس لاکھ اسّی ہزار ٹن ہے۔ آج تک لوگ محوِ حیرت ہیں کہ خوفو کے اہرام کی چھتوں پر لگی ہوئی پچاس پچاس ٹن وزن کی چٹانیں کیسے اتنی بلندی پر پہنچائی گئی ہوں گی۔ ان اہرام کی تعمیر پر لاکھوں قیدی غُلام، مزدور اور معمار برسوں کام کرتے رہے۔ سنگلاخ چٹانیں پہاڑوں سے تراش کر دریائے نیل کے راستے یہاں لائی جاتی تھیں۔ سنگ خارا کی ان عظیم سلوں کو اس کاریگری سے جوڑا گیا ہے کہ آج بھی درز میں بال تک نہیں جا سکتا۔ اہرام کے قریب ابوالہول ہے جس کا جسم شیر کا اور چہرہ فرعون خائف رع کا ہے۔ فتحِ مصر کے بعد ترک سپاہی مشق کے لئے اس کے سر پر توپ کے گولوں سے نشانے لگاتے رہے جس سے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ سقارا کے نواح میں جہاں میریٹ نے کھدائی کرائی تھی ایک سو چالیس ابوالہول برآمد ہوئے تھے۔ اس علاقے کو سیراپیوم کہا جاتا ہے۔ آمن کے معبد اور کارنک اور لکسر کے عظیم مندروں کے شکستہ آثار بھی اہرام سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان مندروں میں فنِ تعمیر کے اُن اسالیب کی تشکیل ہوئی جن سے اہلِ کریٹ اور قدمائے یونان متاثر ہوئے تھے۔ یہاں ڈاٹ بھی ہے اور ایوان بھی دکھائی دیتا ہے۔ دیواروں پر آرائش کا کام اتنا نفیس کیا گیا ہے کہ قدیم دُنیا میں کہیں بھی اس کا جواب نہیں ملتا۔ وہ ستون جو اپنی ساخت اور وضع کے لحاظ سے یونانی فنِ تعمیر سے منسوب کئے جاتے ہیں انہیں مندروں کے ستونوں کی نقلیں ہیں۔ مصری فنِ تعمیر کے اثرات کریٹ اور یونان تک ہی محدود نہیں رہے بلکہ ہخامنشیوں کے واسطے

سے ہندوستان میں بھی نفوذ کر گئے۔ ایرانیوں نے مصریوں ہی سے ایوان مستعار لیا تھا اور اصطخر کی تعمیر میں اس روایت کو برتا تھا۔ اصطخر سے ہوتا ہوا یہ ایوان پاٹلی پترا تک جا پہنچا جسے موریا خاندان کے راجاؤں نے تعمیر کرایا تھا۔

مصر کے آرٹ (۲۸۹۵ء ــ ۲۳۶۰ء ق۔م) نے اہرام کے علاوہ جو غیر فانی شاہکار تخلیق کئے گئے تھے ان میں شہرۂ آفاق سنگین مجسمے بھی ہیں جو آج کل قاہرہ کے عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ سنگ تراشی کا تعلق مذہب سے خاصا گہرا رہا ہے۔ اکثر مجسمے جو ہم تک پہنچے ہیں مرنے والوں کی شبیہیں تھیں جو مقبروں کی کھدائی سے برآمد ہوئی ہیں۔ مُردے کے تابوت کے بالائی تختے پر اس کی شبیہہ کے ساتھ وہ مشاغل بھی نقش کر دیئے جاتے تھے جن میں وہ دلچسپی لیا کرتا تھا۔ چوتھی نسل کے مجسمے بالخصوص حقیقت نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ اُن کے خدوخال میں مرنے والے کا کردار اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت اُجاگر کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس حقیقت نگاری کو یونانی اور رومی سنگ تراش بھی اپنی گرفت میں نہیں لا سکے۔ سنگ تراشی میں چند فنی رسوم و روایات ایسی پیدا ہو گئیں جن سے سر مو انحراف نہیں کیا جاتا تھا مثلاً مجسموں کے بیٹھنے کا ایک جیسا انداز، پیروں کی خاص وضع، یک رخے نقوش میں آنکھوں کو ایسے دکھانا جیسے کہ وہ سامنے سے دکھائی دیتی ہیں۔ ان رسومِ[1] فن کی کڑی پابندی کے باوجود ان نقوش میں خطوط کی آزاد روی اور حرکت کا انداز ایسا فطرتی ہے کہ دنیا کے فن میں سوائے چینی اور جاپانی مصوری کے کہیں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ بعض ناقدینِ فن نے ان رسوم و روایاتِ فن کو جمود اور تقلیدِ بے جا پر محمول کیا ہے۔ دوسری طرف افلاطون اپنے مکالمات میں اسی تقلید اور مداومت کے باعث مصری آرٹ کی تعریف میں رطب اللساں ہے۔ فرعون سیتی کے عہد کے آرٹ کا سب سے بڑا کارنامہ وہ عُریاں نسوانی نقوش ہیں جن میں جامد فنی رسوم کے باوجود بھرپور بالیدگی، قوت اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔

---

[1] MOTIFS

تعمیر اور سنگ تراشی کے علاوہ مصری موسیقی، رقص اور نقاشی میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فراعین کے محلات اور معبدوں میں موسیقاروں، سازندوں اور ناچنے والی لڑکیوں کے طائفے ہمہ وقت حاضر رہتے تھے۔ رئیس موسیقی فرعون کے دربار کا ایک اعلیٰ عہدے دار تھا۔ موسیقی کے سازوں میں بربط، عُود، طبل اور شہنائی کے ساز دیواری نقوش میں دکھائی دیتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری پھونک، تار اور گمک کے نفیس ساز بنانے پر قادر تھے۔ بعد میں اہل یونان نے یہ ساز اپنائے۔ ناچنے والیاں ایسے شفاف کپڑے پہن کر رقص کرتی تھیں کہ جسم کے تمام دلکش زاویے اور خطوط صاف دکھائی دیتے تھے۔ بعض اوقات مادر زاد برہنہ ہو کر بھی ناچتی تھیں۔ مصر اور دوسرے عرب ممالک کے بیلی ڈانس میں یہ روایت محفوظ ہے عوازی[ص۱] اسی کی ترجمانی کرتی ہیں اور شبانہ محفلوں میں بعض اوقات قدرتی لباس میں ناچتی ہیں۔ بیلی ڈانس میں کولہوں کو نہایت ہوس پرور انداز میں تیزی سے ٹمکایا جاتا ہے۔ مصریوں کی شاعری کے بعض اچھوتے نمونے دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہے ہیں۔ ان عشقیہ نظموں میں عاشق یا بھائی نے اپنی بہن یا محبوبہ کو مخاطب کیا ہے۔ بعض نظمیں عورتوں نے اپنے محبوب بھائیوں کو لکھی ہیں۔ ان میں ہجر و وصال کی وہی کیفیات ہیں جو اقوامِ عالم کی شاعری میں بالعموم دکھائی دیتی ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے

کاش میں اُس کی حبشی کنیز ہوتا

تاکہ اُس کے بدن کی لطافتوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا۔

مصریوں کے فنونِ صغیرہ کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں اُن سے علم ہوتا ہے کہ مصریوں کا ذوقِ جمال بڑا ہمہ گیر اور ہمہ رس تھا۔ توت انخ آمن کے مقبرے سے روزمرّہ کے استعمال کی نہایت خوش وضع اشیاء برتن، کرسیاں، پلنگ وغیرہ برآمد ہوئے ہیں اور عطردان اور زیورات کے نفیس منقّش ڈبّے ملے ہیں۔ سونے چاندی کے پیالے ہیں، آفتابے ہیں، بلور کے ساغر ہیں، پتھر کے پیالے ایسے

ص۱ مصر کی پیشہ ور ناچنے والیاں، عوازی جمع ہے غازیہ کی۔

عمدہ ہیں کہ شفاف معلوم ہوتے ہیں۔ آمن ہوتپ سوم کے محلوں سے جو باسن برآمد ہوئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظروف سازی کا فن ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا تھا۔ درمیانی بادشاہی کے دَور کے بنے ہوئے سونے چاندی کے زیورات بھی بڑے نفیس ہیں۔ وِل ڈیوراں نے قدیم مصریوں کے فنی و صنعتی کمالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[1]

"تمدن کے ابتدائی دَور ہی میں مصریوں نے تانبے اور قلعی کی آمیزش سے کانسی بنانے کا راز معلوم کر لیا تھا۔ پہلے کانسی کے ہتھیار تلواریں، خود، ڈھالیں وغیرہ بنائیں پھر اس سے پہیے، گراریاں، کلیں، پیچ، پھانے وغیرہ بنانے لگے۔ اِن کلوں میں وہ سنگِ خارا میں شگاف بھی ڈال سکتے تھے۔ وہ اپنی آری سے تابوت کے لیے سخت ترین لکڑی بھی کاٹ سکتے تھے۔ مصری کاریگر سیمنٹ اور پلاسٹر آف پیرس بناتے تھے اور پزاوے میں اینٹیں پکاتے تھے۔ وہ مٹی کے سُرخ روغنی برتن بناتے تھے، شیشہ آلات کی ساخت سے واقف تھے، انہیں رنگین بھی بناتے تھے۔ وہ لکڑی کا منقش کام کرنے کے ماہر تھے، گاڑیاں، کُرسیاں، پلنگ بناتے تھے۔ تابوت ایسے حسین تراشتے تھے کہ انہیں دیکھ کر آدمی کا مرنے کو جی چاہنے لگے۔ جانوروں کی کھالوں سے کپڑے، ترکش، ڈھالیں اور گدے بناتے تھے۔ چمڑے کی دباغت کے تمام مراحل کی تصویریں مقبروں کی دیواریں پر بنی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ موچیوں کے ہاتھوں میں وہ خمدار چاقو دکھائی دیتے ہیں جنھیں موچی آج بھی استعمال کرتے ہیں پیپائرس کے پودے سے رسّے، چٹائیاں، جوتے اور کاغذ بناتے تھے۔ وہ علم کیمیا کے اصولوں سے صنعت و حرفت میں کام لیتے تھے۔ بافندے کپڑا ایسا نفیس بُنتے تھے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ چار ہزار سال قبل مسیح کی ململ کے نمونے آج بھی موجود ہیں۔ وقت گزرنے کے باوصف وہ ایسے باریک اور نازک بُنے ہوئے ہیں کہ انہیں ریشم سے

---

[1] DURANT, WILL.: OUR ORIENTAL HERITAGE.

تمیز کرنے کے لیے محدّب شیشے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ آج کل کی کلوں میں بُنا ہوا بہترین کپڑا بھی ہاتھ سے بُنے ہوئے اس کپڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پسچل نے کہا ہے "ہم مصریوں کی تکنیکی ایجاد اور جدّت طرازی کا مقابلہ اپنے کاریگروں سے کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دُخانی انجن کی ایجاد سے پہلے وہ ہر لحاظ سے ہم پر برتری رکھتے تھے"۔

افلاطون نے گیند کی ایجاد کو بھی قدیم مصریوں سے منسوب کیا ہے۔ مسہری بلاشبہ اُن کی متعدد ایجادات میں سے ایک ہے۔ مچھروں سے بچاؤ کے لیے دلدلی علاقوں میں رات کو بستر پر مسہری لگا لیتے تھے۔

قدیم اقوام میں مصریوں کی دانش و حکمت کا چرچا تھا۔ مذہبی اوہام اُن کے ذہن پر اس طرح چھا چکے تھے کہ وہ منطق یا فلسفے کا کوئی باقاعدہ نظام پیش نہ کر سکے بایں ہمہ اُن کی تحریریں خود آموز ہیں بعض مورخین کے خیال میں فلسفے کی قدیم ترین کتاب 'نصائح پتاح ہوتپ' ہے جو کم و بیش تین ہزار برس کی پرانی ہے۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ اہلِ یونان تحصیلِ علوم کے لیے مصر کا سفر کیا کرتے تھے۔ طالیس، فیثا غورس، افلاطون اور اقلیدس نے مصرِ قدیم کی درس گاہوں سے کسبِ فیض کیا تھا۔ عہد نامۂ قدیم کی امثال کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ یہ مصری دانش وروں کے اقوال سے ماخوذ ہیں۔ فرعونِ مصر اماسس اپنا نظریۂ حیات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"تیر انداز جب تیر چلانا چاہتے ہیں تو اپنی کمانوں کو کھینچتے ہیں لیکن تیر اندازی سے فارغ ہو کر چلّے اتار دیتے ہیں کمانیں ہر وقت کھچی رہیں تو بے کار ہو جاتی ہیں۔ یہی حال آدمیوں کا ہے اگر وہ ہمیشہ سنجیدہ کاموں میں مصروف رہیں اور سیر و تفریح اور کھیل تماشے میں حصہ نہ لیں تو ان کے حواس میں خلل آجاتا ہے اور وہ سوداوی اور خشک مزاج ہو جاتے ہیں میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں۔ میں نے اپنے اوقات کام اور تفریح میں بانٹ رکھے ہیں۔"

اماسس کی اس نفسیاتی بصیرت پر کوئی بڑے سے بڑا عالمِ نفسیات بھی اضافہ نہیں کر سکے گا۔

آج یہ بات عجیب سی لگے گی مگر حقیقت یہی ہے کہ قدیم مصری یونانیوں کو وحشی اور اُجڈ خیال کرتے تھے اور دسترخوان پر انہیں اپنے ساتھ بٹھانے سے گریز کرتے تھے۔ علمِ مساحت جسے یونانیوں نے جیومیٹری (لغوی معنی: زمین کی پیمائش) کا نام دیا خاص اہلِ مصر کی ایجاد ہے۔ مصری آب پاشی کے لیے دریائے نیل کا پانی نالیوں سے اپنے کھیتوں میں لے جاتے تھے۔ اِس لئے انہیں زمین کی پیمائش اور پانی کی تقسیم کا خاص خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اِسی پیمائش کے اصولوں پر مساحت یا جیومیٹری کی تدوین کی گئی تھی۔

مصری جناب مسیحؑ کی پیدائش سے تین ہزار برس پہلے پپائرس کے پودے سے کاغذ بنانے لگے تھے۔ تصویر نگاری (ہیروغلیف) خاص اُن کی ایجاد ہے۔ وہ دائیں سے بائیں کو لکھتے تھے اور دو قسم کا رسم الخط استعمال کرتے تھے: ایک دُنیوی مقاصد کے لیے تھا دوسرا مذہبی تحریروں کے لیے وقف تھا۔[1] اپنی تحریروں کو لپیٹ کر مرتبانوں میں محفوظ کر لیتے تھے۔ اِسی قسم کے دو ہزار برس پہلے کے کتب خانے دریافت کئے گئے ہیں جن میں مذہبی بھجن، گیت، عشقیہ نظمیں، کہانیاں علمِ طب کے اصول اور نسخے، تاریخ و سیر وغیرہ کے علوم محفوظ ہیں۔ ایک کہانی سندباد کی کہانی کا نقشِ اوّل معلوم ہوتی ہے۔ تعلیم و تدریس پر پروہتوں کی اجارہ داری تھی۔ معبدوں سے ملحقہ مدرسوں میں بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ مدرسوں کی تادیب سخت تھی۔ مصری اُستادوں کے خیال میں "بچوں کے کان اُن کے چوتڑوں میں ہوتے ہیں۔ جب تک اُن کے چوتڑوں پر ڈنڈے رسید نہ کیے جائیں بچے توجّہ سے بات نہیں سُنتے۔" قلم سرکنڈے اور نرکل کے تراشتے تھے۔ ہمارے دیہات میں طلبہ آج تک یہی قلم استعمال کر رہے ہیں۔ نپولین[1] مصر پر حملہ آور ہوا تو اپنے ساتھ وہاں کے آثارِ قدیمہ کا مطالعہ کرنے کے لیے علماء کی ایک جماعت بھی لیتا گیا لیکن سب ہیروغلیفی تحریر کو پڑھنے میں عاجز ہوئے۔ آخر ایک فرانسیسی عالم شمپولیوں کو کامیابی نصیب ہوئی اور مصری علوم و فنون کے

---

[1] ص CERAM, C.W.: GODS, GRAVES & SCHOLARS.

دروازے اہلِ علم پر کھل گئے۔ مصریات کو ایک مستقل شعبۂ علم قرار دے دیا گیا۔ اِس میں بالزونی لیپ سیس، میریٹ، پڑی وغیرہ نے اہم انکشافات کئے۔

مصریوں کا سب سے قابلِ قدر کارنامہ اُن کی طب ہے۔ مصری طبیب اپنی حذاقت اور فراست کے لئے تمام متمدّن ممالک میں مشہور تھے۔ شاہانِ وقت اپنے درباروں میں انہیں ملازم رکھتے تھے۔ جس علم کو ہم "طبِ یونانی" کہتے ہیں اُس کے اصول و مبادی مصری طب ہی سے ماخوذ ہیں۔ بقراط اور جالینوس نے قدیم مصری اطبّاء کی خوشہ چینی کی تھی۔ تمدّنِ مصر کے ابتدائی دَور میں طب اور جادو کا آپس میں گہرا تعلق تھا مثلاً کوئی جادوگر کسی شخص کو ایذا پہنچانا چاہتا تھا تو وہ اُس کا کپڑے کا پتلا بنا کر اُس میں منتر پڑھ پڑھ کر سوئیاں چبھو دیا کرتا خیال یہ تھا کہ سوئیاں اُس کے بدن میں چبھ رہی ہیں اور وہ جلدی ہی مر جائے گا۔ مصری طب بھی اِسی اصول پر مبنی تھی۔ بادام کو مقوّی بصر سمجھتے تھے کیوں کہ اُس کی شکل آنکھ سے مشابہ ہے۔ اخروٹ مقوّی دماغ ہے کہ اِس کا گودا مغزِ سر سے ملتا جلتا ہے سیب مقوّی دل ہے کہ سیب اور دل کی شکل مشابہ ہے تقویتِ باہ کے لئے بکرے اور بیل کے اعضائے تناسل دواؤں میں کوٹ پیس کر مریضوں کو کھلاتے تھے کیوں کہ وہ اِن جانوروں کو غیر معمولی رجولیّت کا مالک سمجھتے تھے۔ ہمارے "یونانی اطبا" آج بھی انہیں اپنے مُبہی اور مقوّی نسخوں میں استعمال کرتے ہیں۔ پیاز کی شکل خصیتین سے ملتی ہے اِس لئے اِسے مقوّیٔ باہ سمجھتے تھے۔ چِڑا ایک ہی نشست میں بار بار چِڑیا سے اختلاط کرتا ہے اِس لیے "مغزِ گنجشکِ نر" کوتاہ ہمتوں کو کھلاتے تھے۔

مصری حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اُن کے شہروں کی گلیاں کوچے صاف ستھرے تھے۔ ہر شخص بلا ناغہ صبح سویرے ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال ہر تیسرے روز مونڈتے تھے۔ دوسری اقوام میں کاہن اور پروہت سر اور ڈاڑھی کے بال بڑھاتے تھے لیکن مصری پروہتوں کو ہر روز بال صاف کرنا پڑتے

تھے۔ مہینے میں تین بار جلاب لیتے تھے جس سے اُن کی صحت پر بڑا خوشگوار اثر پڑتا تھا۔ ہیرو ڈوٹس نے کہا ہے کہ مصری تمام دنیا کے لوگوں میں سب سے زیادہ صحت مند ہیں۔ حُقنے کی ایجاد مصر ہی میں ہوئی تھی۔

مصریوں کا علم الحیل (انجنیئرنگ) ہر کہیں مسلّم تھا۔ پانی کھینچنے کے چرسے اور تقویم کی ایجادات بھی اُن سے منسوب کی گئی ہیں۔

فراعینِ مصر کا نظم و نسق مثالی سمجھا جاتا تھا۔ اہلِ مغرب نے انتظامی قواعد مصریوں سے لئے تھے۔ مثلاً فرعون اماسس کا حکم تھا کہ سال میں ایک دفعہ تمام لوگوں کی املاک، آمدنی اور خرچ کا سرکاری طور پر محاسبہ کیا جائے۔ جس شخص کی بابت یہ ثابت ہو جاتا کہ اُس نے ناجائز وسائل سے گذشتہ سال اپنی املاک اور دولت میں اضافہ کیا ہے اُسے سزائے موت دی جاتی تھی، یونان کے مشہور مقنّن سولن نے یہ ضابطہ مصریوں سے مستعار لے کر اپنے یہاں رائج کیا تھا۔ مصریوں کے ہاں پولیس کا محکمہ نہیں تھا۔ جرائم کی تفتیش محلے یا شہر کے لوگ خود ایسی مستعدی سے کرتے تھے کہ جُرم کا اخفا یا مجرم کا فرار ناممکن تھا۔ سزائے موت کا رواج بھی تھا۔ طبقۂ اعلیٰ کے مجرموں کو دار و رسن کی ذلّت سے بچنے کے لیے خودکشی کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ فرعون کا وزیرِ اعظم تمام نظم و نسق کا مہتمم تھا۔ ایک "مجلس بزرگاں" تھی جو معمّر اور جہاں دیدہ درباریوں پر مشتمل تھی۔ دورِ عُروج میں مصر کی عسکریت کا شہرہ تھا جب کبھی کوئی مصری سپاہی کسی دشمن کو قتل کرتا تو مقتول کا سر یا داھنا ہاتھ کاٹ کر اپنے حساب میں جمع کرا دیتا تھا۔ نظمِ مملکت کے تمام محکموں میں پروہتوں کا تصرّف تھا۔ فراعین کی رسمِ تاج پوشی سے لے کر اُن کی تجہیز و تکفین کی رسوم تک جن پر اُن کی بقا کا انحصار ہوتا تھا وہی ادا کرتے تھے اس لئے پروہتوں کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ ہمیشہ انعام و اکرام سے اُن کی تالیفِ قلب کرتے تھے۔

مصری معاشرے میں عورت کا مرتبہ بلند تھا اور معاشرے میں اُسے مرکزی حیثیت

دی گئی تھی۔ عورت کا یہ مقام نیم مادری نظامِ معاشرہ کا نتیجہ تھا۔ عورت نہ صرف اپنے گھر میں خود مختار تھی بلکہ تمام املاک اُسی کی جانب سے وارثوں کو ملتی تھی۔ شادی کے موقع پر خاوند اپنی جائیداد غیر منقولہ و منقولہ اپنی زوجہ کے نام منتقل کرا دیتا تھا۔ فراعین اور روساء عام طور سے اپنی بہنوں سے نکاح کرتے تھے تاکہ وہ اُن کے ورثے میں حصہ دار بن سکیں جو انہیں اپنی ماؤں کی جانب سے ملتا تھا۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ یہ جائیداد اغیار کے قبضے میں چلی جائے۔ بعض فراعین اپنی بیٹی سے نکاح کر لیتے تھے۔ رع میسیس ثانی نے یکے بعد دیگرے اپنی کئی بیٹیوں سے نکاح کیا تھا۔ بہن سے شادی کا رواج عوام میں بھی ہو گیا تھا۔ شادی سے پہلے لڑکی اظہارِ محبت کرنے میں پہل کرتی تھی۔ مصری شاعری میں بہن بھائی کے الفاظ وہی مفہوم رکھتے ہیں جو ہمارے یہاں عاشق و معشوق کے ہیں۔ ایک حسینہ اپنے محبوب کو خط میں لکھتی ہے۔

"میرے خوبرو محبوب میری تمنا ہے کہ میں تیری زوجیت میں آجاؤں اور تیری املاک کی مالک بن جاؤں۔"

مصری جنسی موضوع پر بے تکلف بات کرتے تھے اور اپنے مُردوں کے دل کو بہلانے کے لیے تابوت میں ہوس پرور نظمیں رکھ کر دفن کرتے تھے۔ لڑکیاں بالعموم دس برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی تھیں۔ وہ ماقبل نکاح کے جنسی تعلقات میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ سدومیت کا رواج بھی تھا۔ کسبیاں اپنی کمائی سے اپنے عالی شان مقبرے تعمیر کراتی تھیں۔ روساء کے طبقے سے منتخب حسین لڑکیاں دیوتاؤں کی زوجیت میں دی جاتی تھیں جو فی الحقیقت پروہتوں کے تصرّف میں آتی تھیں۔ ہر سال طغیانی کے موقع پر ایک دوشیزہ کو دلہن بنا کر دریائے نیل میں غرق کرتے تھے کہ دیوتا مہربان ہو جائے اور طغیانی وقت پر آئے۔ مصری اپنی بیوی کے جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے۔ پتاح ہوٹپ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"اپنی زوجہ کے دل کو خوش رکھنا کیوں کہ وہ ایسی کھیتی ہے جو اپنے آقا کے
لئے نفع بخش ہوتی ہے۔ تو اُس سے دشمنی رکھے گا تو تباہ ہو جائے گا۔"

مصری نومولود کا زائچہ بناتے تھے۔ سسرو نے کہا ہے کہ مصری اور کالدی سیاروں کا مشاہدہ کر کے نومولود کی آئندہ زندگی کے بارے میں پیش گوئی کرتے تھے۔ عام مصری سر منڈھا کر دھاریدار کپڑے کی ٹوپی پہنتے تھے جو کھوپڑی سے چپک جاتی تھی اور گردن کو بھی ڈھانپ لیتی تھی۔ بچوں کے سروں پر لٹیں رکھتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ بچے کو ایک خاص عمر تک کسی دیوتا کے نام پر وقف کر دیا جاتا تھا۔ یہ عمر پوری ہونے پر بڑا جشن مناتے تھے اور دیوتا کے معبد پر قیمتی چڑھاوے نذر کرتے تھے۔ جب کوئی شخص مر جاتا تو متوفی کے گھر کے مرد اور عورتیں اپنے سروں پر راکھ ڈال کر ماتمی جلوس نکالتیں اور روتے پیٹتے ہوئے گلی کوچوں کا چکر لگاتی تھیں۔ واپسی پر مردے کی ممی بنانے کا آغاز ہوتا تھا۔

عورتیں مرد عام طور سے بے سیئے کپڑے پہنتے تھے۔ مرد دو کپڑے اوڑھ لیتے، عورتیں ایک ہی کپڑے سے بدن ڈھانپ لیتی تھیں۔ عورتیں قیمتی جواہرات کے ہار اور سونے کے کنگن پہنتی تھیں اور آرائش و زیبائش میں خاص اہتمام کرتی تھیں۔ مصری پروہت سور کے گوشت، لہسن، مسور کی دال اور مٹر کھانے سے پرہیز کرتے تھے۔ سور کو سخت ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ اِس کے چرواہوں کو مندروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ جب کسی شخص کا کپڑا سرِ راہ کسی سور سے چھو جاتا تو وہ سیدھا دریا پر جا کر غسل کرتا تھا۔ کھانے پر بیٹھتے ہی دعا مانگتے تھے۔ مچھلی کثرت سے کھائی جاتی تھی۔ مصریوں میں ختنہ کرانے کا رواج تھا۔ شروع شروع میں آئسس دیوی کے پجاری اپنے آلاتِ تناسل قطع کر کے دیوی پر بھینٹ کرتے تھے، مرورِ زمانہ سے غلافِ حشفہ کے کٹوانے پر اکتفا کرنے لگے گویا ختنہ قربانی کا بدل بن گیا تھا۔ سور کے حرام ہونے کا تصوّر اور ختنہ بنی اسرائیل نے اہلِ مصر ہی سے اخذ کئے تھے۔

اہلِ مصر کے آداب میں یہ بات داخل تھی کہ جب کبھی کسی نوجوان کی مڈبھیڑ کسی بوڑھے

آدمی سے ہوجاتی تو وہ ادب سے راستہ چھوڑ دیتا تھا۔ اِسی طرح کسی بزرگ کے مجلس میں قدم رکھتے ہی نوجوان تعظیم سے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ ضیافت پر عام طور سے مہمانوں کو کنول کے پھول پیش کئے جاتے تھے اور ان کے گلے اور بازوں میں پھولوں کے گجرے اور ہار پہناتے تھے۔ اُن کے ہاں ایک عجیب رسم یہ تھی کہ ضیافت کے خاتمے پر صاحبِ خانہ کا غلام ایک لکڑی کی ممی اٹھا کر لاتا اور باری باری سب مہمانوں کے آگے کر کے کہتا۔

"اِسے خوب غور سے دیکھئے، خوب کھا پی کر مزے کیجئے۔ موت کے بعد آپ کا حشر بھی یہی ہوگا۔"

قدیم مصر میں ہر دیوی اور دیوتا کے مخصوص تہوار سال میں کئی مرتبہ منائے جاتے تھے۔ سب سے بڑا تہوار اوزیرلیس اور آئسس کے تھے۔ جب دریائے نیل کا پانی گھٹتے گھٹتے ایک جوئے کم آب رہ جاتا تو مصری سمجھتے کہ نیل کا دیوتا اوزیرلیس مرگیا ہے چنانچہ بصیرلیس کے مقام پر ہزاروں عورتیں مرد اکھٹے ہو کر ماتم کرتے اور سینہ کوبی کرتے ہوئے جلوس نکالتے تھے۔ بعض لوگ جوش میں آکر چھریوں اور زنجیروں سے اپنا سر اور سینہ زخمی کر لیتے تھے۔ اوزیرلیس کا دوسرا تہوار طغیانی آنے پر منایا جاتا تھا۔ اِس سے لوگ سمجھتے کہ دیوتا مر کر پھر زندہ ہو گیا ہے۔ یہ خوشی کا تہوار تھا۔ کئی روز ناچ رنگ کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور جوشِ مسرت میں بے حجابی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔ آئسس کے مندر میں ہر روز ہزاروں دیوداسیاں عصمت فروشی کرتیں تھیں۔ اُن سے ہم کنار ہونا ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اِس کی تہ میں یہ عقیدہ مخفی تھا کہ اِس طرح زمین کی زرخیزی اور توالد میں اضافہ ہوتا ہے۔ آئسس کا سالانہ تہوار بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ فرعون بہ نفسِ نفیس جلوس کی قیادت کرتا تھا۔ یہ تہوار کئی روز تک منایا جاتا تھا اور اِس دوران میں جنسی بے راہ روی کے عجیب و غریب مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ سیس کے مقام پر ایک مقررہ رات کو مکانوں کی منڈیروں پر دیئے روشن کئے جاتے تھے جو ساری رات جلا کرتے تھے۔ اِس تہوار کو "دیوی کی ضیافت" کہتے تھے۔

اہلِ مصر کی روزمرّہ کی زندگی اور اُن کے مشاغل کی جھلکیاں اُن کی تصاویر و نقوش میں دکھائی

دیتی ہیں جن سے کسی بھی معبد اور محل کی دیواریں خالی نہیں ہیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسان فصل بو رہا ہے یا کاٹ رہا ہے، کوئی شخص گدھوں کو ہنکاتا ہوا جا رہا ہے، کہیں کشتی تعمیر کی جا رہی ہے، درختوں کو گرایا جا رہا ہے، تختے بن رہے ہیں، آرے، بسولے اور تیشے سے اُن کی وضع قطع درست کی جا رہی ہے، کہیں غلام بڑے بڑے لگنوں میں پاؤں سے آٹا گوندھ رہے ہیں، اُستاد بچے کو پاس بٹھا کر سبق سُن رہا ہے، سُنار دھونکنی سے آگ سُلگا رہا ہے، تہواروں پر لوگ رنگ برنگ کے کپڑے پہنے دیوانہ وار خوشی سے ناچ رہے ہیں، ڈھول پیٹے جا رہے ہیں، عورتیں لنگ کے مجسّمے اُٹھائے جا رہی ہیں، ناچنے والیاں نیم برہنہ یا مادر زاد برہنہ کولہے مٹکا مٹکا کر اور ہاتھ نچا نچا کر رقص کر رہی ہیں۔ یہ تصویریں نہ صرف مصری فنِ مصوّری کے شگفتہ اور انوکھے نمونے ہیں بلکہ ان میں مصرِ قدیم کی زندگی پوری طرح سامنے آ گئی ہے ۔

قدیم مصریوں کی عظمت اور اولیّت کا اندازہ اِس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنابِ مسیح کی ولادت سے تین ہزار برس پہلے اُن کا تمدّن معراجِ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ اِس سُنہری تمدّن کی اکثر روایات باقی و برقرار ہیں۔ کاشتکاری کے مختلف طریقے، دھاتیں ڈھالنے کا فن، صنعت و حرفت کے شعبے، ہندسہ، علم الحیل، شیشے اور ململ کی ساخت، پُرامن حکومت کا قیام، کاغذ اور روشنائی، تصویر نگاری، تقویم، آبی گھڑی، ملبوسات اور زیورات کی نفاست، گھر کا خوبصورت سامان آرائش، فنِ تعمیر کے کمالات، ڈاک کا انتظام، ابتدائی اور ثانوی تعلیم، نظمِ مملکت کے اصول، شعر و ادب کی ترقی، دانش و خرد کے اقوال، انفرادی و اجتماعی شعور کی بیداری، معاشرتی انصاف، ایک ہی بیوی سے شادی کرنے کا رواج، وحدانیت کی شروعات، فلسفۂ اخلاق، سنگ تراشی، مصوّری، موسیقی، ناچ وغیرہ کی ترقی یہ تمام کارنامے یہودیوں، یونانیوں، ایرانیوں اور رومیوں کے توسط سے تمدّنِ نوعِ انسانی کا قیمتی سرمایہ بن چکے ہیں ۔

کنعان

جس ملک کو کتابِ مقدس میں کنعان کہا گیا ہے اُسے یونانیوں نے فنیقیہ کا نام دیا تھا۔ آج کل اِسے لبنان کہتے ہیں۔ عربی میں لبن دُودھ کو کہتے ہیں۔ اِس کے پہاڑوں کی چوٹیاں سارا سال دودھ جیسی سفید برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ اِس لئے عرب اِسے لبنان کہنے لگے۔ قدیم زمانے میں کنعان شام کا ایک صُوبہ تھا اور بحیرۂ روم کے مشرقی ساحلی میدان پہاڑوں، اور وادیوں پر مشتمل تھا۔ ساحلی میدان کی چوڑائی چار میل سے ایک میل تک ہے۔ اِس کے ساتھ کوہستانی علاقہ ہے جس کی بلندی اڑھائی ہزار فٹ تک ہے۔ اصل کنعان پہاڑی دیوار اور سطح مرتفع کا درمیانی حصہ تھا۔ مغربی سلسلۂ کوہ کے درمیان گہری وادیاں ہیں جو دراصل آبی گذرگاہیں ہیں۔ قادلیشہ کی مقدس وادی میں بلند و بالا دیوداروں کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ اِس کے چند میل جنوب میں نہرِ ابراہیم ہے جس کی وادی بڑے حسین مناظر پیش کرتی ہے۔ یہاں کسی زمانے میں افاکا کا تیرتھ تھا۔ نہرِ ابراہیم کا پانی رومیوں نے شہر بیبلوس تک پہنچایا تھا۔ قدیم زمانے میں نہرِ ابراہیم کا نام ادونس تھا جو عشتار کے عاشق کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سمندر میں گرتے وقت اُس کا رنگ ارغوانی ہو جاتا ہے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان سطح مرتفع ہے جسے البقاع (بقاع جمع ہے بقعہ کی جس کا معنیٰ ہے "کھڑا پانی") کہتے ہیں۔ یہ ایک ہموار میدان ہے جس میں کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ اِسے دو ندیاں سیراب کرتی ہیں جن کے سرچشمے بعلبک کے قریب ہیں۔ ایک ندی کا نام عاصی ہے (اِس کا نام عاصی یا گنہگار اِس لئے رکھا گیا تھا کہ یہ کفار یا

رُومیوں کے علاقے میں بہہ کر جاتی ہے) دوسری ندی قاسمیہ ہے۔ البقاع کنعان کا سب سے زرخیز اور مزروعہ خِطّہ ہے جس کے کھیت ہوائی جہاز سے قالین کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ رُومی اسے "اناج کا گھر" کہتے تھے۔ مشرقی سلسلۂ کوہ حمص کے جنوب میں شروع ہوتا ہے اور بحیرۂ لُوط کے جنوب تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ اس کا ایک گوشہ حرمون کہلاتا ہے جس میں سبز اور بادامی رنگ کے خوبصورت پتھر ملتے ہیں۔ اِس کی ڈھلوانوں پر دروزیوں کے دیہات ہیں۔ مغربی لبنان کی بہ نسبت مشرقی لبنان خُشک اور بنجر ہے اِس کے پہاڑوں سے جو ندیاں نکلتی ہیں وہ شام کی طرف بہتی ہیں اور دمشق کے نواحی علاقے کو سیراب کرتی ہیں۔ دمشق کے شہرۂ آفاق باغات یا غوطۂ دمشق کی شادابی اور سرسبزی کا انحصار اِنہی کے پانی پر ہے۔ لبنان کے قدرتی مناظر نہایت حسین ہیں۔ ایک طرف رنگ برنگ کے پہاڑ ہیں اور دوسری جانب نیلگوں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ شمالی چوٹیوں پر دیودار کے درختوں کے مشہور جھنڈ ہیں جن کا ذکر کتابِ مقدس میں آیا ہے۔ اِن میں سے بعض تین ہزار برس کے پرانے ہیں۔

لبنان کی آب و ہوا بحیرۂ رُوم کی ہے یعنی سرما میں بارش ہوتی ہے اور باقی سال موسم خشک رہتا ہے۔ مغربی ڈھلوانوں پر بارش زیادہ ہوتی ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ ۳۳ اِنچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ موسمِ گرما بھی خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔ بیروت میں انتہائی درجۂ حرارت ۷۹ درجے ہوتا ہے۔ ایک عرب شاعر لبنان کے کوہستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

" اِس نے سرما کو سر پہ اُٹھا رکھا ہے
بہار کو قدموں پر
خزاں اِس کے سینے پہ ہے۔
اور گرما اِس کے پاؤں میں محوِ خواب ہے۔

پہاڑی علاقے میں جا بجا ندیاں بہتی ہیں اور چشمے پھوٹتے ہیں جو پھلوں کے باغات کو سیراب کرتے ہیں۔ صیدان کے سنگترے کے باغات میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ملک میں قسم قسم کے درخت اور پودے ملتے ہیں۔ رنگ برنگ کے خوشبودار پھول کثرت سے کھلتے ہیں۔ کتابِ مقدس میں ہے

"تیرے لباس میں لبنان کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔"

قدرتی اور زرعی پیداوار وہی ہے جو جزیرۂ روم کی آب و ہوا کے خطے سے خاص ہے۔ صنوبر شہتوت، انجیر، زیتون، انگور، سنگترہ اور نارنگی کثرت سے اگائے جاتے ہیں۔ انگور اور زیتون کنعان ہی سے یونان اور دوسرے مغربی ممالک کو جاتے تھے۔ انگور سے اعلیٰ قسم کی معطر شراب کشید کی جاتی تھی۔ اِن کے علاوہ پہاڑوں پر بید، شمشاد، اخروٹ اور چیڑ کے درخت اُگتے ہیں۔ ایک ہزار فٹ کی بلندی پر لبنان کے دو نہایت خوبصورت درخت پائے جاتے ہیں یعنی سرد اور دیودار۔ سطح مرتفع پر گیہوں اور جَو کی کاشت ہوتی ہے۔ سبزیاں ہر کہیں اُگائی جاتی ہیں۔ زیتون لبنان کا خاص درخت ہے۔ اِس کا پھل کھایا جاتا ہے۔ روغن زیتون مکھن کی جگہ کھانا پکانے کے کام آتا ہے۔ اِسے چراغوں میں بھی جلاتے ہیں اور اس کے عطریات اور مرہم بھی بناتے ہیں۔ قدیم زمانے میں زیتون کو مقدس درخت سمجھتے تھے اور تاج پوشی کے وقت بادشاہوں کا مسح زیتون کے تیل سے کرتے تھے۔ مسیحا کا لغوی معنیٰ ہے "مقدس تیل سے مسح کیا گیا" لبنان میں زیتون کے جھنڈ ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ دیوداروں کا سب سے بڑا جھنڈ لبشاری کے پاس ہے۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے لئے اِن کی لکڑی کے تختے منگوائے گئے تھے۔ زبور میں ہے

"خداوند کے درخت شاداب رہتے ہیں
یعنی لبنان کے دیودار جو اس نے لگائے"

زمانہ قدیم کے کنعانی اِن درختوں کی لکڑی سے اپنے مضبوط جہاز بناتے تھے ایک ماہر

آثارِ قدیمہ نے نینوا کے کھنڈروں میں کھدائی کرتے وقت دیودار کا ایک شہتیر نکلوایا تھا۔ اُسے جلایا گیا تو معلوم ہوا کہ اڑھائی ہزار برس گذر جانے کے باوجود اِس کی خوشبو باقی تھی۔

علمائے آثارِ قدیمہ کے خیال میں کنعان میں قدیم پتھر کے زمانے کے انسان بستے تھے۔ اِس کے مختلف مقامات سے پتھروں کے ہتھیار اور اوزار برآمد ہوئے ہیں اور ایک انسانی ڈھانچا بھی مِلا ہے جسے بلین سے پچیس ہزار برس کا پُرانا بتایا جاتا ہے۔ زمانہ ماقبل تاریخ کے پتھر کے کلہاڑے، آگ میں پکائے ہوئے گِلی ظروف، گھونگھوں کی مالائیں دستیاب ہوئی ہیں۔ اِس علاقے میں بحیرۂ روم کی نسل کا انسان بستا تھا۔ ۳۰۰۰ء (ق۔م) کے لگ بھگ تاریخی مآخذ کی شہادت کی رُو سے کنعان اور جنوبی شام میں سامی نسل کے لوگ آباد تھے جنھیں بنی اسرائیل کنعانی اور یونانی فنیقی کہتے تھے۔ اِس وقت اِس علاقے میں سیمریوں کا خطِ میخی اور مصریوں کا ہیروغلیفی دونوں رواج پذیر تھے۔ فراعینِ مصر کے لیے جہاز اور تابوت بنانے کے لئے کنعان سے دیودار کی لکڑی جاتی تھی۔ کنعانی بھی دوسرے سامی قبائل اموریوں، بابلیوں وغیرہ کی طرح ریگستانِ عرب سے نکل کر بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل پر آباد ہوگئے تھے شروع شروع میں سارے شام اور فلسطین پر کنعان کا اطلاق ہوتا تھا چنانچہ عہدِ قدیم میں فلسطین کو کنعان کہا گیا ہے۔ کنعان کے لُغوی معنیٰ ہیں "سرزمینِ ارغواں کے متعلق" یونانی زبان کے لفظ فنیقی کا معنیٰ بھی "ارغوانی سُرخ" ہے گویا لفظ فنیقی لفظ کنعان کا لُغوی ترجمہ ہے۔ یہ اشارہ ہے کپڑوں کو ارغوانی رنگ دینے کی طرف جس کے لئے کنعان شروع سے مشہور تھا۔ سیمریا اور بابل کی طرح کنعان کی سرزمین میں بھی مُتعدد شہری ریاستیں قائم ہوگئی تھیں۔ اِن میں چار ریاستیں تاریخی لحاظ سے بڑی مشہور ہوئیں۔ شمال میں ببلوس (آج کل اِسے جبیل یا چھوٹا پہاڑ کہتے ہیں) اور ارداد اور جنوب میں صیدا (سیڈن) اور صوُر (ٹائر) اِن میں قدیم ترین شہر ببلوس کا ہے جس کے کھنڈر کھدائی سے برآمد کیے گئے ہیں۔ یہ شہر مصریوں کے پپائرس کی تجارت کا مرکز تھا۔ یونانیوں نے پپائرس کی رعایت

سے اس کا نام ببلوس رکھا۔ کتابِ مقدس کا یونانی نام بائبل اسی سے یادگار ہے۔ ببلوس کو روایت کے مطابق خداوند خدا اِل یا ایل نے بسایا تھا اور یہ تمام کنعانیوں کا مقدس تیرتھ تھا۔ اس میں عشتار دیوی کا عظیم الشان مندر ساحل سمندر پر واقع تھا۔ زائرین کئی سیڑھیوں پر سے چڑھ کر مندر کے وسیع و عریض صحن میں داخل ہوتے تھے جہاں دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ اس معبد میں تموز کے تہوار پر بڑی رونق ہوتی تھی۔ نہر ابراہیم اس کے قریب ہی سمندر میں گرتی ہے۔ یہ معبد شاہ ببلوس سنی راس نے تعمیر کرایا تھا اور شہنشاہ قسطنطین کے حکم سے مسمار کر دیا گیا۔ آج کا دارالحکومت بیروت (لغوی معنی کنویں) ببلوس کے بہت بعد بسایا گیا تھا۔ صیدا اور صور مشہور بندرگاہیں تھیں جہاں ایشیا کا مالِ تجارت کنعانی جہازوں میں مغرب کے دور دراز کے ممالک کو پہنچتا تھا۔

کنعان صدیوں تک مصریوں، حتیوں اور اشوریوں کی تاخت و تاراج کی آماج گاہ بنا رہا۔ چودھویں صدی (ق۔م) میں مصری اقتدار کا خاتمہ ہوا تو آرامیوں نے ملک پر قبضہ کر لیا اور اُن کی زبان آرامی پورے شام کی زبان بن گئی چنانچہ جناب عیسیٰ کی مادری زبان بھی آرامی ہی تھی۔ تیرھویں صدی (ق م) کے اواخر میں بحیرہ ایجئین کے آریائی نسل کے لوگ جنھیں فلسطی کہتے تھے کنعان کے ساحلی علاقے پر آباد ہو گئے۔ فلسطین کا نام انھیں سے یادگار ہے۔ یہ لوگ لوہے کے ہتھیار لائے تھے اور ان کی آمد سے لوہے کا استعمال کنعان میں رواج پا گیا۔ آرامیوں اور فلسطیوں کی آمد کے ساتھ ساتھ عبرانیوں نے بھی کنعان کا رُخ کیا۔ عبرانیوں کے جدِ امجد جناب ابراہیم آرامی زبان بولتے تھے۔ کنعان پہنچ کر عبرانیوں نے کنعانی زبان سیکھ لی اور اسی میں اپنے مذہبی صحائف قلم بند کیے۔ عبرانیوں نے اموریوں اور کنعانیوں سے جنگ و جدال کے بعد اپنی مستقل سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جناب داؤد اُن کے پہلے بادشاہ تھے۔ اس طرح کنعان کی وسیع مملکت آرامیوں، فلسطیوں اور عبرانیوں میں تقسیم ہو گئی صرف وہی حصہ برقرار و بحال رہا جسے آج کل لبنان کہتے ہیں۔ مصری اور حتی

طاقت کے زوال پر کنعان کو بھی آزادی مل گئی۔ اِس کے شہروں پر بادشاہوں کی حکومت تھی جو مجلس شوریٰ کے مشورے سے حکومت کرتے تھے۔ اِس طرح بادشاہ کے اختیارات محدود ہو گئے تھے۔ بعد میں شہر صُور کے باشندوں نے جمہوریہ قائم کرلی۔ اور حکومت قُضاۃ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ کنعان کے مختلف شہروں میں تجارتی رقابت تھی اِس ملک میں سیاسی وحدت قائم نہ ہو سکی البتہ جو شہر سیاسی اور تجارتی طاقت حاصل کرلیتا تھا اُسے دوسری ریاستوں پر برتری حاصل ہو جاتی تھی۔ اغاریت، ارداد، صیدا اور صُور کو یکے بعد دیگرے خصوصی امتیاز حاصل ہوا۔ صور کے شہر کو دختر صیدا کہتے تھے۔ کتاب پیدائش میں صیدا کو کنعان کا پہلوٹھا کہا گیا ہے۔ ہومر نے بھی اِس بات کا ذکر کیا ہے کہ صیدا سے کپڑا، تانبہ اور غُلام فروخت کے لئے یونان میں بھیجے جاتے تھے۔ صیدا کی طرح صُور بھی سمندر میں خشکی کی ایک آگے بڑھی ہوئی خاکنائے پر آباد تھا اور اِس کی حفاظت بھی ایک جزیرہ نما چٹان کرتی تھی۔ صُور کا لغوی معنیٰ چٹان ہی کا ہے۔ ایک اور شہر طرابلس[1] تھا جو دراصل تین شہروں سے مل کر بنا تھا ہیروڈوٹس نے صُور میں دیوتا ملکرت کا معبد دیکھا تھا۔ جس میں سونے اور زمرّد کے ستون تھے جو رات کے وقت چمکتے تھے۔ صُور کا بادشاہ حیرام ۹۶۹ - ۹۳۶ (ق۔م) جناب سلیمانؑ کا معاصر تھا۔

کنعانی قدیم زمانے کے عظیم جہاز راں تھے۔ کولمبس سے دو ہزار برس پہلے کنعانی جہاز راں بحیرۂ روم اور جنوب مغربی بندرگاہوں میں تجارت کرتے تھے جہاں اُن کا مال بڑے شوق سے خریدا جاتا تھا۔ کنعانی مشرق بعید کے عطریات اور گرم مسالے، مصر کی عمدہ ململ عرب کی پشم اور خوشبویات، اپنے کاریگروں کے بناتے ہوئے سونے چاندی اور پیتل کے منقش برتن، ہاتھی دانت کے زیورات، مشک، عنبر، مونگا، جواہرات وغیرہ بیچتے تھے۔ کنعان میں خوراک کی کمی تھی اِس لئے اُنہیں سمندری تجارت کا سہارا لینا پڑا۔ اُنہوں نے

---

[1] یونانی لفظ ٹرائی پولس (تین شہر) کی عربی صورت ہے۔

مغربی ساحل پر کیڈز کی بندرگاہ کی بنیاد رکھی ۔ جزائر برطانیہ سے قلعی نکال کر دور دور کے ممالک میں بیچتے تھے ۔ انہوں نے جہاز سازی اور جہاز رانی کے فنون مصریوں سے سیکھے تھے لیکن وہ جلد ہی اپنے استادوں پر سبقت لے گئے ۔ وہ ہسپانیہ کی کانوں سے چاندی کھود کر نکالتے تھے اور آبنائے جبل الطارق کو کئی بار عبور کر چکے تھے ۔ انہوں نے واسکوڈاگاما سے صدیوں پہلے جنوبی افریقہ کا چکر لگایا تھا اور یہ سفر تین سالوں سے مکمل کیا تھا ۔ وہ ہمیشہ قطبی تارے کی مدد سے سفر کرتے تھے ۔ قدیم زمانے میں اسے کنعانیوں کا تارہ کہا جاتا تھا ۔ انہوں نے قبرص[1]، روڈز، کریٹ، مالٹا، صقلیہ، سارڈینیا، ٹیونس اور ہسپانیہ میں تجارتی بستیاں بسائیں جو بڑھتے بڑھتے شہر بن گئیں ۔ ان کی سب سے بڑی اور مشہور نو آبادی کارتھیج تھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ اسے صور کی شہزادی دیدو نے ۸۱۴ (ق م) میں بسایا تھا ۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں کارتھیج کا شہر ایک عظیم سلطنت بن گیا ۔ رومۃ الکبریٰ نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لیے لڑائی چھیڑ دی ۔ کارتھیج کے بطل جلیل حنی بعل (بعل کی عنایت) نے لڑکپن میں اپنے باپ ہیمل کار بارقہ کو دیوتا کے معبد میں کھڑے ہو کر یہ قول دیا تھا

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جوان ہو کر خشکی اور تری میں رومیوں کا پیچھا کروں گا اور فولاد اور آگ سے روم کو تباہ کر دوں گا ۔"

روما اور کارتھیج کی جنگوں کو پیونک لڑائیاں کہا جاتا ہے ۔ پہلی پیونک جنگ کے بعد ہیمل کار نے ہسپانیہ کا رخ کیا اور اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لیتا گیا ۔ ہیمل کار کی موت کے بعد حنی بعل ہسپانیہ کی فوج کا سپہ سالار بن گیا ۔ رومیوں سے انتقام لینے کے لئے اس نے فوج اکٹھی کی اور جنگی ہاتھی لے کر کوہ اولمپس کی طرف کوچ کیا ۔

۱۔ قبرص میں تانبے کی کانیں تھیں ۔ لفظ COPPER اس سے مشتق ہے اسی طرح لفظ CYPRESS بھی اس سے یادگار ہے

قدیم زمانے میں اِس سے زیادہ دلیرانہ مُہم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جب یہ لشکر جبرالٹر کوہ الپس کی چوٹیوں کو عبور کر رہا تھا تو جاڑا شباب پر تھا۔ پہاڑ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اُس کا لشکر طوفانِ برف و باد کی لپیٹ میں آگیا لیکن اُس کے جفاکش سپاہی عمودی سنگلاخ چٹانوں اور خطرناک درّوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ راستے میں سینکڑوں گھوڑے اور جنگ جُو پھسل پھسل کر کھڈوں میں گرے اور فنا کے گھاٹ اتر گئے۔ رُومیوں نے آگے بڑھ کر مقابلہ کیا۔ حنی بعل فنِ حرب کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اُس نے اپنے سے کئی گُنا لشکر کو دریائے تربیا اور جھیل تراسی مین کی خُون آشام جنگوں میں شکست دی۔ ۲۱۶ء (ق م) میں ایک زبردست رُومی لشکر کناّے کے میدان میں حنی بعل کے سامنے صف آرا ہوا حنی بعل نے جنگی فراست سے کام لے کر رُومیوں کو آہنی گھیرے میں لے لیا اور اُسے کُچل کر رکھ دیا۔ ساٹھ ہزار رُومی سالار اور سپاہی کھیت رہے۔ مقتول سرداروں نے اپنی اُنگلیوں میں جو نگینے پہنے ہوئے تھے۔ حنی بعل نے انہیں ایک بڑے تھیلے میں بند کرا کر اُسے کارتھیج بھجوا دیا۔ حنی بعل پندرہ سال تک رُومیوں کو شکست پر شکست دیتا رہا۔ رُومی اِس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ اُن کی عورتیں اپنے دیوتاؤں کے معبدوں کے فرش کو اپنے بالوں سے صاف کر کے اُن سے دعائیں مانگتی تھیں۔ جن رُومی عورتوں کے شوہر اور بیٹے میدانِ جنگ میں کام آئے وہ اجنبیوں اور غلاموں سے ہم کنار ہوتی تھیں تاکہ اُن کی نسل کو برقرار رکھ سکیں۔ حنی بعل کو کمک نہ پہنچ سکی اور رُومیوں نے اُس کی توجہ ہٹانے کیلئے کارتھیج پر حملہ کر دیا۔ حنی بعل کو واپس جانا پڑا۔ کارتھیج کے محاصرے میں رُومیوں کی فتح ہوئی۔ حنی بعل نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ کارتھیج میں خوفناک قتلِ عام کیا گیا۔ اڑھائی لاکھ کی آبادی میں صرف پچاس ہزار آدمی جانبر ہوئے۔ اُنہیں غلام بنا کر بیچ دیا گیا۔ شہر کو آگ لگا دی گئی اور کھنڈروں پر ہل چلوا کر فصل کاشت کرا دی گئی۔ بحیرۂ رُوم کو کسی زمانے میں کنعانیوں کی جھیل کہا جاتا تھا اور کارتھیج والے کہا کرتے تھے کہ رُومی بحیرۂ رُوم میں ہاتھ

دھونے کی بھی جرأت نہیں رکھتے۔ اِس فتح کے بعد رُومیوں کا تسلط بحیرۂ روم پر قائم ہو گیا۔
کنعانی بڑے صناع تھے۔ وہ دھات اور شیشے کے آلات نہایت نفیس بناتے تھے اور صدفِ ماہی سے ارغوانی رنگ حاصل کرتے تھے۔ اُن کے رنگے ہوئے ارغوانی کپڑے بیش قیمت سمجھے جاتے تھے۔ ہیلن اور قلوپطرہ بڑے شوق سے ارغوانی کپڑے پہنتی تھیں۔ صیدا شیشہ سازی کا مرکز تھا اور صُور ارغوان کے لیے مشہور تھا۔ یونانی صناعوں نے کنعانیوں ہی سے دھات اور ہاتھی دانت کے کام سیکھے تھے۔ ارغوان کے ساتھ قرمز کی ساخت بھی کنعانیوں سے یادگار ہے۔ کنعانیوں نے قرمز کا رنگ شاہ بلوط کے درخت سے نکالا تھا اور اس میں رنگے ہوئے کپڑے گراں قیمت پر بیچا کرتے تھے۔ کنعانی فنِ تعمیر کے ماہر تھے۔ جنابِ سلیمانؑ نے اپنے ہیکل کی تعمیر کے لیے صُور اور صیدا سے معمار بلوائے تھے۔ ہیکل (لغوی معنیٰ "بڑا گھر"۔ عربی میں یہ لفظ معبد کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے) کا نقشہ بھی بعل دیوتا کے معبد کا چربہ تھا۔ کنعانیوں کے ہاں موسیقی جزوِ عبادت تھی۔ اُن کے آلاتِ موسیقی بحیرۂ رُوم کے اکثر ممالک میں رائج تھے۔ یونانیوں نے موسیقی کا فن کنعانیوں ہی سے سیکھا تھا۔ ہیکل سلیمانی کے سازندے اور خوانندے کنعانی ہی تھے۔ یہودیوں نے زبور کی دُھنیں کنعانیوں سے مستعار لی تھیں۔
اِشوریا کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کنعان کے لیے خطرہ بن گئی۔ شاہ اِسرحدون نے صیدا کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ دُوسرے شہریوں نے اِشوریوں کی اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے پر آمادہ ہو گئے۔ اشوریوں کے بعد کلدانی شاہ بنوکدنفر نے مصر اور کنعان پر فاتحانہ یلغار کی۔ صُور والوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ شاہی فوج تیرہ برس تک محاصرہ کئے پڑی رہی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ آخر جانبین میں صُلح ہو گئی اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ کنعانیوں نے اشوریا اور بابل سے بہت کچھ سیکھا۔ بابل کا علم ہیئت، اوزان اور پیمانے کنعانیوں کے واسطے ہی سے مغربی ممالک میں رائج ہوئے تھے۔

کلدانیوں کے زوال پر ایرانیوں کا غلبہ ہو گیا۔ کنعانیوں نے خشیارشیا شہنشاہِ ایران کے لئے ہیلس پانٹ پر پُل تعمیر کیا جس پر سے اُس کا لشکر گذر کر یونان پر حملہ آور ہوا تھا۔ سکندرِ اعظم نے ایشیا کی طرف اقدام کرتے ہوئے پہلے کنعانی شہروں صُور اور غزہ پر حملہ کیا۔ صُور والوں نے سخت مزاحمت کی۔ سات ماہ کے محاصرے کے بعد صُور فتح ہو گیا تو سکندر نے تمام باشندوں کا قتلِ عام کرایا۔ یُونانیوں کے بعد شام اور کنعان پر رُومیوں کا تسلّط ہوا۔ ۶۴ ء (ق م) میں رُومیوں کے سردار پومپی نے کنعان پر قبضہ کر لیا۔ ہسپانیہ، شمالی افریقہ اور قبرص کی کنعانی بستیوں کو رُومیوں نے فتح کر لیا اور کنعانی عظمت کا خاتمہ ہو گیا۔

دُوسری سامی اقوام کی طرح کنعانی بھی مظاہرِ فطرت کی پوجا دیوتاؤں کی صُورت میں کرتے تھے۔ سب سے بڑے معبود دو تھے، آسمان کا دیوتا جسے وہ اپنا باپ سمجھتے تھے اور دھرتی مائی۔ آسمان دیوتا مینہ برسا کر زمین کو زرخیزی عطا کرتا تھا اور دھرتی مائی کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں۔ شہر اغاریت میں آسمان دیوتا کو ایل کہتے تھے جسے شام کے پروہت خداوند خُدا مانتے تھے۔ دھرتی مائی کا نام اشیرت تھا۔ ایل کے بعد علیان کا مقام تھا جس نے بعد میں بعل کی حیثیت اختیار کر لی۔ بعل شہروں کا محافظ اور دریاؤں کا نگران تھا۔ کنعان کے ہر شہر کا بعل علاحدہ تھا۔ بعل کو بادشاہ کا جدِّ امجد سمجھتے تھے۔ وہ زمین کی زرخیزی کا محافظ بھی تھا۔ بعلبک جو بعل کی پُوجا کا سب سے بڑا مرکز تھا شروع میں ارامیوں کے دیوتا حدد (گرج چمک کا دیوتا) کا معبد تھا۔ مرورِ زمانہ سے بعل خداوند خدا بن گیا۔ کنعانی ستونوں، چٹانوں اور مخروطی پتھروں کو دیوتاؤں کے نشان سمجھ کر اُنہیں مُقدّس مانتے تھے۔ عشتارت بارآوری اور توالد و تناسل کی دیوی تھی۔ بعض شہروں میں اسے حُسن و عشق اور چاند کی دیوی بھی سمجھا جاتا تھا ۔ اس کے القاب لبعلہ اور ملکہ تھے۔ دیوتاؤں میں ملکرت (لغوی معنی شاہِ شہر) بھی نمایاں ہے یہ شہر صُور کا معبود تھا۔ عہد نامہ قدیم میں ملکرت کو مولک کہا گیا ہے۔ مولک نہایت خوفناک دیوتا تھا۔ اُس کا بُت دھات کا

بناتے تھے۔ اُس کے نیچے آگ جلاتے تھے جس کے شُعلے اُس کے شکم میں بھڑکتے رہتے تھے۔ اُس کی ہتھیلیوں پر ننھے بچوں کو رکھ دیتے اور وہ پھسل کر آگ کے شعلوں میں جا گرتے تھے۔ پہلوٹھی کے بیٹے کی قُربانی دی جاتی تھی۔ مائیں اپنی آنکھوں سے اپنے ننھے بیٹوں کو شعلوں میں بھسم ہوتے ہوئے دیکھا کرتیں لیکن اُف نہیں کر سکتی تھیں۔ بچوں کی چیخوں کو دبانے کے لئے زور زور سے نقارے پیٹے جاتے تھے اور نفیریاں بجائی جاتی تھیں۔ بعض تقریبات پر ایک ایک دن میں سَو سَو بچے آگ میں پھینکے جاتے تھے۔ کارتھیج والوں نے رُومیوں کے محاصرے کے ایّام میں اُمرا کے سینکڑوں بچے مولک پر قُربان کر کے اُس سے استمداد کی تھی۔ بعض اوقات پہلوٹھی کے بیٹوں کو دفن کر دیتے تھے۔ ببلوس کے کھنڈروں سے ایسے مرتبان ملے ہیں جن میں بچے دفن کیے جاتے تھے۔ دوسرے دیوتاؤں میں اشمون، رشفَ اور دجون قابلِ ذکر ہیں۔ اشمون شفا کا دیوتا تھا۔ اُس کا نشان یہ تھا کہ ایک عصا کے سرے پر دو سانپ کنڈلی مارے ہوئے دکھاتے تھے۔ ہمارے ہاں طب کا یہ نشان اِسی دیوتا سے یادگار ہے۔ دجون کا مندر راغاریت کی کھدائی سے برآمد ہوا ہے۔ یہ غلّہ کا دیوتا تھا جو کسی زمانے میں فلسطیوں کا معبود تھا۔

کنعانیوں کے یہاں قُربانی کو بڑا اہم سمجھا جاتا تھا۔ بھیڑ بکریاں گائے بیلوں کے پہلوٹھوں کے ساتھ زمین کی پیداوار کی پہلی فصل بھی سوختنی قُربانی کے لبطور بھینٹ چڑھاتے تھے۔ قربانیاں عام طور سے چٹانوں پر کی جاتی تھیں۔ قُربانی کی یہ رسمیں بعد میں اسرائیلی مذہب میں رواج پا گئیں۔

کنعانی مذہب کی بنیاد نشوونما اور توالد و تناسل کی قوتوں کی پُوجا پر تھی۔ وہ مُقدس کھمبوں اور ستونوں کو لِنگ کی علامت سمجھ کر پُوجتے تھے۔ زرخیزی کا یہ مت قدیم سمیریا، بابل اور مصر سے لیا گیا تھا۔ اِس مت کا مشہور قصہ تموز اور عشتار کے معاشقے کا ہے۔ کنعانی سُمیریوں کے تموز کو آذون (لغوی معنیٰ آقا، مالک) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اکادی زبان میں اِسے دموزی (لغوی معنیٰ ہے "وفادار بیٹا") کہا جاتا تھا۔ یونانیوں نے لقب کو

نام سمجھ کر اسے ادونس کہنا شروع کیا۔ اس کا مسلک پانچویں صدی (ق م) میں تمام یونان میں پھیل گیا۔ عشتار کی جگہ افرودائتی دیوی نے لے لی۔ کنعانی قصہ یہ تھا کہ حسن و عشق کی دیوی عشتار ایک جوان رعنا تموز پر فریفتہ ہو گئی۔ اُس نے اپنا آسمانی مسکن چھوڑ دیا اور تموز کے ساتھ وادیوں اور جنگلوں میں جہاں وہ شکار کھیلتا تھا گھومنے پھرنے لگی۔ ایک دن تموز کو ایک جنگلی سؤر نے سخت زخمی کر دیا اور تموز نے عشتار کی گود میں سر رکھ کر جان دے دی۔ عشتار غم سے بے حال ہو گئی اور گریہ و زاری سے جنگل سر پر اٹھا لیا۔ موت کے بعد تموز زیر زمین دوزخ مملکت کو چلا گیا۔ عشتار اُس کی تلاش میں حیران و سرگرداں وہاں جا پہنچی اور بہ ہزار دقت اُسے واپس لے آئی۔ جس جگہ تموز کا خون گرا تھا وہاں لالہ کے پھول اُگ آئے۔ عربی زبان میں تموز کا لقب نعمان (لغوی معنی 'پیارا') تھا۔ اس لئے لالہ کے پھول کو عربی میں شقائق النعمان یعنی نعمان کے زخم کہتے ہیں۔ انگریزی میں گلِ لالہ کے لیے ANEMONE کا لفظ ہے جو النعمان ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ تموز کی موت اور اُس کے دوبارہ زندہ ہونے کا واقعہ فطرت ہر برس دُہراتی ہے جب تموز جو نشو و نما کی علامت ہے زیر زمین چلا جاتا ہے تو اس کے ساتھ زمین کی شادابی اور زرخیزی بھی رخصت ہو جاتی ہے اور خزاں کا دور دورہ ہو جاتا ہے جب عشتار اُسے اپنے ہمراہ واپس اسی دُنیا میں لے آتی ہے تو بہار کا موسم آ جاتا ہے۔ چاروں طرف پھول کھلتے ہیں اور کلیاں چٹکتی ہیں۔ تموز کی موت اور بازیافت کے یہ واقعات تہوار کی صورت میں منائے جاتے تھے۔ خزاں میں تموز کی موت پر عورتیں نوحہ خوانی اور سینہ زنی کرتی ہوئی ماتمی جلوس نکالتی تھیں تموز کا پتلا بنا کر اور اُسے ریشمی لباس پہنا کر اٹھا لیتیں اور کوچہ و بازار میں گشت کرتی تھیں۔ اس جلوس میں بڑے درد ناک مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ عورتیں اس زور سے ماتم کرتیں کہ در و دیوار لرز اُٹھتے تھے۔ تموز کی بازیافت کا تہوار بہار میں مناتے تھے۔ یہ خوشی کا جشن ہوتا جو سات دن جاری رہتا تھا۔ جوشِ مسرت سے از خود رفتہ ہو کر عورتیں بلا تکلف اجنبیوں سے ہم کنار ہوتی تھیں۔ ملٹن نے کہا ہے۔

"اِن کے بعد تموز آرہا تھا جس کے لبنان میں زخمی ہونے کی یاد میں شامی دوشیزائیں گریہ و ماتم کرتیں اِس کے ساتھ محبت کے پُرجوش گیت گائے جاتے۔ یہ سب کچھ موسم گرما میں ایک خاص روز ہوتا تھا۔ ادونس اپنے پہاڑی مسکن سے ارغوانی رنگ میں سمندر کی طرف دوڑتا ہوا خیال کیا جاتا تھا۔

اِس روایت سے اشارہ یہ ہے کہ نہر ابراہیم۔۔ قدیم زمانے میں اسے دریائے ادونس کہتے تھے۔۔ کا رنگ موسم خزاں میں سُرخ ہو جاتا ہے۔ موسم بہار میں بعلبک کے شہر میں عشتار کا تہوار بڑی عقیدت سے منایا جاتا تھا۔ اِس میں عورتیں عشتار کے مقتول عاشق تموز کی یاد میں ماتمی جلوس نکالتی تھیں۔ دیوی کے ہیجڑے پجاری نفیریوں کے بے پناہ شور اور ڈھولوں کی ہنگامہ پرور دُھم دھم سے وارفتہ ہو کر چھریوں اور زنجیروں سے اپنے آپ کو گھائل کر لیتے تھے بعض تماشائی اِس منظر سے جوش میں آجاتے اور بے اختیار اپنے آلات تناسل قطع کر کے دیوی کی بھینٹ چڑھاتے تھے شام کے وقت تموز کے دوبارہ زندہ ہونے کی بشارت دی جاتی اور پروہت سرگوشی میں کہتے پھرتے "تم بھی قبر میں دوبارہ جی اُٹھو گے۔"

فریگیا میں اتیس کی پُوجا تموز کے رنگ میں کرتے تھے۔ اتیس دیوی سبیلی کا عاشق تھا۔ وہ عین عالم شباب میں شکار کھیلتا ہوا ایک خنزیر سے زخم کھا کر مارا گیا۔ اتیس کے پجاری جنھیں گلائی کہتے تھے۔ اتیس کا ماتم کرتے ہوئے چھریوں سے اپنے آپ پر گھاؤ لگاتے تھے۔ حزقیل نبی نے ایک دفعہ اسرائیلی عورتوں کو تموز کا ماتم کرتے ہوئے دیکھا تھا اور سخت تعجب کا اظہار کیا تھا۔ فریزر نے اِس دیومالائی قصّے کو جناب عیسیٰ کی معجزانہ پیدائش اور احیاء پر منطبق کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے [۱]

"بحیرۂ رُوم کے مشرقی ساحل پر جو ممالک واقع ہیں۔ اُن میں تموز، اتیس،

---

[۱] THE GOLDEN BOUGH.

اور ادونس کی پوجا ہوتی تھی۔ یہ دیوتا زرعی نشو و نما کی قوت کے علامتی مظاہر تھے۔
ہر سال خزاں اور بہار میں اِن کا تہوار منایا جاتا تھا جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ
خزاں میں زمین کی قوتِ نمو زوال پذیر ہو جاتی ہے اور بہار کے موسم میں از سرِ نو
اس کا اِحیا ہوتا ہے چنانچہ خزاں میں ادونس کی موت کا تہوار مناتے تھے بہار میں
اِس کے دوبارہ زندہ ہو جانے کا جشن منایا جاتا تھا۔ اِس دیوتا کا اصل نام
تموز تھا جو بابل اور شام کی سامی اقوام کا دیوتا تھا۔ ادونائی کا معنٰی سامی زبان
میں ہے "میرے آقا"۔ یہ اِس کا اصل نام نہیں تھا۔ یونانی اِس کے لقب کو اصل
نام قرار دے کر اسے ادونس کہنے لگے۔ بابل کی مذہبی تحریروں میں تموز جنسی افزائش،
زرخیزی اور بار آوری کی دیوی عِشتار کا عاشق تھا۔ ہر سال خزاں میں تموز کی موت
واقع ہوتی اور اُس کی محبوبہ عِشتار اُس کی تلاش میں زمین دوز مملکت کو جاتی
اور اپنے محبوب تموز کو لے کر موسم بہار میں لوٹ آتی جب چاروں طرف پھول کھلنے لگتے
اور کلیاں چٹکنے لگتیں۔ تموز کی موت کے تہوار پر عورتیں نہایت دردناک نوحے
پڑھتی تھیں جو بابل کی ادبیات کی اہم صنف تھے۔ یونانیوں کے ادونس کے تہوار
میں یہ رسوم باقی رہیں۔"

کنعانیوں کے بار آوری کے رُت کا ایک پہلو مقدس عصمت فروشی کا بھی تھا۔ وہ عملِ کاشتکاری اور جنسی فعل کو ایک ہی نوع کا خیال
کرتے تھے کنعان کے شہروں میں جہاں کہیں عِشتار کے معبد تھے وہاں دیو داسیاں اجنبیوں
سے بلا تکلف جنسی مِلاپ کرتی تھیں۔ ببلوس کے معبد میں ہر کنواری کو اپنے سر کے پہلے بال
کٹوا کر دیوی کی نذر کرنا پڑتے تھے۔ جو لڑکی اپنے بال بھینٹ نہ کرتی اس کے لئے ضروری تھا
کہ وہ معبد میں جا کر کسی نہ کسی اجنبی سے جنسی مِلاپ کرے۔ عِشتار کے معبد میں سینکڑوں
دیو داسیاں ہار سنگھار کر کے مسافروں اور زائرین کے لیے چشم براہ بیٹھتی تھیں۔ بعض
شہروں میں یہ رواج تھا کہ ہر دُلہن سُسرال جانے سے پہلے سات روز تک عِشتار کے معبد

میں پروہتوں اور زائرین کے تصرّف میں آتی تھی۔ رؤسا اپنی بیٹیوں کو دیوداسیاں بنا کر دیوی کی نذر کرتے تھے۔ شہر پافوس (قبرص) میں بادشاہ سنی راس کی بیٹیاں معبد میں کھلّم کھُلّا عصمت فروشی کرتی تھیں۔ اِس شہر کے بادشاہ دیوداسیوں کے ساتھ خلوت میں جانے کو مذہباً فرض سمجھتے تھے۔ دیوی عشتار کے سالانہ تہوار میں جو موسم بہار میں منایا جاتا تھا مخلوط ناچوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اِن میں سیکڑوں عورتیں مرد شراب کے نشے میں مست و بیخود ہو کر نفیریوں کی آواز اور ڈھول کی تال پر دیوانہ وار ناچتے اور حالتِ وارفتگی میں بے محابا اختلاط کرتے تھے۔ بعض معبدوں میں سادہ عذار، خوش گِل امرد رہتے تھے جو کنعانیوں کے سدومی ذوق کی پرورش کرتے تھے۔ گمورہ (عرب اِسے عامرہ یا آباد کہتے تھے) سدوم اور کارنمیح میں ہم جنسی محبت کا رواج عام تھا اور اسے لازمۂ مردانگی سمجھا جاتا تھا۔ لفظ سدومیت[1] شہر سدوم ہی سے یادگار ہے۔ مورخین کے خیال میں یہ جنسی میلان جزیرہ کریٹ سے یونان اور کنعان میں پھیلا تھا۔

کنعانیوں نے الفبا[2] ایجاد کر کے نوعِ انسان پر احسانِ عظیم کیا۔ کنعانی سمیریوں کے رسمِ تحریر سے واقف تھے لیکن سُمیری حروف لکھنا ایک تو مشکل تھا دوسرے اِس میں بڑا وقت لگتا تھا۔ کنعانی تاجر لوگ تھے، فضولیات میں اپنا وقت گنوانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اِن سے بھلا یہ توقع کہاں ہو سکتی تھی کہ وہ تین صفحے لکھنے کی خاطر کئی گھنٹے صرف کر دیں چنانچہ انہوں نے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا جو پرانے رسم الخط سے بہتر تھا۔ انہوں نے کچھ تصویری علامتیں مصریوں سے لیں، کچھ میخی شکلیں سمیریوں سے اڑائیں، انہیں مختصر کیا، حروف کی خوبصورتی سے صرفِ نظر کر کے اُن میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ آدمی اُنہیں جلدی ضبطِ تحریر میں لا سکے اِس طرح کئی ہزار تصویری علامتوں اور شکلوں کو کاٹ چھانٹ کر کُل بائیس حروف کی ایک ابجد

---

[1] SODOMY [2] ALPHABET

بنائی۔ شدہ شدہ یہ ابجد بحیرۂ ایجین کو عبور کر کے یونان پہنچی۔ یونانیوں نے چند حروف اپنی طرف سے بڑھائے اور نئی ابجد کو ساتھ لے کر اطالیہ پہنچے۔ وہاں رومیوں نے اس میں کچھ ردّوبدل کیا اور یہ ابجد مغربی یورپ کے وحشی قبائل کو سکھائی جو انگریزوں، فرانسیسیوں اور جرمنوں کے آباء واجداد تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی کی کتابیں مصریوں کے ہیروغلیف یا سمیریوں کے میخی حروف کے بجائے کنعانیوں کی ایجاد کردہ ابجد میں لکھی جاتی ہیں۔ عربوں نے کنعانی ابجد میں چھ حروف ث، ذ، ظ، ض، خ، غ کا اضافہ کیا۔ کنعانی دائیں سے بائیں کو لکھتے تھے۔ عربوں نے یہی طریقہ اختیار کیا لیکن آریائی اقوام یونانی، رومی اور ہندو بائیں سے دائیں لکھنے لگے۔ بائیں سے دائیں طرف لکھنے کا رواج اُس وقت ہوا جب قلم اور روشنائی سے کام لینے لگے۔ کنعانی ابجد مشرق و مغرب کے اکثر ممالک میں رواج پا گئی چنانچہ عبرانی، ارامی، عربی، یونانی، لاطینی، سنسکرت، انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی وغیرہ میں کنعانی حروفِ ابجد ہی مستعمل ہیں۔ یونانیوں کے الفا، بیٹا، گاما وہی ہیں جو عربوں کے ا۔ب اور ج ہیں۔ ابتداء میں الف بیل کی ب بیت (گھر) کی اور ج جمل (اونٹ) کی علامتیں تھیں۔ ہاتھ کو ید کہتے تھے اس کے لئے ی مقرر کی گئی، پانی کو میم یا مم کہتے تھے، اس کے لئے م استعمال ہوئی۔ سر کے لیے کنعانی ریش کا لفظ بولتے تھے اس کی جگہ ر کی علامت رکھی گئی۔

کنعانیوں کے مذہبی رسوم، ادبیات، موسیقی اور شاعری نے بنی اسرائیل کے مذہب اور ادبیات و فنون پر گہرے اثرات ثبت کئے جن کا ذکر کرتے ہوئے فلپ حتی جو کنعانی الاصل ہیں لکھتے ہیں

" واضح رہے کہ عبرانی یعنی یہودی بدویوں کی حیثیت میں کنعان میں وارد ہوئے۔ آبادکاری کے ابتدائی دور میں ان کے سامنے مقامی باشندوں کے سوا بود و ماند کا کوئی نمونہ نہ تھا جس کی پیروی وہ کرتے۔ انہوں نے زبان اور ابجد کنعانیوں سے لی، پھر انہوں نے ہمسایوں سے فنِ تحریر سیکھا۔ اس کے بعد خود اپنے ادبیات تخلیق کرنے کے اہل ہوئے۔ یہودیوں

نے جو ابتدائی دنیوی قوانین بنائے وہ کنعانی الاصل ہیں ۔ کنعانیوں ہی سے یہودیوں نے زراعت سیکھی اور تمدنی زندگی کی دوسری ضروریات سے آگاہی حاصل کی ۔ کھیتی باڑی اور باہم شادی بیاہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کنعانیوں نے اپنے وہ مذہبی طریقے یہودیوں تک پہنچائے جو بارآوری اور فصلوں کی افزائش کے لئے اُن کے ہاں رائج تھے ۔ اِس طرح پُرانی ریتیں ، رسمیں اور اِدارے یہودیوں نے اختیار کر لئے ۔ ان میں لکڑی کے کھمبے اور "اونچے مقامات" بھی شامل تھے ۔ بعل اور یہوواہ کے درمیان سخت کش مکش شروع ہو گئی اور ایک مدت تک جاری رہی ۔ بے شک یہوواہ کو خدائے عزّوجلّ مان لیا گیا مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ اِن مقامی دیوتاؤں کو ترک کر دیا گیا جنھیں زمین کی پیداوار کے ناظم و نگران سمجھا جاتا تھا ۔ بعض اوقات یہودیوں کے معبود سے وہی صفات منسوب کر دی جاتی تھیں جو بعل سے خاص تھیں مثلاً آسمانوں کا خدا ، بارش بھیجنے والا اور طوفان کو قبضے میں رکھنے والا ۔ یہودی والدین اپنے پہلوٹھے کا نام یہوواہ کے نام پر رکھتے تھے لیکن دوسرے بیٹوں کے نام کے ساتھ بعل کا نام شامل کر لیا جاتا تھا......

جو سامی گروہ ہلالِ زرخیز میں آباد تھے اُن کا عام عقیدہ یہ تھا کہ عبادت کا صحیح طریقہ جانوروں کی قربانی ہے یا زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں میں سے تحائف مقدس میں پہنچانا ۔ حضرت سلیمانؑ کا ہیکل بھی کنعانیوں کا تجویز کردہ نہ تھا بلکہ اس میں عبادت کے مراسم کا ایک عنصر بھی اُنھیں نے مقرر کیا تھا ۔ اِس میں عبادت کے جو گیت گائے جاتے تھے یا ان کے لئے جو لَے اختیار کی جاتی تھی وہ کنعانیوں ہی سے ماخوذ تھے ......"

یہودیوں کے مذہب کے علاوہ کنعانیوں نے اُن کی لسانیات اور ادبیات کو بھی متاثر کیا ۔ یہودیوں نے مذہبی ریتوں اور رسموں کے ساتھ گیت اور نظمیں بھی کنعانیوں سے مستعار لی تھیں ۔ اُن کے اسالیب بیان اور تشبیہ و تمثیل کا ماخذ بھی یہی ہے ۔ غزل الغزلات ، زبور اور امثال میں ان کے آثار بطورِ خاص موجود ہیں ۔ ادبیاتِ اغاریت[1] میں بادلوں کا

---

[1] کنعان کا مشہور شہر تھا ۔ ۱۹۲۹ء میں ایک فرانسیسی عالم شیفر نے اِس کے کھنڈر برآمد کئے ۔ اِس کھدائی سے جو ادبی تحریریں ملیں اُن میں اور صحیفۂ ایوبؑ میں اسلوبِ بیان کی مشابہت نمایاں ہے ۔

سوار بعل کی ایک صفت ہے۔ یہودیوں نے یہی صفت یہوآہ کے لئے اختیار کی (زبور ۶۸ آیت ۴)۔ اُغاریت کی ایک تحریر میں بجلی کی کڑک کو بعل کی صدا قرار دیا گیا ہے۔ اِس زبور نیز زبور ۱۸، ۸۸، ۸۹، نیز سموئیل "۲" باب ۲۲ میں کنعانیت کی خاص شہادتیں موجود ہیں۔ آخری دو زبوروں کے عنوان میں کنعانی لوگوں کے نام درج ہیں۔ صحیفۂ ایوب (۳۷: ۲ - ۵) اور زبور (۲۹: ۳ - ۵) میں بجلی کی کڑک کو خدا کی آواز کہا گیا ہے۔ زبور ۲۹ پورے کا پورا کنعانی الاصل ہے یعنی بعل کے لئے جو گیت تھا اس میں ترمیم کر لی گئی.....

علاوہ بریں کنعانی ادبیات کے ذریعے سے مصر کے ادبی نمونے اور نصیحت آمیز تحریریں منتقل ہوئیں۔ امثال میں بہت سی چیزیں مصری الاصل ہیں.... خود مصری ادب میں ۱۳ ویں صدی (ق۔م) میں پانسو سال تک اجنبی الفاظ کی بھرمار رہی خصوصاً کنعانی الفاظ کی.... عبادت سے پیشتر وضو کا طریقہ جو اسلام اور یہودیت میں لازم سمجھا جاتا ہے کنعانی بھی اسی سے واقف تھے۔" [1]

فنِ تعمیر، شاعری، موسیقی وغیرہ کے علاوہ کنعانی سنگ تراشی کے بھی ماہر تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ پگ ملیان قبرص کا ایک کنعانی بادشاہ تھا۔ اُس نے حُسن کی دیوی کا ایک مجسّمہ تراشا۔ وہ اس قدر حسین تھا کہ پگ ملیان اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ اُس نے دیوتاؤں کے حضور دعا مانگی کہ اسے زندگی بخش دی جائے۔ دعا قبول ہوئی، مجسّمہ زندہ ہو گیا اور پگ ملیان نے اُس سے نکاح کر لیا۔ کنعانیوں کو فلسفے سے بھی شغف تھا۔ رواقیت کا بانی زینو (۳۳۳-۲۶۱ ق م) قبرص کا ایک کنعانی تھا۔ رواقیت نے روم میں ہمہ گیر مقبولیت پائی۔ مارکس آریلیس، ایپکٹیٹس

---

[1] تاریخ لبنان۔

اور سینیکا مشہور رواقی فلسفی ہو گزرے ہیں ۔ فلاطینوس کے شاگردوں میں فرفوریوس (اصل نام 'ملک' تھا) کو بڑی شہرت نصیب ہوئی ۔ یہ کنعانی تھا ۔ اُس کا شاگرد یمبلیقوس بھی کنعانی تھا ۔ ان فلاسفہ نے نو اشراقیت کی اشاعت میں نمایاں حصہ لیا تھا ۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ان کے نو اشراقی افکار سے مسلمان فلسفی بھی متاثر ہوئے تھے ۔

کنعانیوں نے تمدنِ نوعِ انسانی میں قابلِ قدر اضافے کئے ۔ اُن کا سب سے بیش قیمت تحفہ حروفِ ابجد کو سمجھا جا سکتا ہے جس نے فنِ تحریر میں انقلاب برپا کر دیا ۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے فنِ جہاز سازی اور جہاز رانی کو ترقی دی جس سے طویل بحری سفروں میں آسانی ہو گئی ۔ کنعانی قدیم زمانے کے بڑے مہم جُو اور خطر پسند جہاز راں تھے ۔ اُنھوں نے بین الاقوامی تجارت کو فروغ بخشا ۔ چین ، ہند ، بابل ، مصر وغیرہ ممالک کی مصنوعات اُن کے وسیلے سے مغربی ممالک کو پہنچنے لگیں ۔ اُنھیں کے واسطے سے اہلِ مغرب کی وحشی اقوام مشرق کے درخشاں تمدن اور علوم و فنون سے آشنا ہوئیں ۔ اُن کے مذہب نے بنی اسرائیل کے شعائر اور رسومِ عبادت پر گہرے اثرات ثبت کئے جو یہودیت کے توسط سے عیسائیت اور اسلام پر بھی اثر انداز ہوئے ۔ بحری سفروں میں نقشوں کا استعمال اور طول بلد عرضِ بلد کی دریافت اور جہاز رانی میں اِن کا استعمال بھی فنیقیوں کی اوّلیات میں سے ہے ۔ اُنہوں نے دس کے ہندسے کی بجائے بارہ کے ہندسے کو حساب کتاب میں مرکزی حیثیت دی ۔ فُٹ کی ۱۲ انچیں اور شلنگ کے بارہ پنس اُنھیں کے حساب سے ہم تک پہنچے ہیں ۔ برِ اعظم یورپ کا نام اُن کی ایک شہزادی یوروپا کے نام پر رکھا گیا تھا ۔ PHONETICS کا لفظ PHOENICIAN ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے اور اُن کی لسانی دین کی نشان دہی کرتی ہے ۔ تمام سامی رسوم الخط کنعانی یا فونیقی رسم الخط ہی سے نکلے ہیں ۔ استاذ احمد حسن زیات[1] لکھتے ہیں کہ آرامی رسم الخط فونیقی رسم الخط سے ماخوذ ہے ۔ آرامی رسم الخط سے حوران

---

[1] تاریخ ادبیاتِ عربی

بن خطِ نبطی اور عراق میں سطرنجیلی سریانی خط نکلا ، اور یہی دو رُسوم الخط عربی رسم الخط کی اصل ہیں ۔ اوّل الذکر سے خطِ نسخ پیدا ہوا اور ثانی الذکر سے خطِ کوفی نکلا جو اسلام سے قبل حیری کہلاتا تھا ۔ اوّل الذکر رسم الخط عربوں نے انبار سے سیکھا تھا ۔

مندرجہ بالا حقائق سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی قوم سے ہمیں کتنی عظیم روایات ورثے میں ملی ہیں ۔

بنی اسرائیل

تاریخ بنی اسرائیل کو شروع شروع میں عبرانی کہتے تھے۔ لفظ عبرانی کا مادہ عبر ہے جس کا معنیٰ ہے عبور کرنا۔ جناب ابرہام دریائے یردن کو عبور کر کے فلسطین میں داخل ہوئے تھے اس لئے اُن کی قوم کو عبرانی کہا گیا۔ بنی اسرائیل کی روایت کے مطابق ابراہام سُمیریا کے شہر اُر سے اپنے قبیلے کو لے کر آئے تھے اور ۲۲۰۰ ق م کے لگ بھگ فلسطین میں بود و باش اختیار کی۔ اُن کا زمانہ جناب موسیٰ سے ایک ہزار برس پہلے کا بتایا جاتا ہے۔ جب سامی خانہ بدوشوں کا یہ قافلہ جس کا اصل وطن عرب تھا زرخیز علاقوں کی تلاش میں فلسطین پہنچا تو اہرام مصر کی تعمیر پر ایک ہزار برس گذر چکے تھے اور مصر، بابل اور نینوا کے تمدن نقطۂ عروج کو پہنچ کر زوال پذیر ہو رہے تھے۔ اِس ابتدائی دَور کے تاریخی شواہد ناپید ہیں اِس لئے مورخین کو بامر مجبوری عہد نامۂ قدیم کی روایات ہی پر حصر کرنا پڑتا ہے جن کی رُو سے جناب ابرہام پچھتر برس کی عمر کے تھے جب خداوند خدا نے اُنہیں کنعان کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا تھا۔

"خدا نے اُس سے ہم کلام ہو کر فرمایا کہ دیکھ میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تُو بہت قوموں کا باپ ہو گا اور تیرا نام پھر ابرام نہیں کہلائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہو گا کیوں کہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرا دیا ہے اور میں تجھے بہت برومند کروں گا.... میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام مُلک جس میں تُو

پردیسی ہے ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں اُس کا خدا ہوں گا۔"[1]

جناب ابرہام کے ورود سے نو سو برس پہلے جزیرۂ کریٹ کے دارالسلطنت کنوسس کو دشمنوں نے تباہ کر دیا تو وہاں کے باشندے بھاگ کر بحرۂ رُوم کے ساحل پر آباد ہو گئے۔ مصری انہیں فلسطائن کہتے تھے چنانچہ اُن کے نئے وطن کا نام فلسطیہ رکھا جو بعد میں فلسطین کہلانے لگا۔ ابرہام نے فلسطین پہنچ کر بیرشیبا کے مقام پر ڈیرے ڈال دیئے اور خداوند خدا کے لئے قربان گاہ بنائی۔ اُن کی آمد سے صدیوں پہلے فلسطین میں شہر سالم آباد تھا جسے بعد میں یروشلم کا نام دیا گیا صیہون اُن پہاڑیوں میں سے ایک تھی جن پر یروشلم کا شہر آباد تھا۔

ابرہام کی تین بیویوں سے اولاد نرینہ ہوئی۔ ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل اور سارہ کے بطن سے اضحاق پیدا ہوئے۔ سارہ کے اصرار پر ہاجرہ اور اسماعیل کو فاران کی جانب ہجرت کرنا پڑی۔ قطورہ سے چھ بیٹے ہوئے۔ ابرہام کی وفات پر انہیں مکفیلہ کے غار میں دفن کیا گیا۔ اضحاق کی اولاد میں عیسو اور یعقوب تھے۔ یعقوب کا لقب بعد میں اسرائیل پڑ گیا اور اُن کے بارہ بیٹوں کی اولاد بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ یعقوب کے محبوب بیٹے یوسف تھے جنہیں سوتیلے بھائیوں نے حسد کے مارے ایک ویران کنوئیں میں پھینک دیا جہاں سے ایک قافلے والے انہیں نکال کر مصر لے گئے اور وہاں غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مصر میں حملہ آور ہکساس کی حکومت تھی۔ کچھ عرصے کے بعد قحط سالی سے مجبور ہو کر یوسف کے دوسرے بھائی بھی اپنے اہل و عیال سمیت مصر آ گئے۔ ہکساس کے بادشاہ نے اُن کی آؤ بھگت کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ بنی اسرائیل صدیوں تک مصر میں پھولتے پھیلتے رہے۔ آخر مصریوں نے بغاوت کر کے ہکساس کو اپنے مُلک سے نکال دیا۔ اب بنی اسرائیل کے بُرے دن آئے۔ فراعین نے جبر و تشدد سے اُن کا قلع قمع کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے فرمان جاری کیا کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی تلف کر دیا جائے۔ اسی دوران میں لاوی کے گھرانے کے ایک شخص کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جسے ماں نے

[1] پیدائش

موت سے بچانے کے لئے سرکنڈے کی ٹوکری میں رکھ کے دریائے نیل میں بہا دیا۔ حسن اتفاق سے فرعون کی بیٹی نے سیر کرتے ہوئے اُس ٹوکرے کو دیکھ لیا اور اُسے پانی سے نکلوایا۔ جب اُس کی نگاہ خوبصورت نومولود پر پڑی تو اُس کا دل پسیج گیا اور اُسے اپنے محل میں لے گئی۔ اُس نے بچّے کا نام موسیٰ رکھا جو قبطی نام ہے جس کا معنیٰ ہے پانی سے نکالا گیا۔ جناب موسیٰ فرعون کے محل میں پرورش پاکر جوان ہوئے تو اُنہیں بنی اسرائیل کی زبوں حالی شاق گذری۔ ایک دن جھاڑی کی آگ کے شعلے میں خداوند خدا نے اُن سے کلام کیا اور کہا کہ میں تمہارے ہم قوموں کو مصریوں کی غلامی سے آزاد کرا کر اُنہیں کنعان لے جاؤں گا جہاں " دودھ اور شہد بہتا ہے"۔ جناب موسیٰ نے یہ بشارت اپنے ہم قوموں کو سُنائی اور اُن کی رہائی کے لئے جدوجہد شروع کی۔ خداوند نے انہیں معجزات دے کر فرعون کے پاس بھیجا۔ فرعون نہ مانا تو خداوند نے ملک پر اولے برسائے اور مینڈکوں، ٹڈیوں اور پھوڑے پھنسیوں کے عذاب نازل کئے۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد جناب موسیٰ نے اپنی قوم کے ساتھ مصر سے خروج کیا۔ ساحل سمندر پر پہنچے تو سمندر کا پانی اِدھر اُدھر ہٹ گیا اور درمیان میں رستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل اُس راستے پر سے گذر کر پار چلے گئے۔ مصری اُن کے تعاقب میں آرہے تھے جب وہ دریا میں داخل ہوئے تو پانی پھر اُمڈ آیا اور فرعون کا لشکر غرق ہو گیا۔ خروج کے بعد کے حالات تاریخ کی روشنی میں آجاتے ہیں۔ مصر اور اشوریا کے مآخذ میں بنی اسرائیل کی ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ اس کی توجیہہ مختلف ہے۔ وِل ڈیوراں لکھتا ہے [۱]

"جوزفس نے ایک مصری مورّخ مینتھو کے حوالے سے لکھا ہے کہ فاقہ زدہ اسرائیلی غلاموں میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ اِس لئے مصری حکومت نے اُنہیں اپنے ملک سے نکال دیا۔ موسیٰ ایک قبطی پروہت تھے جو یہودی جذامیوں کے پاس گئے اور اُنہیں مصری حفظانِ صحت کے طریقوں سے روشناس کرایا۔ یونانی مورّخ سٹرابو اور رومی مورّخ ٹسائٹس نے بھی ہجرت کی یہی توجیہہ کی ہے۔"

---

[۱] OUR ORIENTAL HERITAGE.

مصر سے نکل کر بنی اسرائیل صحرا کی خاک چھانتے رہے اور "منؔ[1] جو دھنیے کے بیج کی طرح سفید تھی اور جس کا ذائقہ شہد کے پوئے کی طرح تھا" کھا کھا کر گذر بسر کرتے رہے۔ دشت نوردی کے دوران میں وہ کوہِ سینا کے پاس سے گذرے تو خداوند خدا یہواہ شعلے میں سے اُتر کر اُن کے پاس آیا اور اُس نے جناب موسیٰ کو پہاڑ کی چوٹی پر بلایا۔

"تب موسیٰ پہاڑ کے اُوپر گیا اور پہاڑ پر گھٹا چھا گئی اور خدا کا جلال کوہِ سینا پر آ کر ٹھہرا اور چھ دن تک گھٹا اُس پر چھائی رہی اور ساتویں دن اُس نے گھٹا میں سے موسیٰ کو بلایا اور بنی اسرائیل کی نگاہ میں پہاڑ کی چوٹی پر خداوند کا جلال بھسم کرنے والی آگ کی مانند تھا اور موسیٰ گھٹا کے بیچ میں ہو کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور پہاڑ پر چالیس دن اور راتیں رہا"[2]

اس دوران میں خداوند یہواہ نے اپنے احکام کی دو الواح جناب موسیٰ کو دیں اور خیمۂ اجتماع، شہادت کا صندوق، قربان گاہ، شمعدان وغیرہ بنانے کی ہدایت کی۔ جناب موسیٰ پہاڑ سے نیچے اُترے تو دیکھا کہ اُن کے ہم قوموں نے سونے کا ایک بچھڑا ڈھال لیا ہے اور وہ اُس کی پوجا کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر جناب موسیٰ غصے سے بیتاب ہو گئے، الواح کو پٹک دیا اور وہ ٹوٹ گئیں۔ خداوند نے بنی اسرائیل کو تباہ کرنے کی دھمکی دی لیکن جناب موسیٰ نے کہہ سُن کر خداوند کا غصہ ٹھنڈا کیا، نئی الواح پر احکام عشرہ کندہ کیے گئے۔ جناب موسیٰ نے تابوتِ سکینہ بنوا کر اُس میں الواحِ شریعت، منّ کا مرتبان، عصا وغیرہ رکھ دیئے اور بنی اسرائیل نے وادیٔ سینا سے کوچ کیا۔ اس سفر میں یہواہ دن کو دھوئیں کے بلند ستون کی صورت میں اور رات کو شعلۂ جوالہ بن کر اُن کی رہبری کرتا رہا۔

"اور بنی اسرائیل کے سارے سفر میں یہ ہوتا رہا کہ جب وہ ابر مسکن کے اوپر اٹھ جاتا تو وہ آگے بڑھتے پر اگر وہ ابر نہ اُٹھتا تو وہ اُس دن تک سفر نہ کرتے جب تک وہ اُٹھ نہ جاتا کیوں کہ خداوند کا ابر اسرائیل کے سارے گھرانے کے سامنے اور اُن کے سارے

---

[1] مصری اسے منّو کہتے تھے۔ [2] خروج

سفر میں دن کے وقت تو مسکن کے اوپر رہتا اور رات کو اُس میں آگ رہتی تھی۔"[1]

بنی اسرائیل نہایت ہٹ دھرم اور جھگڑالو تھے اور ہر وقت شورش اور سرکشی پر تلے رہتے تھے۔ یہواہ نے خفا ہو کر چالیس برس دشت نوردی کی سزا دی

"سو خداوند کا قہر اسرائیل پر بھڑکا اور اُس نے اُن کو چالیس برس تک آوارہ پھرایا جب تک کہ اُس پُشت کے سب لوگ جنہوں نے خداوند کے روبرو گناہ کیا تھا نابود نہ ہو گئے۔"[2]

آخر بنی اسرائیل دریائے یردن کے کنارے پہنچ گئے اور خداوند نے جناب موسیٰ سے کہا۔

"جب تم یردن کو عبور کر کے مُلک کنعان میں داخل ہو تو تم اس مُلک کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اور اُن کی شبیہ دار پتھروں کو، اُن کے ڈھالے ہوئے بُتوں کو توڑ ڈالنا اور اُن کے سب اُونچے مقاموں کو مسمار کر دینا اور تم اِس مُلک پر قبضہ کر کے اِس میں بسنا کیوں کہ میں نے وہ مُلک تم کو دیا کہ تم اُس کے مالک بنو۔"[3]

خداوند نے حکم دیا کہ کنعانیوں وغیرہ کو شکست دے کر بالکل نابود کر دیا جائے۔ اُن سے کوئی عہد نہ کیا جائے اور نہ اُن پر رحم کیا جائے۔ اُن کے مذبحوں کو ڈھا دیا جائے، اُن کے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور اُن کی تراشی ہوئی مورتوں کو آگ میں جلا دیا جائے کیوں کہ تو

"خداوند اپنے خدا کے لئے ایک مقدّس قوم ہے۔ خداوند تیرے خدا نے تجھ کو روئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چُن لیا ہے تاکہ اُس کی خاص اُمّت ٹھہرے... خداوند کو تم سے محبّت ہے اور وہ اُس قسم کو جو اُس نے تمہارے باپ دادا سے کھائی پورا کرنا چاہتا تھا۔"[4]

موآب کے میدان میں جناب موسیٰ کو پیغام اجل آ پہنچا اور اُنہیں بیت فغور کے مقابل دفن کیا گیا۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ اُن کی قبر کا نشان مٹ گیا۔ بنی اسرائیل تیس دن جناب موسیٰ کا ماتم کرتے

[1] خروج   [2،3] گنتی   [4] استثناء

رہے۔ جناب موسیٰ کی وفات کے بعد خداوند نے نون کے بیٹے یشوع کو مامور کیا کہ وہ یردن کو عبور کر کے کنعانیوں پر حملہ آور ہو چنانچہ بنی اسرائیل کا لشکر دریا کے پار اُتر گیا اور یریحو کے قلعہ بند شہر پر حملہ آور ہوا

"خداوند نے یشوع سے کہا کہ دیکھ میں نے یریحو کو اور اُس کے بادشاہ اور زبردست سورماؤں کو تیرے ہاتھ میں کر دیا ہے سو تم سب جنگی مرد شہر کو گھیر لو اور ایک دفعہ اس کے گرد گردش کرو۔ چھ دن تک تم ایسا ہی کرنا اور سات کاہن صندوق کے آگے مینڈھوں کے سینگوں کے نرسنگے لئے ہوئے چلیں اور ساتویں دن تم شہر کے گرد سات بار گھومنا اور کاہن نرسنگے پھونکیں اور یوں ہو گا کہ جب وہ مینڈھے کے سینگ کو زور سے پھونکیں اور تم نرسنگے کی آواز سنو تو سب لوگ نہایت زور سے للکاریں۔ تب شہر کی دیوار بالکل گر جائے گی۔"[1]

نرسنگھوں کی آواز نے اپنا اثر دکھایا اور یریحو کی شہر پناہ زمین بوس ہو گئی۔ بنی اسرائیل کا لشکر اندر گھس گیا اور

"انہوں نے اُن سب کو جو شہر میں تھے کیا مرد کیا عورت، کیا بڈھے کیا بیل کیا بھیڑ کیا گدھے سب کو تلوار کی دھار سے بالکل نیست کر دیا۔"

اموریوں کے خلاف خداوند نے بنی اسرائیل کی غیبی امداد کی اور انہیں آسمان سے پتھر برسا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا جب اموری شکست کھا کر بھاگ رہے تھے یشوع نے خدا سے دعا کی کہ سورج کو ٹھہرا دے تاکہ وہ اس کی روشنی میں رات سے پہلے دشمنوں کا قلع قمع کر سکے۔ سورج ٹھہر گیا اور تمام اموری لقمہ شمشیر بن گئے۔ اسی طرح خداوند یہواہ بنی اسرائیل کی طرف سے لڑتا رہا اور وہ فتح یاب ہوتے رہے۔

"تمہارا ایک ایک مرد ایک ایک ہزار کو رگیدے گا کیوں کہ خداوند تمہارا خدا ہی تمہارے لئے لڑتا ہے جیسا کہ اُس نے تم سے کہا"

---

[1] یشوع

یشوع کے بعد جدعون، افتاح، سمسون وغیرہ مدیانیوں، عمالیق، افرائیمیوں وغیرہ سے نبرد آزما رہے اور اکثر غالب آتے رہے۔ غیر اقوام سے میل جول پیدا کرنے سے جب اُن میں بُت پرستوں جیسی رسوم عبادت رواج پا گئیں اور وہ بعل، عستارات اور مولک کی پُوجا کرنے لگے تو خداوند اُن سے خفا ہو گیا اور اُن کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک جنگ میں اُنہیں شکست فاش ہوئی اور تابوت سکینہ بھی اُن سے چھن گیا۔ آخر خداوند کے حکم سے سموئیل نے قیس کے بیٹے ساؤل کو جو بڑا قد آور اور شہ زور نوجوان تھا بادشاہ بنا دیا۔ ساؤل پر خدا کی رُوح نازل ہوئی اور وہ بھی اُن کے درمیان نبوت کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد خداوند کی رُوح ساؤل سے جدا ہو گئی اور ایک بدرُوح اُسے ستانے لگی۔ داؤد گانے بجانے اور ناچنے کے ماہر تھے جب وہ بربط بجاتے تو ساؤل کی رُوح کو راحت ہوتی اور بدرُوح اُس پر سے اُتر جاتی فلستیوں کے ساتھ لڑائی میں اُن کا مشہور سُورما جاتی جولیت داؤد کے ہاتھ سے مارا گیا جس سے اُن کی شجاعت کی دھاک بیٹھ گئی اور ساؤل اُن سے حسد کرنے لگا۔

ساؤل کی موت پر بنی اسرائیل نے داؤد کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ داؤد نے دشمنوں کو شکست دی اور تابوت سکینہ واپس لے لیا۔ اس خوشی میں "داؤد خداوند کے حضور اپنے سارے زور سے ناچنے لگا۔" ناتن نبی کے کہنے پر داؤد نے ہیکل کی تعمیر شروع کی جسے اُن کے بیٹے سلیمان نے تکمیل کو پہنچایا۔

شاہ داؤد کی وفات پر جناب سلیمان تخت پر بیٹھے اور سر پر تاج رکھتے ہی بھائیوں کے قتل کا حکم دیا۔ جناب سلیمان کا عہدِ حکومت بنی اسرائیل کی تاریخ کا سب سے درخشاں زمانہ سمجھا جاتا ہے فلسطین کو اُس زمانے میں "شاہراہوں کی سرزمین" کہا جاتا تھا۔ اشوری اور مصری آپس میں برسرپیکار ہوتے تو اُن کی فوجیں فلسطین ہی سے گذر کر اُسے پامال کرتی ہوئی ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی تھیں چنانچہ اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے لئے جناب سلیمان نے مصر اور کنعان کے سلاطین کی بیٹیوں سے نکاح کیا اور اس طرح انھیں اپنا حلیف بنا لیا۔ جب اس طرف سے اطمینان ہو گیا تو اُنہوں نے ہیکل کی تعمیر پر کمرِ ہمت باندھی۔ صُور کے بادشاہ حیرام سے کہہ کر دیودار کی لکڑی فراہم کی۔ ہر ماہ دس ہزار بیگاری لبنان جاتے اور وہاں سے لکڑی کاٹ کر اور پتھر تراش کر لاتے تھے۔ معمار اور کاریگر بھی صُور اور صیدون کے شہروں

سے بلائے گئے۔ ہیکل کی اندرونی دیوار پر دیودار کے تختے لگائے گئے اور فرش کو صنوبر کے تختوں سے پاٹ دیا گیا۔ الہام گاہ بیس ہاتھ لمبی اور بیس ہاتھ چوڑی تعمیر کی گئی۔ اس پر خالص سونا منڈھا ہوا تھا۔ قربان گاہ کے شمعدان بھی خالص سونے کے بنوائے گئے۔ الہام گاہ میں زیتون کی لکڑی سے تراشے ہوئے دو فرشتے دس دس ہاتھ اونچے بنوائے گئے۔ فرشتے کے ایک بازو سے دوسرے بازو تک کا فاصلہ دس ہاتھ رکھا گیا۔ ان کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے نیچے تابوت سکینہ رکھا گیا جس میں جناب موسیٰ کے تبرکات الواح، عصا وغیرہ تھے۔ سال میں صرف ایک مرتبہ کاہن اعظم سفید لباس پہنے اس میں داخل ہوتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں طلائی بخور دان ہوتا اور دوسرے سنہری پیالے میں بیل کا خون۔ اس خون کو وہ فرش پر چھڑکتا تھا۔ قربان گاہ میں قربانیاں کی جاتی تھیں۔ سارے مقدس میں بخور جلائے جاتے تھے جن سے فضا مہک جاتی تھی۔ ہیکل کی عمارت سات برس میں ہوئی تو جناب سلیمان نے اس خوشی میں بائیس ہزار بیل اور ایک لاکھ بیس ہزار بھیڑیں بھینٹ چڑھائیں۔ مقدس کے علاوہ بادشاہ نے اپنے لئے ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا اور غیر اقوام کی بیویوں کے لئے اس میں ان کے دیوتاؤں کے معبد بھی تعمیر کرائے۔

سلیمان کی دانش و حکمت ضرب المثل بن گئی جس کا شہرہ سن کر ملکہ سبا ان سے ملنے آئی تھی۔ امثال بھی انھی سے منسوب کی جاتی ہیں۔ سلیمان کی موت کے بعد ان کی سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی: اسرائیل اور یہوداہ۔ ان کے بیٹوں رحبعام اور یربعام کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ مصر کے فرعون شیشاک نے اس پھوٹ کا فائدہ اٹھانے کے لئے یروشلم پر چڑھائی کی اور مقدس اور شاہی محل کے خزانوں کو لوٹ کھسوٹ کر لے گیا۔ اسرائیل کے بادشاہ اخی اب نے صیدانی شہزادی ایزبل سے شادی کی جس نے اپنے معبود بعل کے لئے مندر تعمیر کرایا اور اس کے مذبح پر قربانیاں کرنے لگے۔ اس کی دیکھا دیکھی رعایا میں بھی بعل پوجا جڑ پکڑ گئی جس پر خداوند خدا اپنی برگزیدہ امت سے ناراض ہو گیا اور اس کے دھمکی دی "میں یروشلم کو ایسا پونچھوں گا جیسے آدمی تھالی کو پونچھتا ہے اور اسے پونچھ کر الٹی رکھ دیتا ہے۔"

پہلے اسرائیل کی باری آئی۔ سارگن شاہ اشور نے ۷۲۲ ق م میں حملہ کر کے اسرائیل کو برباد

کیا اور اُس کی ساری آبادی کو قید کر کے لے گیا پھر پتہ نہ چل سکا کہ اسرائیل کے دس قبائل کا کیا حشر ہوا۔ وہ صفحۂ تاریخ سے غائب ہو گئے۔ ۵۸۶ ق م میں بنوکدنضر شاہ بابل نے یہوداہ پر چڑھائی کی اور سخت مزاحمت کے باوجود فتح پائی۔ بابلیوں نے ہیکل سلیمانی اور شاہی محلات کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سونے چاندی کے ظروف اور شمعدان سمیٹ کر لے گئے۔ بنوکدنضر بھی یہوداہ کی ساری آبادی غلام بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا جہاں کم و بیش اسیّ برس یہودیوں نے اسیری میں بسر کئے۔ یہودیہ کے مہاجرین کو اپنے کاہنوں کے ساتھ مذہبی رسُوم ادا کرنے کی آزادی تھی۔ اِن میں بعض خاصے آسودہ حال تاجر تھے دوسرے مملکت کے عہدوں پر فائز تھے۔ شہنشاہ خشرشیا نے ایک یہودی لڑکی آستر نامی کو جو حُسن و جمال میں یگانۂ روزگار تھی اپنی ملکہ بنا لیا اور اُس کے ہم قوموں سے لُطف و کرم کا برتاؤ کرنے لگا۔ انبیاء بابل کے جلاوطنوں کو ہمت دلاتے رہے اور نجات کی بشارت دیتے رہے۔ کوروش کبیر نے یہودیوں کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت دے دی اور مقدس سے لوٹے ہوئے سونے چاندی کے ظروف بھی لوٹا دیئے۔ بنی اسرائیل نے وطن واپس آکر از سرِ نو مقدس تعمیر کیا اور توریت کے منتشر اوراق جمع کئے۔ اِس دوران میں یہودیت نے جو شکل و صورت اختیار کی وہ آج تک باقی و برقرار ہے۔ دو صدیوں تک ایرانی بنی اسرائیل پر عدل و انصاف سے حکومت کرتے رہے۔ سکندرِ اعظم کے حملے کے بعد یہوداہ یونانیوں کی مملکت شام کا ایک صوبہ بن گئی۔ طویل جدوجہد کے بعد مکابی بھائیوں نے شامی فوج کو شکست دے کر آزادی حاصل کی (۱۶۵ ق م) کچھ عرصے کے بعد یہودی دو فرقوں میں بٹ گئے۔ فریسی اور صدوقی جن میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اِس سے فائدہ اُٹھا کر رومہ کے سالار پومپے نے ملک پر قبضہ کر لیا اور ایک یہودی انٹی پیٹر کو گورنر مقرر کر دیا۔ انٹی پیٹر، اُس کا بیٹا اور پوتا ۳۹ ء ب م تک حکومت کرتے رہے۔ اِس کے بعد یہودیوں نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ رومی جرنیل طائی ٹس نے فوج کشی کر کے یروشلیم کو فتح کیا اور ہیکل کو نذرِ آتش کر دیا۔ ہزاروں یہودی قتل ہوئے اور بقیۃ السیف کو غلام بنا کر بیچ ڈالا گیا۔ ابتلا کے اِس زمانے میں یہودی بھاگ کر دُور دراز کے ممالک میں ہجرت کر گئے اور شمالی افریقہ، بحرۂ رُوم کے ساحلی شہروں، سکندریہ، رومہ، مغربی یورپ اور ایشیا

کے شہروں میں بود و باش اختیار کر کے تجارت اور صرافہ سے کسبِ معاش کرنے لگے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں صیہونی تحریک نے زور پکڑا اور ۱۹۴۸ء میں برطانیہ کی مدد سے اسرائیل کی ریاست دوبارہ معرضِ وجود میں آ گئی۔

مذہب تاریخی منظر پر نمودار ہونے سے پہلے بنی اسرائیل بھی معاصر اقوام کی طرح کئی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے، پہاڑوں، چٹانوں، غاروں، بدروحوں کی پرستش کرتے تھے، بعل کی پوجا ایک مخروطی پتھر کی صورت میں کرتے تھے۔ سانپ کو دانش و حکمت کی علامت سمجھ کر اُسے مقدس مانتے تھے۔ بعد میں اُنہوں نے آتش فشاں پہاڑ کے فنیقی دیوتا یاہو کو یہواہ کے نام سے اپنا قومی اور ملّی خدا بنا لیا لفظ یہواہ یا یہوواہ کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ سپا لنگ کے خیال میں یہوواہ کا معنیٰ ہے "ہونا"۔ جب خداوند جنابِ موسیٰ سے ہم کلام ہوا تو اُنہوں نے اُس کا نام پوچھا۔ جواب ملا "میرا نام ہے میں ہوں جو ہوں"۔ بعض اہلِ تحقیق لفظ یہواہ کو فارسی الاصل بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اہورا اور یہواہ کا مادہ ایک ہی ہے۔ بعض کے خیال میں بنی اسرائیل اپنے خدا کا نام نہیں لیتے تھے اس لیے اُنہوں نے ھُو کے شروع میں یائے ندائیہ لگا کر یہواہ بنا لیا۔ یہواہ کا معنیٰ اہلِ لغت کے یہاں "ریڑھ کی ہڈی" کا ہے۔ مورخ دین اُن کے خیال میں ابتدا میں یہواہ کڑک چمک کا دیوتا تھا۔

— "خداوند کی راہ گرد باد اور آندھی ہے، بادل اُس کے پاؤں کی گرد ہیں"۔ (عہد نامہ قدیم)

وہ ابر کے ستون اور کالے بادل میں برق و رعد کے ساتھ اُترتا ہے

— "جب تیسرا دن آیا تو صبح ہوتے ہی بادل گرجنے اور بجلی چمکنے لگی اور پہاڑ پر کالی گھٹا چھا گئی اور قرنا کی آواز بہت بلند ہوئی اور سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملائے اور پہاڑ سے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہِ سینا اوپر سے نیچے تک دھوئیں سے بھر گیا کیوں کہ خداوند شعلے میں ہو کر اُس پر اُترا اور دھواں تنور کے دھوئیں کی طرح اوپر کو اُٹھ رہا تھا اور وہ سارا پہاڑ زور سے ہل رہا تھا"۔ (خروج)

وہ خیمۂ اجتماع پر ابر میں سے ہو کر نمودار ہوتا ہے

"تب خیمۂ اجتماع پر ابر چھا گیا اور مسکن خداوند کے جلال سے معمور ہو گیا اور موسیٰ خیمۂ اجتماع میں داخل نہ ہو سکا کیوں کہ ابر اُس پر ٹھہرا ہوا تھا۔" [۱]

"اور خداوند ابر کے ستون میں ہو کر اُترا اور خیمے کے دروازے پر کھڑے ہو کر ہارون اور مریم کو بلایا۔" [۲]

"جب موسیٰ خیمے کے اندر چلا جاتا تو ابر کا ستون اُتر کر خیمہ پر ٹھہرا رہتا اور خداوند موسیٰ سے باتیں کرنے لگتا اور سب لوگ ابر کے ستون کو خیمے کے دروازے پر کھڑا ہوا دیکھتے تھے اور سب لوگ اُٹھ اُٹھ کر اپنے اپنے ڈیرے کے دروازے پر اُسے سجدہ کرتے تھے۔" [۳]

یہواہ جناب موسیٰ کو آگ کے شعلے میں سے مخاطب کرتا ہے اور دھوئیں کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی رہبری کے لئے آگے آگے چلتا ہے اور قوسِ قزح کو اپنے اور انسان کے درمیان بطور عہد کے نشان کے رکھتا ہے [۴]

"میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں۔ وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان ہو گی اور ایسا ہو گا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤں گا تو میری کمان بادل میں دکھائی دے گی اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے اور ہر طرح کے جاندار کے درمیان ہے یاد کروں گا۔" [۵]

یہواہ خالصتاً شخصی اور تشبیہی خدا ہے جس نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ وہ ربّ الافواج ہے جو لڑائیوں میں یہودیوں کی مدد کرتا ہے اور اُن کی جانب سے لڑتا ہے۔

"سُنو اے اسرائیلیو! تم آج کے دن اپنے دشمنوں کے لئے معرکۂ جنگ میں آئے ہو سو تمہارا دل ہراساں نہ ہو، تم خوف نہ کرو نہ کانپو نہ اُن سے دہشت کھاؤ کیوں کہ خداوند تمہارا خدا تمہارے ساتھ چلتا ہے تاکہ تم کو بچانے کو تمہاری طرف سے تمہارے

---

[۱]–[۳] خروج [۴] [۵] پیدائش

دشمنوں سے جنگ کرے۔"

جب اشوریا کے بادشاہ سینحرب نے یہوواہ پر حملہ کیا تو خدا نے فرشتہ بھیج کر اُن کا لشکر تباہ کر ڈالا۔

"اور اُسی رات خداوند کے فرشتہ نے نکل کر اشور کی لشکر گاہ میں ایک لاکھ پچاسی ہزار آدمی مار ڈالے اور صبح کو جب لوگ سویرے اُٹھے تو دیکھا کہ وہ سب مرے پڑے ہیں۔ تب شاہ اشور سینحرب وہاں سے چلا گیا اور لوٹ کر نینوا میں رہنے لگا۔"

خداوند یہوواہ اپنے بارے میں کہتا ہے۔

"میں شاہ عظیم ہوں اور قوموں میں میرا نام مہیب ہے۔"

عہد نامہ قدیم کا خداوند خدا جب سدوم کی بربادی کا عزم کر کے آتا ہے تو پہلے جناب ابرہام کے پاس ٹھہرتا ہے اور اُن کے ہاں کھانا بھی کھاتا ہے۔

"پھر خدا ممرے کے بلوطوں میں اُسے نظر آیا اور وہ دن کی گرمی کے وقت اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھا تھا اور اُس نے اپنی آنکھیں اُٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ اُن کو دیکھ کر خیمے کے دروازے سے اُن سے ملنے دوڑا اور زمین تک جُھکا اور کہنے لگا "اے میرے خداوند اگر مجھ پر آپ نے کرم کی نظر کی ہے تو اپنے خادم کے پاس سے چلے نہ جائیں بلکہ تھوڑا سا پانی لایا جائے اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اِسی درخت کے نیچے آرام کریں، میں کچھ روٹی لاتا ہوں آپ تازہ دم ہو جائیں۔"

پھر جناب ابرہام نے بچھڑا ذبح کیا اور اُس کا گوشت بھون کر مہمان کو کھلایا۔ خداوند خدا نے ایک دن جناب یعقوب سے کشتی بھی لڑی تھی۔

"اور یعقوب اکیلا رہ گیا اور پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اُس سے کشتی لڑتا رہا۔ جب اُس نے دیکھا کہ وہ اُس پر غالب نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر سے چھوا اور یعقوب کی ران کی نس اُس کے ساتھ کشتی لڑنے میں چڑھ گئی اور

اُس نے کہا مجھے جانے دے کیوں کہ پو پھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا جب تک تُو مجھے برکت نہ دے میں تجھے نہیں جانے دُوں گا۔ تب اُس نے اُس سے پُوچھا کہ تیرا نام کیا ہے۔ اُس نے جواب دیا "یعقوب" اُس نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تُو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ تب یعقوب نے اُس سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو مجھے اپنا نام بتا دے۔ اُس نے کہا تو میرا نام کیوں پُوچھتا ہے؟ اور اُس نے اُسے وہاں برکت دی اور یعقوب نے اُس کا جگہ کا نام فنی ایل رکھا اور کہا کہ میں نے خدا کو رُوبرو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی۔"

جناب موسیٰ کو خدا کی صورت دکھائی نہیں دیتی صرف آواز سُنائی دیتی ہے۔

"پھر خدا نے کہا دیکھ قریب ہی ایک جگہ ہے سو تُو اُس چٹان پر کھڑا ہو اور جب تک میرا جلال گذرتا رہے گا میں تجھے اُس چٹان میں رکھوں گا اور جب تک میں نکل نہ جاؤں تجھے اپنے ہاتھ سے ڈھانکے رکھوں گا۔ اِس کے بعد میں اپنا ہاتھ اُٹھا لُوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھے گا لیکن میرا چہرہ دکھائی نہ دے گا۔"

دوسری سامی اقوام کی طرح یہودی بھی بعض اوقات خدا کے لیے اِل یا ایل کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اِشوریوں کا اِلہ بہ معنی معبود تھا جس کا آرامی زبان میں معنی ہے "قوی"

اِس تشبیہی معبود کے جذبات بھی قدرتاً انسانوں جیسے ہیں۔ وہ اپنی برگزیدہ ملت بنی اسرائیل کو ملک کنعان کی بادشاہت کی بشارت دیتا ہے اور اُن کے دشمنوں کو پامال کرتا ہے۔ اُن کے ساتھ عہد و پیمان باندھتا ہے لیکن جب وہ سرکشی، کفر اور شرک پر اُتر آتے ہیں تو اُنہیں سخت سرزنش بھی کرتا ہے کیوں کہ بقول خود وہ "خدائے غیور" ہے اور یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اُس کی پرستش میں کسی اور معبود کو شریک کیا جائے۔

"سو خبردار رہنا کہ جس مُلک کو تو جاتا ہے اُس کے باشندوں سے کوئی عہد نہ باندھنا۔

ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے لئے پھندہ ٹھہرے بلکہ تم اُن کی قربان گاہوں کو ڈھا دینا اور
اُن کے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور اُن کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالنا کیونکہ تجھ
کو کسی دوسرے معبود کی پرستش نہیں کرنی ہوگی اِس لئے کہ خداوند جس کا نام غیور
ہے سو ایسا نہ ہو کہ تو اُس ملک کے باشندوں سے کوئی عہد باندھ لے" [۱]

خداوند اِسی دنیا میں فرمانبرداری کا معاوضہ اور نافرمانی کی سزا دیتا ہے۔

" اگر تم میرے حکموں کو جو آج میں تم کو دیتا ہوں دِل لگا کر سُنو اور خداوند اپنے خدا
سے محبت رکھو اور اپنے سارے دل اور ساری جان سے اُس کی بندگی کرو تو میں
تمہارے ملک میں عین وقت پر پہلا اور پچھلا مینہ برساؤں گا تاکہ تو اپنا غلہ اور مے
اور تیل جمع کر سکے اور میں تیرے چوپایوں کے لئے میدان میں گھاس پیدا کروں گا
اور تو کھائے گا اور سیر ہوگا۔ سو تم فرمانبردار رہنا تاکہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے دل دھوکا
کھا جائیں اور تم بہک کر اور معبودوں کی عبادت اور پرستش کرنے لگو اور خداوند
کا غضب تم پر بھڑکے اور وہ آسمان بند کر دے تاکہ مینہ نہ برسے اور زمین میں
کچھ پیداوار نہ ہو۔۔۔۔ دیکھو میں آج کے دن تمہارے آگے برکت اور لعنت دونوں
رکھے دیتا ہوں۔ برکت اِس حال میں تم خداوند اپنے خدا کے حکموں کو جو آج میں
تم کو دیتا ہوں مانو اور لعنت اُس وقت جب تم خداوند اپنے خدا کی فرمانبرداری
نہ کرو اور اُس راہ کو جس کی بابت میں آج تم کو حکم دیتا ہوں چھوڑ کر اور معبودوں
کی پیروی کرو جن سے تم اب تک واقف نہیں۔"

بنی اسرائیل بار بار سرکشی کرتے ہیں اور غیر اقوام کے دیوتاؤں کی پوجا کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں
تو خداوند کا غصہ بھڑک اُٹھتا ہے اور وہ خشمناک لہجے میں انہیں دھمکاتا ہے:

" یہ تیری اُن بد عمالیوں کے سبب سے ہوگا جن کو کرنے کی وجہ سے تو مجھ کو چھوڑ دے گا۔

---

[۱] خروج

خداوند ایسا کرے گا کہ وبا تجھ سے لپٹی رہے گی جب تک کہ وہ تجھ کو اُس ملک سے جس پر قبضہ کرنے کو تو وہاں جا رہا ہے فنا نہ کر دے۔ خداوند تجھ کو تپ دق اور بخار اور سوزش اور شدید حرارت اور تلوار اور باد سموم اور گیروئی سے مارے گا اور یہ تیرے پیچھے پڑے رہیں گے جب تک تو فنا نہ ہو جائے اور آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی۔ خداوند مینہ کے بدلے تیری زمین پر خاک اور دھول برسائے گا۔ یہ آسمان سے تجھ پر پڑتی رہے گی جب تک تو ہلاک نہ ہو جائے.... خداوند تجھ کو مصر کے پھوڑوں اور بواسیر اور کھجلی اور خارش میں ایسا مبتلا کرے گا کہ تو کبھی اچھا نہیں ہونے کا۔ خداوند تجھ کو جنون اور نابینائی اور دل کی گھبراہٹ میں مبتلا کر دے گا۔" [۱]

یسعیاہ میں آیا ہے۔

"اور خداوند فرماتا ہے چونکہ صیون کی بیٹیاں متکبّر ہیں اور شوخ چشمی سے خراماں ہوتی ہیں اور اپنے پاؤں سے ناز رفتاری کرتی اور گھنگھرو بجاتی جاتی ہیں اس لئے خداوند صیون کی بیٹیوں کے سر گنجے اور یہوواہ اُن کے بدن بے پردہ کرے گا۔"

خداوند اپنے اعمال پر پچھتانے بھی لگتا ہے۔

"تب خداوند زمین پر انسان کو پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا اور خداوند نے کہا میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین سے مٹا ڈالوں گا۔ انسان سے لے کر حیوان اور رینگنے والے جانور اور ہوا کے پرندے تک کیونکہ میں اُن کے بنانے سے ملول ہوں۔"

اسی طرح وہ ساؤل کو بادشاہ بنا کر بعد میں پشیمان ہوا تھا۔ ایک دن ایسا بھی ہوا کہ خداوند یہوواہ نے غضبناک ہو کر بنی اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کا ارادہ کیا اور جناب موسیٰ کے سمجھانے بجھانے سے وہ

---

[۱] استثناء

س ارادے سے باز آیا۔

"تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیونکہ تیرے لوگ جن کو تُو ملک مصر سے نکال لایا بگڑ گئے ہیں۔ وہ اِس راہ سے جس کا میں نے اُن کو حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے لئے ڈھالا ہُوا بچھڑا بنایا اور اُسے پوجا اور اُس کے لئے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا میں اِس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے اِس لئے تو مجھے اب چھوڑ دے کہ میرا غضب اُن پر بھڑکے اور میں اُن کو بھسم کر دوں اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ تب موسیٰ نے خداوند اپنے خدا کے آگے منت کر کے کہا اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر بھڑکتا ہے جن کو تُو قوت عظیم اور دست قوی سے مُلک مصر سے نکال کر لایا ہے؟ مصری لوگ یہ کیوں کہنے پائیں کہ وہ اُن کو بُرائی کے لئے نکال لے گیا تاکہ پہاڑوں میں مار ڈالے اور اُن کو روئے زمین پر سے فنا کر دے۔ سو تو اپنے قہر و غضب سے باز رہ اور اپنے لوگوں سے بُرائی کرنے کا خیال چھوڑ دے تو اپنے بندوں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب کو یاد کر جن سے تُو نے اپنی ہی قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ میں تمہاری نسل کو آسمان کے تاروں کی مانند بڑھاؤں گا اور یہ سارا مُلک جس کا میں نے ذکر کیا ہے تمہاری نسل کو بخشوں گا کہ وہ سدا اُس کے مالک رہیں۔ تب خداوند نے اپنی بُرائی کرنے کے خیال کو چھوڑ دیا جو اُس نے کہا کہ اپنے لوگوں سے کروں گا۔"

جو خُدا اپنے ایک بندے کے سمجھانے پر بُرائی کرنے کا خیال ترک کر دیتا ہے وہ یقیناً ایک شخصی اور تشبیہی خدا ہے۔

خُدا پہلوٹھی کی اولاد کی قربانی مانگتا ہے اور سوختنی قربانی کی راحت انگیز خوشبو سُونگھ سُونگھ کر خوش ہوتا ہے۔

"تب نوح نے خداوند کے لیے ایک مذبح بنایا اور سب پاک چوپایوں اور پاک پرندوں میں سے تھوڑے سے لے کر اس مذبح پر سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور خدا نے ان کی راحت انگیز خوشبو لی۔"

بعض اوقات یہوواہ کا لب و لہجہ اس قدر تند و تیز ہو جاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

"لیکن تم اے جادوگرنی کے بیٹو! اے زانی اور فاحشہ کے بچو! ادھر آؤ تم کس پر ٹھٹھا مارتے ہو تم کس پر منہ پھاڑتے ہو اور زبان نکالتے ہو کیا تم باغی اولاد اور دغاباز نسل نہیں ہو۔" [1]

"خداوند بہادر کی مانند نکلے گا۔ وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت کھائے گا اور وہ نعرہ مارے گا۔ ہاں وہ للکارے گا۔ وہ اپنے دشمنوں پر غالب آئے گا۔ میں بہت مدت چپ رہا، میں خاموش رہا اور ضبط کرتا رہا پر اب میں دردِ زہ والی کی طرح چلاؤں گا۔" [2]

"میں اپنے تیروں کو خون پلا پلا کر مست کروں گا
اور میری تلوار گوشت کھائے گی۔" [3]

"میں تو ترس کھاتے کھاتے تنگ آ گیا" [4]

یہ شخصی خدا ہی نہیں قبیلائی معبود بھی ہے۔

"اس (فرعون) سے کہنا کہ خداوند عبرانیوں کے خدا نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔" [5]

"میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں" [6]

"جس طرح دلہا دلہن میں راحت پاتا ہے اسی طرح تیرا خدا تجھ میں مسرور ہوگا۔" [6]

"میں خود اپنی بھیڑوں کی تلاش کروں گا اور ان کو ڈھونڈ نکالوں گا جس طرح چرواہا اپنے گلہ کی تلاش کرتا ہے۔" [7]

یسعیاہ ثانی میں یہوواہ کے قبیلائی تصور میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ بعد میں پال ولی نے اس

۲،۱ے یسعیاہ ۳ے استثناء ۴ے یرمیاہ ۵ے خروج ۶ے یسعیاہ ۷ے حزقی ایل

تصوّر کو اپنا لیا اور کہا کہ خدا صرف بنی اسرائیل کا ملّی معبود نہیں ہے بلکہ جملہ اقوامِ عالم کا خداوند اور پروردگار ہے۔ یہوواہ کے تصوّر میں یہ ہمہ گیر وسعت اسیریٔ بابل کی دین ہے جہاں سے واپس آکر یہودیوں کا ملّی خدا خداوندِ عالم بن گیا۔ یسعیاہ کا خدا مغلوب الغضب اور مُنتقم نہیں ہے بلکہ رحیم وکریم ہے اور تمام بنی نوعِ انسان کا شفیق باپ ہے۔ یہودیوں نے یسعیاہ نبی کی اس تعلیم کو کبھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا۔ اُنہیں حزقیل کا ملّی خدا اپنے سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے کیوں کہ وہ انہیں برگزیدہ اُمت سمجھتا ہے اور اُن کی بہبود میں خاص طور سے دلچسپی لیتا ہے۔ ایلیاہ، عموس، ہوسیع، میکاہ وغیرہ نے یہوواہ کو اسرائیل کا واحد خدا قرار دیا۔

بنی اسرائیل نے توحید کی طرح نبوّت کا بھی مخصوص تصوّر پیش کیا۔ لفظ نبوّت کا معنیٰ ہے "خبر دینا" چنانچہ ابتداء میں غیب کی خبر دینے والے کو نبی کہا کرتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم میں جا بجا نبی کا اطلاق بعل کے کاہنوں، فال گیروں اور غیب بینوں پر ہوا ہے اور عورتوں کی نبوّت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کی ایک مشہور نبیّہ دبورّہ تھی جس نے ایک لڑائی میں بنی اسرائیل کے ایک لشکر کی قیادت کر کے دشمنوں کو شکست دی تھی۔ سچے نبیوں کے دوش بدوش جھوٹے مدعیانِ نبوّت بھی پیدا ہو گئے جو عوام کو بہکاتے رہتے تھے۔

> "اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد! اسرائیل کے نبی جو نبوّت کرتے ہیں اُن کے خلاف نبوّت کر اور جو اپنے دل سے بات بنا کر نبوّت کرتے ہیں اُن سے کہہ خداوند کا کلام سُنو۔ خداوند یوں فرماتا ہے کہ احمق نبیوں پر افسوس جو اپنی ہی رُوح کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اے اسرائیل! تیرے نبی اُن لومڑیوں کی مانند ہیں جو ویرانوں میں رہتی ہیں.... اُنہوں نے باطل اور جھوٹا شگون دیکھا ہے جو کہتے ہیں کہ خداوند فرماتا ہے اگرچہ خداوند نے اُنہیں نہیں بھیجا اور لوگوں کو اُمید دلاتے ہیں کہ اُن کی بات پوری ہو گی۔ کیا تم نے باطل رویا نہیں دیکھی؟ کیا تم نے جھوٹی غیب دانی نہیں کی؟ کیوں کہ تم کہتے ہو کہ خداوند نے فرمایا ہے اگرچہ میں نے نہیں فرمایا۔ اس لئے

خداوند خدا یُوں فرماتا ہے کہ چونکہ تم نے جھُوٹ کہا ہے اور بطلان دیکھا اِس لئے
خداوند خدا فرماتا ہے کہ مَیں تمہارا مخالف ہُوں اور میرا ہاتھ اُن نبیوں پر جو بطلان
دیکھتے ہیں اور جھوٹی غیب دانی کرتے ہیں، چلے گا" [1]

"نبی جھُوٹی نبوت کرتے ہیں اور کاہن اُن کے وسیلے سے حکمرانی کرتے ہیں" [2]

ایک دفعہ ایلیاہ نبی اور بعل کے نبیوں کے درمیان مقابلہ ہوا کہ دیکھیں کس کی قربانی قبول ہوتی ہے۔

"بعل کے نبی بلند آواز سے پکارنے لگے اور اپنے دستور کے مطابق اپنے آپ کو چھُریوں
اور نشتروں سے گھائل کر لیا یہاں تک کہ لہولہان ہو گئے۔ وہ دوپہر ڈھلے پر بھی شام
کی قربانی چڑھا کر نبوت کرتے رہے پر کچھ آواز ہوئی اور نہ کوئی جواب دینے والا نہ توجہ
کرنے والا تھا" [3]

اس کے برعکس ایلیاہ کی قربانی پر آسمان سے آگ نازل ہوئی جو قربانی کو قبول کرنے کی علامت تھی۔ بعل کے نبی ہار گئے اور انہیں قتل کر دیا گیا۔

عہد نامہ قدیم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند یہوواہ مختلف زمانوں میں مختلف طریقوں سے اپنے برگزیدہ بندوں یا نبیوں سے رابطہ قائم کرتا رہا۔ جناب ابرہام کے سامنے وہ انسانی شکل میں ظاہر ہوا، اُن سے باتیں کیں اور اُن کا کھانا کھایا۔ جناب موسیٰ کے سامنے وہ ابر میں سے مخاطب ہوا۔ آخری دور کے انبیاء کے پاس فرشتہ خدا کا کلام لاتا ہے۔ دانی ایل کے پاس جبرائیل فرشتہ آیا۔

"کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے کوئی انسان صورت کھڑا ہے اور مَیں نے اولائی میں
سے آدمی کی آواز سُنی جس نے بلند آواز سے کہا کہ جبرائیل اس شخص کو اس رویا کے معنی سمجھا
دے۔ چنانچہ وہ جہاں مَیں کھڑا تھا نزدیک آیا اور اُس کے آنے سے مَیں ڈر گیا اور مُنہ
کے بل گر پڑا پر اُس نے مجھ سے کہا اے آدم زاد! سمجھ لے کہ یہ رویا آخری زمانے
کی بابت ہے اور جب وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا مَیں گہری نیند میں مُنہ کے بل زمین پر

---

[1] حزقی ایل [2] یرمیاہ [3] سلاطین

پڑا تھا لیکن اُس نے مجھے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا.... میں رویا میں یہ کہہ ہی رہا تھا
کہ وہی شخص جبرائیل جسے میں نے شروع میں رویا میں دیکھا تھا حکم کے مطابق تیز پرواز
کرتا ہوا آیا اور شام کی قربانی گذارنے کے وقت کے قریب مجھے چھُوا اور اُس نے
مجھے سمجھایا اور مجھ سے باتیں کیں۔"

دانی ایل کے پاس میکائیل کے آنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

"پھر میکائیل جو مقرب فرشتوں میں سے میری مدد کو پہنچا اور میں شاہان فارس کے
پاس رُکا رہا۔"

بعض اوقات حالتِ رویا میں مکاشفہ کی صورت میں خدا اور نبی میں رابطہ قائم ہو جاتا

"میں نے رات کو رویا میں دیکھا کہ ایک شخص سرنگ گھوڑے پر سوار مہندی کے
درختوں کے درمیان نشیب میں کھڑا تھا اور اُس کے پیچھے سرنگ اور کمیت اور نقرہ
گھوڑے تھے۔ تب میں نے کہا اے میرے آقا یہ کیا ہیں اِس پر فرشتہ نے جو مجھ سے
گفتگو کرتا تھا، کہا کہ میں تجھے دکھاؤں گا کہ یہ کیا ہیں۔"

خواب کی تعبیر بھی لازمۂ نبوت سمجھی جاتی تھی۔ جناب یوسف نے فرعون کے نانبائی اور ساقی کے خوابوں
کی ترجمانی کی تھی۔ اِسی طرح دانی ایل نے شاہ نبوکدنضر کے خواب کی تعبیر بیان کر کے اُسے حیرت زدہ کر
دیا تھا۔ جناب یعقوب کا خواب مشہور ہے۔

"اُس نے اُس جگہ کے پتھروں میں سے ایک اُٹھا کر اپنے سرہانے دھر لیا اور اُسی جگہ
سونے کو لیٹ گیا اور خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیڑھی زمین پر کھڑی ہے اور
اُس کا سرا آسمان تک پہنچا ہوا ہے اور خدا کے فرشتے اُس پر سے چڑھتے اُترتے ہیں
اور خدا اُس کے اوپر کھڑا کہہ رہا ہے کہ میں خداوند تیرے باپ ابرہام کا خدا اور اضحاق
کا خدا ہوں۔ یہ زمین جس پر تو لیٹا ہے تجھے اور تیری نسل کو دوں گا۔[1]

---

[1] پیدائش

بعض اوقات خداوند خدا کی رُوح انسانوں میں حلول کر جاتی ہے اور وہ نبوّت کرنے لگتے ہیں۔

"تب خداوند ابر میں ہو کر اُترا اور اُس نے موسیٰ سے باتیں کیں اور اُس رُوح میں سے جو اُس میں تھی کچھ لے کر اُسے اُن ستّر بزرگوں میں ڈالا چنانچہ جب رُوح اُن میں آ گئی تو وہ نبوّت کرنے لگے" ؎

انبیاء کو نشانیاں یا معجزات بھی دیئے گئے تاکہ مُنکرین کو قائل کر سکیں۔ جناب موسیٰ، الیشع، ایلیاہ، یشوع وغیرہ نبیوں کے معجزات کا ذکر تفصیل سے عہد نامۂ قدیم میں ملتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ نبوّت غیب بینی ہی کی ایک صورت تھی جو بنی اسرائیل کے علاوہ بعل کے کاہن بھی کیا کرتے تھے

"نبیوں نے بعل کے نام سے نبوّت کی"

اِن میں سے بعض فال گیر تھے جو مستی، بے خودی کی حالت میں کاہنوں کی طرح پیش گوئیاں کیا کرتے تھے۔ یرمیاہ نے حقارت سے کہا تھا

"بعض پاگل آدمی اپنے آپ کو نبی ظاہر کرتے ہیں۔"

انبیاء میں بعض گوشہ نشیں عابد تھے جیسے ایلیاہ، بعض مجرّد تھے اور کچھ شادی شُدہ عیال دار تھے۔ اِن میں کئی نبی عوامی اخلاق کے محافظ تھے اور محتسب کا فرض انجام دیتے تھے؛ کچھ خطیب تھے جو اپنی آتش بیانی سے عوام میں آگ لگا دیتے تھے۔ ناتن اور یاہو نے سیاسیات میں عملی حصہ لیا تھا۔ یہ انبیاء پیش گوئی کرنے کے بجائے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ وہ اُمراء کے جبر و تشدد کے خلاف احتجاج کرتے اور مساکین کی حمایت میں سرگرمی دکھاتے تھے۔ بعض انبیاء مردِ میدان تھے اور سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے تھے۔

شریعت شریعتِ موسوی کو احکامِ عشرہ بھی کہتے ہیں۔ یہ احکام اُن الواح پر کندہ تھے جو سینا کے پہاڑ پر یہوواہ نے جناب موسیٰ کو دی تھیں۔ عہد نامۂ قدیم میں اِن کی تفصیل دی گئی ہے۔

؎ گنتی

دس احکام درج ذیل ہیں۔

(۱)۔۔۔۔ میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا

(۲)۔۔۔۔ تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے تو اُن کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ اُن کی عبادت کرنا کیوں کہ میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں اور جو مجھ سے عداوت رکھتے ہیں اُن کی اولاد کو تیسری اور چوتھی پشت تک، باپ دادا کی بدکاری کی سزا دیتا ہوں اور ہزاروں پر جو مجھ سے محبت رکھتے اور میرے حکموں کو مانتے ہیں رحم کرتا ہوں۔

(۳)۔۔۔۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ نہ لینا کیوں کہ جو اُس کا نام بے فائدہ لیتا ہے خداوند اُسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔

(۴)۔۔۔۔ یاد کر کے تو سبت کا دن پاک ماننا۔ چھ دن تک تو محنت کر کے اپنا سارا کام کاج کرنا لیکن ساتواں دن خداوند تیرے خدا کا سبت ہے اُس میں نہ تو کوئی کام کرے نہ تیرا بیٹا نہ تیری بیٹی نہ تیری لونڈی نہ تیرا چوپایہ نہ کوئی مسافر جو تیرے ہاں پھاٹکوں کے اندر ہو کیوں کہ خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین اور سمندر اور جو کچھ اِن میں ہے وہ سب بنایا اور ساتویں دن آرام کیا اس لئے خداوند نے سبت کے دن کو برکت دی اُسے مقدس ٹھہرایا۔

(۵)۔۔۔۔ تو اپنے باپ اور ماں کی عزت کرنا تاکہ تیری عمر اُس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھے دے دراز ہو۔

(۶)۔۔۔۔ تو خون نہ کرنا۔

(۷)۔۔۔۔ تو زنا نہ کرنا۔

(۸)۔۔۔۔ تو چوری نہ کرنا۔

(۹)۔۔۔۔ تو اپنے پڑوسیوں کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا

(۱۰)۔۔۔۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کرنا۔ تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا اور نہ اُس کے

غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور نہ اپنے پڑوسی کی کسی اور چیز کا لالچ کرنا۔

بنی اسرائیل کی فقہ، قانون، جرم و سزا، الٰہیات وغیرہ اُنہی احکام پر مبنی ہے۔ بنی اسرائیل کا قانون شرعی ہے اور اس کی بنیاد قصاص پر رکھی گئی ہے۔

"اگر نقصان ہو جائے تو تو جان کے بدلے جان لے اور آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔"

شرک، ارتداد، ماں باپ کی نافرمانی، چوری، اغوا، زنا، اغلام، جانور سے جفتی، اولاد کو مولک دیوتا کی نذر کرنا، محرمات کی بے حرمتی سنگین جرائم ہیں اور ان کی سزا موت ہے۔ جادوگرنی کو زندہ جلانے کا حکم ہے اور جس جانور سے جفتی کی جائے اُسے بھی مارنے کا حکم ہے۔ سزا دینے میں یہوواہ بڑا سخت گیر ہے۔

"وہ مجرموں کو ہرگز ہرگز بری نہیں کرے گا بلکہ باپ دادا کے گناہ کی سزا اُن کے بیٹوں اور پوتوں کو تیسری اور چوتھی پشت تک دیتا ہے۔"

شریعتِ موسوی میں کنبے اور ذاتی املاک کے تحفظ کا اہتمام کیا گیا ہے۔ قاتل سے دیت لینا بھی ممنوع ہے۔

"اگر کوئی کسی کو مار ڈالے تو قاتل گواہوں کی شہادت پر قتل کیا جائے پر ایک گواہ کی شہادت سے کوئی نہ مارا جائے اور تم اُس قاتل سے جو واجب القتل ہو دیت نہ لینا بلکہ وہ ضرور ہی مارا جائے۔" [1]

ماں باپ کے احترام پر اصرارِ بلیغ کیا گیا ہے اور ماں باپ سے سرکشی کی سزا موت ہے۔

"اگر کسی آدمی کا ضدی اور سرکش بیٹا ہو جو اپنے باپ یا ماں کی بات نہ مانتا ہو اور اُن کی تنبیہ کرنے پر بھی اُن کی نہ سنتا ہو تو اُس کے ماں باپ اُسے پکڑ کر اور نکال کر اُس

---

[1] گنتی

شہر کے بزرگوں کے پاس اُس جگہ کے پھاٹک پر لے جائیں اور وہ اُس شہر کے
بزرگوں سے عرض کریں کہ یہ ہمارا بیٹا ضدی اور گردن کش ہے، ہماری بات نہیں
مانتا اور اُڑاؤ اور شرابی ہے تب اُس کے شہر کے سب لوگ اُسے سنگسار کریں کہ
وہ مر جائے یوں تو ایسی بُرائی کو اپنے درمیان سے دُور کرنا۔"[1]

زنائے محصنہ کی سزا موت ہے اور زنا بالجبر کی صورت میں صرف زانی کو مارنے کا حکم ہے لیکن کنواری لڑکی سے جس کی کسی سے نسبت نہ ہوئی ہو زنا کرنے کی سزا مختلف ہے۔

"اگر کسی آدمی کو کوئی کنواری لڑکی مل جائے جس کی نسبت نہ ہوئی ہو اور وہ اُسے
پکڑ کر اُس سے صحبت کرے اور دونوں پکڑے جائیں تو وہ مرد جس نے اُس سے
صحبت کی ہو لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال دے اور وہ لڑکی اُس کی بیوی بنے کیونکہ
اُس نے اُسے بے حرمت کیا اور وہ اپنی زندگی بھر طلاق نہ دینے پائے۔"

یہ عمر قید بعض حالات میں سنگساری سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتی ہوگی۔ چور سیندھ مارتا ہوا پکڑا جائے اور اُس کی اِس قدر پٹائی ہو کہ وہ مر جائے تو یہ کوئی جرم نہیں۔ سبت کو توڑنا بھی سنگین جرم ہے اور اِس کی سزا موت ہے۔ جناب موسیٰ نے ایک شخص کو سبت کے دن لکڑیاں چُنتے ہوئے پکڑ لیا اور اُسے سنگسار کرا دیا۔

یہودی سبت کا اِس قدر احترام کرتے تھے کہ کسی نے رومی جرنیل پومپے کو بتلایا کہ یہودی سبت کے دن ہتھیار نہیں اُٹھاتے۔ اُس نے سبت کے روز حملہ کر دیا۔ بنی اسرائیل چُپ چاپ بیٹھے عبادت کرتے رہے اور رومیوں نے انہیں گاجر مُولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ بارہ ہزار یہودی جنگجو لقمۂ شمشیر ہوئے لیکن انہوں نے اُنگلی تک نہیں ہلائی۔ اِس سے پہلے بار ہا رومیوں کے حملوں کو اپنی شجاعت سے پسپا کر دیا تھا۔

شریعتِ موسوی میں غسلِ جنابت کا حکم ہے۔ حائضہ سات روز تک ناپاک رہتی ہے اور جو

---

[1] اِستثناء

کوئی چھوتا ہے وہ شام تک ناپاک رہتا ہے۔ حیض و نفاس کی حالت میں مقدس میں داخل ہونا منع ہے۔

حرام حلال کے احکام تفصیل سے دیئے گئے ہیں۔ خون حرام ہے کیوں کہ یہ زندگی کی علامت ہے۔ اِسے کھانا گویا کسی ذی حیات کو کھانا ہے۔

"تو خون کو نہ کھانا کیونکہ خون ہی تو جان ہے۔ سو تو گوشت کے ساتھ جان کو ہرگز نہ کھانا۔"

مُردار کا کھانا حرام ہے۔ چوپایوں میں جن کے پاؤں چِرے ہوئے ہوں اور وہ جگالی بھی کرتے ہوں اُن کا کھانا حلال ہے لیکن اونٹ اور خرگوش حرام ہیں کیوں کہ یہ جگالی تو کرتے ہیں لیکن ان کے پاؤں چِرے ہوئے نہیں ہیں۔ سوّر اس لئے حرام ہے کہ اُس کے پاؤں تو چِرے ہوئے ہیں مگر وہ جگالی نہیں کرتا۔ آبی جانوروں میں جن کے پَر اور چھلکے ہوں وہ حلال ہیں۔ پَردار رینگنے والے جانور حرام ہیں۔

قُربانی صرف مقدس میں دی جا سکتی ہے۔ مذبح پر سوختنی قربانی دینے کا حُکم ہے۔ سلامتی کے ذبیحہ میں انتڑیوں سے لگی ہوئی چربی مذبح پر جلانے کا حُکم ہے، باقی گوشت کاہنوں کا حق ہے۔ قُربانی کے جانور کے لئے بے عیب ہونا ضروری ہے۔ خطا کی قربانیاں، نذر کی قربانیاں اور جُرم کی قربانیاں بھی دی جاتی ہیں۔

یہودیوں کے شعائر میں ختنہ بڑا اہم ہے

"میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد کی نسل کے درمیان ہے اور جسے تُم مانو گے سو یہ ہے کہ تُم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے .....

یہ اُس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔"

جناب ابرہام ننانوے برس کے تھے جب اُن کا ختنہ ہوا۔ اسمٰعیل کا ختنہ تیرہ برس کی عمر میں ہوا بنی اسرائیل غیر اقوام کو حقارت سے نامختون کہتے تھے اور اُنہیں اپنی بیٹیاں نہیں دیتے تھے۔ اُن کا داخلہ مقدس میں ممنوع تھا

"کوئی نامختون میرے مقدس میں داخل نہ ہوگا۔"

پال ولی نے شریعت موسوی کے ساتھ سبت اور ختنہ کو بھی منسوخ کر دیا تاکہ غیر یہود اقوام عیسائیت قبول کر لیں۔

بنی اسرائیل نے کم و بیش اسّی برس اسیریٔ بابل میں گذارے تھے۔ اس دوران میں ان کے مذہب پر گہرے اثرات مرتّب ہوئے۔ محققّین اہل مغرب کے خیال میں یہودیوں کی الٰہیات میں ثنویّت کا تصوّر مجوسی روایات سے ماخوذ ہے۔ اسیری سے پہلے وہ شیطان کے وجود کے قائل نہیں تھے اور خیر و شر دونوں کو یہوواہ سے منسوب کرتے تھے۔ مجوسیت میں اہورا مزدا خیر کا نمائندہ ہے اور اہرمن شر کا مبدا ہے۔ یہودیوں نے اہرمن کو شیطان کا نام دیا جس کا معنیٰ باغی اور سرکش کا ہے۔ اس کے علاوہ وقت کے حقیقی ہونے اور خطِ مستقیم پر حرکت کرنے کا نظریہ بھی مجوسیت سے یہودیت میں آیا ہے۔ اس کی رو سے کائنات کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی ہوگا۔ ایامِ اسیری سے پہلے یہودی اسی دنیا میں نیکی کا اجر پانے اور برائی کی پاداش بھگتنے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ مجوسیت سے انہوں نے جنّت اور دوزخ کی اساطیر مستعار لیں۔ چنانچہ تالمد میں نعیم جنّت اور عذاب جہنّم کی تفصیل دی گئی ہے۔ جہنم کا لفظ اصل میں جی ہنوّم (وادیٔ ہنوّم) تھا جہاں مولک دیوتا کا مندر تھا۔ یہودیوں نے اسے مسمار کر کے وہاں کوڑا کرکٹ پھینکنا شروع کر دیا جس میں آگ سلگتی رہتی تھی۔ قیامت اور حشر نشر کے عقائد بھی بابل سے آئے ان کی جھلک جا بجا عہد نامۂ قدیم میں دکھائی دیتی ہے۔

"آسمان طومار کی مانند لپیٹے جائیں گے اور ان کی تمام افواج تاک اور انجیر کے مرجھائے ہوئے پتوّں کی مانند گر جائیں گی۔"

"آسمان دھوئیں کی مانند غائب ہو جائیں گے اور زمین پڑے کپڑے کی طرح پرانی ہو جائے گی اور اس کے باشندے مچھروں کی طرح مر جائیں گے۔"

"اس سے پیشتر کہ خداوند کا خوفناک روزِ عظیم آئے آفتاب سب تاریک اور مہتاب خون ہو جائے گا اور جو کوئی خداوند کا نام لے گا نجات پائے گا۔"

اسی طرح جنّتِ عدن کی روایت بابلی ہے۔ یہ روایت مختلف صورتوں میں مصر، ایران، ہند اور

یونان کی دیومالا میں بھی ملتی ہے۔ اس میں ایک سانپ ہے جو حوا کو بہکا کر اُسے اور آدم کو شجر ممنوعہ کھلاتا ہے۔ عالمگیر سیلاب کا اسطور سُمیریا اور بابل سے لیا گیا ہے۔ بابل میں نوح کا نام شمش پنشتم ہے۔ وہ تمام جانوروں کو اپنی کشتی میں پناہ دے کر فنا سے بچا لیتا ہے۔ اسیریٔ بابل کے دوران میں یہودیوں نے مسیحائے منتظر کا تصوّر اپنے مذہب میں شامل کیا۔ مجوسی شاہ بہرام کے منتظر ہیں جو ظاہر ہو کر انہیں غیر اقوام پر فتحیاب کرے گا۔ یہودیوں نے اسے داؤد کی نسل کا ایک بادشاہ بنا دیا جو اُن کے دشمنوں کو غارت کرنے کے لئے نمودار ہوگا۔ وہ اسے ابن اللہ کہنے لگے۔ فرشتوں (لغوی معنی بھیجے ہوئے فارسی کا لفظ ہے) کا تصوّر مجوسیوں سے لیا گیا۔ فرشتے وہ نوری پیکر تھے جو اہورا مزدا کے پیغامات زردشت پر لاتے تھے۔ عبرانی کے لفظ ملاک کا معنی بھی ہے پیغام لانے والے۔ یہودیوں میں سات فرشتے تسلیم کئے گئے جن میں جبرائیل اور میکائیل بھی تھے۔ عبرانی میں جبرائیل کا معنیٰ ہے "خدا کی قدرت"۔ فرشتوں کے علاوہ یہودی کروبیّوں کو مانتے تھے جو ایک قسم کے انسان نما حیوان تھے اور جن کے اعضاء اور صورت شکل شیر، بیل وغیرہ سے مرکّب تھی۔ عہد نامہ عزازیل اور بعل زبوب کا ذکر بھی آیا ہے جن پر بعض جاہل یہودی قربانیاں کرتے تھے۔

علم و ادب: کنعانی جن کے مُلک کو بنی اسرائیل نے فتح کیا حروف ابجد کے موجد تھے اُن کے ترتیب دیئے ہوئے یہ حروف سُمیریا کی پیکانی علامات کے ساتھ بابل میں رواج پا گئے۔ بابل سے یہ حروف تاجروں کی وساطت سے مشرق و مغرب کے اکثر متمدّن ممالک میں شائع ہو گئے۔ بنی اسرائیل نے بابلیوں ہی سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا چنانچہ دوسری سامی زبانوں کی طرح عبرانی بھی کنعانی حروف ابجد میں لکھی جاتی تھی۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ عبرانی میں کلدانی، ارامی، سریانی اور حبشہ کی تراکیب بھی شامل ہو گئیں۔ علمائے مغرب کے خیال میں تورات ۵۰۰ ق م میں لکھی گئی تھی۔ عہد نامہ قدیم کے پہلے پانچ صحیفوں کو یہودی تورات یا قانون کہتے ہیں۔ یہ پانچ صحیفے ہیں: پیدائش، خروج، احبار، گنتی اور استثناء۔ موجودہ عہد نامے میں انتالیس کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ جو صحیفے ہیں انہیں اصلاح یافتہ کلیسیا نے جعلی قرار دیا ہے۔ زبور جناب داؤد سے منسوب ہے لیکن فی الاصل یہ ایام اسیری میں

لکھی گئی تھی۔ یہی کیفیت کتاب ایوب کی جس میں گہری قنوطیت پائی جاتی ہے۔ظاہراً یہ بھی قید بابل کی یادگار ہے جب بنی اسرائیل کو اپنی بدبختی اور زبوں حالی کا تلخ احساس تھا۔ امثال، واعظ اور غزل الغزلات معاصر اقوام کنعانیوں، مصریوں وغیرہ کی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ تورات کا ایک نسخہ ہیکل میں رہتا تھا جہاں ہر ساتویں برس اسے پڑھ کر لوگوں کو سنایا جاتا تھا۔ ہیکل کئی بار لٹا اور برباد ہوا اور اس کے ساتھ تورات کے اوراق بھی پریشاں اور منتشر ہوتے رہے۔ قید بابل سے رہائی کے بعد یہودی احبار نے بڑی کاوش سے اِدھر اُدھر سے اوراق جمع کر کے از سرِ نو تورات مرتب کی۔ اس بنا پر بعض علما کہتے ہیں کہ تورات میں بہت کچھ تحریف ہوئی ہے اور اس کے بعض حصے الحاقی ہیں۔ مسلمانوں میں امام بخاری اور سر سید احمد تحریف کے قائل نہیں ہیں۔ دوسری مشہور کتاب تالمد ہے جسے روایات اور احادیث کا مجموعہ سمجھا جا سکتا ہے۔

عہد نامۂ قدیم ادب و حکمت کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اُردو ترجمہ کرنے والوں نے جی تھم تو۔ دیا ہے۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اُردو کے جس طالب علم نے عہد نامۂ قدیم اور محمد حسین آزاد کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا وہ اُردو زبان کی لطافتوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ عہد نامۂ قدیم صنمیات، علم الانسان، لوک ورثے، تقابلی مذہب، تاریخ و سیر، پند و موعظت اور دانش و خرد کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ اس کے جملے ضرب الامثال بن کر مغربی زبانوں میں رواج پا گئے ہیں۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

"انہوں نے ہوا بوئی وہ گرد باد کاٹیں گے۔"

"ہمسایہ جو نزدیک ہو اُس بھائی سے بہتر ہے جو دُور ہو۔"

"انسان کے لیے اس سے بہتر کچھ نہیں کہ وہ کھائے پیئے اور مزے کرے۔"

"جو اپنی چھڑی کو بچائے رکھتا ہے وہ اپنے بیٹے سے کینہ رکھتا ہے۔"

لطافتِ بیان کے چند نمونے۔

"جو خدا کے خوف کے ساتھ حکومت کرتا ہے
وہ صبح کی روشنی کی مانند ہوگا جب سورج نکلتا ہے

ایسی صبح جس میں بادل نہ ہوں
جب نرم نرم گھاس زمین میں سے
بارش کے بعد کی چمک دمک کے باعث نکلتی ہو"
"تجھے اِس مَسلے ہوئے سرکنڈے کے عصا یعنی مصر پر بھروسہ ہے۔"
"میں نے اُن کو کوٹ کوٹ کر زمین کی گرد کی مانند کر دیا
میں نے اُن کو گلی کوچوں کی کیچڑ کی طرح روند روند کر چاروں طرف پھیلا دیا۔"
"تو پوری عُمر میں اپنی قبر میں جائے گا
جیسے اناج کے پُولے اپنے وقت پر جمع کئے جاتے ہیں
جیسے بادل پھٹ کر غائب ہو جاتا ہے
ویسے ہی وہ جو قبر میں اُترتا ہے پھر کبھی اوپر نہیں آتا۔"
"میں مُردے کی مانند دل سے بھُلا دیا گیا ہوں
میں ٹوٹے ہوئے برتن کی مانند ہوں۔"
"انسان کی عُمر تو گھاس کی مانند ہے
وہ جنگلی پھول کی طرح کھِلتا ہے
کہ ہوا اُس پر چلی اور وہ نہیں
اور اُس کی جگہ اُسے پھر نہ دیکھے گی۔"
"بیگانہ عورت کے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے اور اُس کا مُنہ تیل سے زیادہ چکنا ہے
پر اُس کا انجام ناگدونے کی مانند تلخ اور دو دھاری تلوار کی مانند تیز ہے۔"
"دانا ملامت کرنے والے کی بات سُننے والے کے کان میں
سونے کی بالی اور کُندن کا زیور ہے۔"

غزل الغزلات شاعری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اِس قدیم عشقیہ نظم کو جناب سلیمان سے منسوب کیا جاتا ہے۔

یہ نظم ایک حسین دوشیزہ سے متعلق ہے جو پہاڑ کے دامن میں بھیڑیں چرایا کرتی تھی اور ایک چرواہے پر دل وجان سے فدا تھی۔ ایک دن بادشاہ نے اُسے دیکھ لیا اور اُس کے تیرِ نگاہ کا گھائل ہو گیا۔ وہ اُسے اپنے محل لے گیا۔ بادشاہ نے اُسے آرام و آسائش کے سارے سامان مہیا کر دیئے لیکن چرواہی کے دل سے اپنے محبوب کی یاد محو نہ ہو سکی۔ وہ اُس کی یاد میں مگن رہتی اور عالمِ تصوّر میں اُسے اپنے بازوؤں میں لپٹا ہوا محسوس کرتی اور اُس سے باتیں کیا کرتی۔ غزل الغزلات میں جس والہانہ شیفتگی اور جوشِ جذبہ کا اظہار بے ساختہ کیا گیا ہے دُنیائے ادب میں اُس کا جواب سیفو کی نظمیں اور خواجہ غلام فرید کی کافیاں ہی پیش کر سکتی ہیں۔ جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"میرا محبوب میرے لیئے دستۂ مُر ہے
جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے .....
دیکھ تو خُوبرو ہے۔ اے میری پیاری دیکھ تو خُوبصورت ہے
تیری آنکھیں دو کبوتر ہیں .....
میں شارون کی نرگس
اور وادیوں کی سوسن ہوں
جیسی سوسن جھاڑیوں میں
ایسی ہی میری محبوبہ کنواریوں میں ہے۔
جیسا سیب کا درخت بن کے درختوں میں
ایسا ہی میرا محبوب نوجوانوں میں ہے .....
کشمش سے مجھے قرار دو، سیبوں سے مجھے تازہ دم کرو
کیوں کہ میں عشق کی بیمار ہوں
اُس کا بایاں ہاتھ میرے سر کے نیچے ہے
اور اُس کا دھنا ہاتھ مجھے گلے سے لگاتا ہے .....

تیری کنپٹیاں تیرے نقاب کے نیچے
انار کے دو ٹکڑوں کی مانند ہیں
تیری گردن داؤد کا بُرج ہے جو سلاح خانے کے لئے بنا.....
تیری دونوں چھاتیاں دو توام آہو بچے ہیں
جو سوسنوں میں چرتے ہیں.....
اے میری پیاری! میری زوجہ تیرا عشق کیا خوب ہے
تیری محبت مے سے زیادہ لذیذ ہے
اور تیرے عطروں کی مہک ہر طرح کی خوشبو سے بڑھ کر ہے۔
اے میری زوجہ! تیرے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے.....
تیرا پیٹ گیہوں کا انبار ہے
جس کے گرداگرد سوسن ہوں.....
تیری گردن ہاتھی دانت کا بُرج ہے
یہ تیری قامت کھجور کے مانند ہے
اور تیری چھاتیاں انگور کے گچھے ہیں.....
نگین کی مانند مجھے اپنے دل میں لگا رکھ اور تعویذ کی مانند اپنے بازو پر
کیوں کہ عشق موت کی مانند زبردست ہے۔"

بنی اسرائیل قیدِ بابل میں وطنِ عزیز کو یاد کر کر خون کے آنسو روتے تھے۔ اِس حسرت ناک کیفیت کا اظہار ایک نظم میں اِس طرح ہوا ہے۔

"ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے
اور صیون کو یاد کر کے روئے
وہاں بید کے درختوں پر اُن کے وسط میں
ہم نے اپنے ستاروں کو ٹانگ دیا

کیوں کہ وہاں ہم کو اسیر کرنے والوں نے گیت گانے کا حکم دیا
اور تباہ کرنے والوں نے خوشی کا
اور کہا صیون کے گیتوں میں سے ہم کو کوئی گیت سناؤ
ہم پردیس میں
خداوند کا گیت کیسے گائیں
اے یروشلیم! اگر میں تجھے بھولوں
تو میرا دھنا ہاتھ اپنا ہنر بھول جائے
اگر میں تجھے یاد نہ رکھوں
اگر میں یروشلیم کو
اپنی بڑی سے بڑی خوشی پر ترجیح نہ دوں
تو میری زبان میرے تالو سے چپک جائے"[1]
عقل و خرد کا ذکر جا بجا ستائش سے کیا گیا ہے
"لیکن حکمت کہاں ملے گی
اور خرد کی جگہ کہاں ہے؟...
نہ وہ سونے کے بدلے مل سکتی ہے
نہ چاندی اس کی قیمت میں تُلے گی
اور نہ قیمتی سلیمانی پتھر یا نیلم
بلکہ حکمت کی قیمت مرجان سے بڑھ کر ہے
نہ کوش کا پکھراج اس کے برابر ٹھہرے گا
نہ چوکھا سونا اس کا مول ہو گا۔"[2]

---

[1] زبور [2] نوحہ ایوب

— "انسان کی حکمت اُس کے چہرے کو روشن کرتی ہے اور اُس کے چہرے کی سختی اِس سے بدل جاتی ہے۔"

— "حد سے زیادہ نیکوکار نہ ہو اور حکمت میں اعتدال سے باہر نہ جا۔"

— "صاحبِ علم کم گو ہے اور صاحبِ فہم متین ہے، احمق بھی جب تک خاموش ہے عقلمند گنا جاتا ہے۔"

— "کنگال سے اُس کا ہمسایہ بھی بیزار ہے پر مال دار کو دوست بہت ہیں۔"

— "اگرچہ تو احمق کو اناج کے ساتھ اوکھلی میں ڈال کر موسل سے کوٹے تو بھی اُس کی حماقت اُس سے کبھی جُدا نہ ہو گی۔"

— "زر دوست روپیہ سے آسودہ نہ ہو گا اور دولت کا چاہنے والا اُس کے بڑھنے سے سیر نہ ہو گا۔"

— "حکمت سے کہہ تو میری بہن ہے اور فہم کو اپنا رشتہ دار قرار دے۔"

— "جوانی کے فرزند ایسے ہیں جیسے زبردست کے ہاتھ میں تیر۔"

محنت کش طبقے کے افراد محتاجوں اور مساکین سے ہمدردی اور دلسوزی کا اظہار ایسے موثر پیرائے میں کیا گیا ہے کہ کوئی اشتراکی بھی کیا کرے گا۔

(۱)—— زمین کے غریب اکھٹے چھپتے ہیں

دیکھو! وہ بیابان کے گورخروں کی طرح اپنے کام کو جاتے

اور مشقت اُٹھا کر خوراک ڈھونڈھتے ہیں

بیابان اُن کے بچوں کے لئے خوراک بہم پہنچاتا ہے

وہ کھیت میں اپنا چارہ کاٹتے ہیں

اور شریروں کے انگور کی خوشہ چینی کرتے ہیں

ساری رات بے کپڑے ننگے پڑے رہتے ہیں

اور جاڑوں میں اُن کے پاس کوئی اوڑھنا نہیں ہوتا
وہ پہاڑوں کی بارش سے بھیگے رہتے ہیں
اور کسی آڑ کے نہ ہونے سے چٹان سے لپٹ جاتے ہیں
ایسے لوگ بھی ہیں جو یتیم کو چھاتی پر سے ہٹا لیتے ہیں
اور غریبوں سے گِرو لیتے ہیں
سو وہ بے کپڑے ننگے پھرتے
اور بھُوک کے مارے پولیاں ڈھونڈتے ہیں
وہ اُن لوگوں کے احاطوں میں تیل نکالتے ہیں
وہ اُن کے کُنڈوں میں انگور روندتے اور پیاسے رہتے ہیں۔

(۲)——— شریر کیوں جیتے رہتے
عُمر رسیدہ ہوتے بلکہ قوّت میں زبردست ہوتے ہیں؟
اُن کی اولاد اُن کے ساتھ اُن کے دیکھتے دیکھتے
اور اُن کی نسل اُن کی آنکھوں کے سامنے قائم ہو جاتی ہے
اُن کے گھر ڈر سے محفوظ ہیں
اور خُدا کی چھڑی اُن پر نہیں ہے
اُن کی گائے بیاتی ہے اور اپنا بچہ نہیں گراتی
وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو ریوڑ کی طرح باہر بھیجتے ہیں
اور اُن کی اولاد ناچتی ہے
وہ خنجری اور ستار کی تال پر گاتے
اور بانسلی کی آواز سے خوش ہوتے ہیں
وہ خوشحالی میں اپنے دِن کاٹتے ہیں

اور دم کے دم میں پاتال میں اُتر جاتے ہیں
حالاں کہ انہوں نے خُدا سے کہا تھا کہ ہمارے پاس سے چلا جا
کیوں کہ ہم تیری راہوں کی معرفت کے خواہاں نہیں
قادرِ مطلق ہے کیا کہ ہم اُس کی عبادت کریں ؟
اور اگر ہم اُس سے دُعا کریں تو ہمیں کیا فائدہ ہوگا ؟

(۳)___ راست اور کامل آدمی ہنسی کا نشانہ ہوتا ہی ہے
ڈاکوؤں کے ڈیرے سلامت رہتے ہیں
اور جو خُدا کو غُصّہ دلاتے ہیں وہ محفوظ رہتے ہیں
اُن ہی کے ہاتھ کو خُدا خوب بھرتا ہے ۔

(۴)___ تب میں نے پھر کر اُس تمام ظُلم پر جو دنیا میں ہوتا ہے نظر کی
اور مظلوموں کے آنسوؤں کو دیکھا اور اُن کو تسلّی دینے والا کوئی نہ تھا
اور اُن پر ظُلم کرنے والے زبردست تھے پر اُن کو تسلّی دینے والا کوئی نہ تھا۔[1]

تحقیقی علوم میں بنی اسرائیل نے علمِ طب میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ یہودی اطباء کے خیال میں مرض کا اصل سبب گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گنہگار کبھی صحت مند نہیں رہ سکتا۔ وہ گناہ اور مرض کے درمیان گہرے ربط و تعلق کے قائل تھے۔ ربّی یوناتن کا قول ہے

"اگر کسی مرض کا ظہور حسبِ ذیل سات اسباب میں سے سب یا چند کسی ایک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ (۱) غیبت یا گالی گلوچ (۲) خونریزی (۳) جھوٹی قسم (۴) بے عصمتی اور شرپسندی (۵) غرور (۶) چوری (۷) حسد۔ ضروری ہے کہ جب کوئی شخص بیمار پڑے تو ان اسباب میں سے کوئی سبب موجود ہو۔"[2]

معاشرہ بنی اسرائیل کی مملکت مذہبی تھی جس میں کاہن خدا کی طرف سے حکومت کرتے

---

[1] واعظ [2] العلاج النفسانی ، حامد عبدالقادر مصری

تھے۔ قوانین شرعی تھے اور صدقہ، عشر اور زکوٰۃ مذہبی محصول تھے جو کنعانیوں سے ماخوذ تھے۔ کنعانی یہ محصول اپنے کاہنوں کی مدد معاش کے لئے دیتے تھے۔ لوگوں کے عام اخلاق اور طرزِ عمل کے متعلق شریعتِ موسوی میں نہایت تفصیل کے ساتھ احکام دیئے گئے تھے جن سے انحراف کرنا گناہ تھا۔ روزمرہ کی پیش پا افتادہ باتوں کے متعلق بھی واضح ہدایات موجود تھیں

"تو بیل اور گدھے ایک ساتھ جوت کر ہل نہ چلانا۔"

"تو اپنے اوڑھنے کی چادر کے کناروں پر جھالر لگایا کرنا۔"

"جب تو اپنا گھر بنائے تو اپنی چھت پر منڈیر ضرور لگانا۔"

"تو اپنے تاکستان میں دو قسم کے بیج نہ بونا۔"

زمین خدا کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔

"زمین ہمیشہ کے لئے نہ بیچی جائے کیونکہ زمین میری ہے اور تم میرے مسافر اور مہمان ہو۔" [1]

لین دین میں دیانت داری اور معاملات میں عدل و انصاف کی تلقین کی گئی تھی اور مفلسوں اور محتاجوں سے حسنِ سلوک کی ہدایت دی گئی تھی۔

"میں تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ تو اپنے ملک میں اپنے بھائی یعنی کنگالوں اور محتاجوں کے لئے اپنی مٹھی کھلی رکھنا۔" [2]

"مزدور کی مزدوری تیرے پاس ساری رات صبح تک نہ رہنے پائے۔"

"تو بہرے کو نہ کوسنا اور نہ اندھے کے آگے ٹھوکر کھانے کی چیز کو رکھنا۔"

"تو فیصلہ میں ناراستی نہ کرنا نہ تو تو غریب کی رعایت کرنا اور نہ بڑے آدمی کا لحاظ۔"

"تم انصاف اور پیمائش اور وزن اور پیمانہ میں ناراستی نہ کرنا، ٹھیک ترازو اور ٹھیک باٹ رکھنا۔"

---

[1] احبار [2] استثناء

"جب تم اپنی زمین کی پیداوار کی فصل کاٹو تو تو اپنے کھیت کے کونے کونے تک پورا پورا نہ کاٹنا اور کٹائی کی گری پڑی بالوں کو نہ چن لینا اور تو اپنے انگورستان کا دانہ دانہ نہ توڑ لینا اور نہ اپنے انگورستان کے گرے ہوئے دانوں کو جمع کرنا ان کو غریبوں اور مسافروں کے لئے چھوڑ دینا۔"

"اگر تیرا کوئی بھائی مفلس ہو جائے اور وہ تیرے سامنے تنگدست ہو تو اُسے سنبھالنا وہ پردیسی اور مسافر کی طرح تیرے ساتھ رہے۔" [1]

یہودیوں کا معاشرہ اخوت اور مساوات پر مبنی تھا۔ طبقاتی تفریق موجود تھی لیکن مفلسوں کی دست گیری کی جاتی تھی۔ یہ مساوات اصل میں قبیلائی تھی۔ غیر یہود اقوام کو نہایت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انہیں طنزیہ غیر مختون کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہوواہ جیسے قبیلائی معبود کے پجاری قبیلائی اخلاق و عمل ہی کی پابندی کر سکتے تھے چنانچہ غیر یہود اقوام سے سلوک اور طرزِ عمل کے احکام مختلف ہیں مثلاً یہودیوں کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنے بھائیوں سے سود نہ لیں لیکن غیر یہود سے سود لینا جائز ہے

"تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا" [2]

ہم قوم کے قرض کو معاف کر دینے کی ہدایات دی گئی ہیں۔

"ہر سال کے بعد تو چھٹکارا دیا کرنا اور چھٹکارا دینے کا طریقہ یہ ہو کہ اگر کسی نے اپنے پڑوسی کو قرض دیا ہو تو وہ اُسے چھوڑ دے اور اپنے پڑوسی سے یا بھائی سے مطالبہ نہ کرے۔" [3]

اسی طرح لونڈی غلام بنانے کے متعلق بھی ہم قوموں سے امتیازی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہودی احساس برتری میں مبتلا تھے اور اپنے آپ کو خداوند یہوواہ کی برگزیدہ اُمت سمجھتے تھے۔

---

[1] احبار [2][3] استثناء

شریعتِ موسوی میں ذاتی املاک کا تحفظ کیا گیا ہے۔ آٹھویں حکم میں اِس کی صاف وضاحت کر دی گئی ہے۔

یہودیوں کی مذہبی مملکت میں قدرۃً کاہنوں، احبار اور ربائیوں کا غایت درجہ احترام کرتے تھے۔ ہیکل کی مذہبی رسُوم کی ادائیگی کا کام جناب موسیٰ کے زمانے سے لاوی قبیلے کے افراد کے سپرد تھا۔ وہی قربانیاں کرتے اور قربانی کا گوشت لیتے تھے۔ تابوتِ سکینہ اور مقدس بھی انہی کی تحویل میں تھے۔ احبار اور ربائی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مدرسوں میں حرف شناسی کے بعد تورات کا درس شروع کرا دیا جاتا تھا۔

یہودی معاشرے میں ماں باپ اور بزرگوں کی عزت کا پورا پورا لحاظ روا رکھا جاتا تھا۔ والدین کو اپنے بیٹے بیٹیوں پر کامل اختیار حاصل تھا۔ وہ سرکش اولاد کو غلام لونڈی بنا کر بیچ ڈالنے یا بعض حالات میں جان سے بھی مار دینے کے مجاز تھے۔ نوجوانوں سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ بڑے بوڑھوں کا احترام کریں گے۔

"جن کے سر کے بال سفید ہیں اُن کے سامنے کھڑے ہونا اور بڑے بوڑھوں کا ادب کرنا۔"

روت نے اپنے خاوند کی موت کے بعد اپنی ساس نعومی کی خدمت کا بیڑا اُٹھا لیا اور اُسی کی رضامندی اور اجازت سے نکاحِ ثانی کیا تھا۔ اس لئے روت کے کردار کو یہودی عورتیں مثالی سمجھتی رہی ہیں۔

سب سے بڑا بیٹا کنبے کا سردار یا شیخ بن جاتا تھا جیسا کہ اکثر صحرانورد قوموں کا دستور ہے۔ اِسے پہلوٹھے کا حق کہتے تھے۔ عورت کو ثانوی حیثیت دی جاتی تھی جیسا کہ اکثر پدری معاشروں میں دیکھنے میں آیا ہے اور اُسے جزوِ املاک خیال کرتے تھے۔ شریعتِ موسوی کے دسویں حکم میں عورت کو بیل اور گدھے کے ساتھ املاک میں شمار کیا گیا ہے۔ کثرتِ ازدواج کا رواج تھا۔ جناب سلیمان کی سیکڑوں حرمیں تھیں۔ بیویوں کے علاوہ مفتوح اقوام کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر گھروں میں ڈال لیتے تھے۔ لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ لونڈیاں غلام غیر اقوام کے ہوتے تھے۔ اپنے ہم قوموں کو لونڈی غلام بنانا

ممنوع تھا۔

یہودیوں کے ہاں اپنی تاریخ کے مختلف زمانوں میں شادی بیاہ کے مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ بعض اوقات دوسرے قبائل کی جوان لڑکیاں جبراً اٹھا لاتے تھے اور انہیں بیویاں بنا لیتے تھے۔ بنی بن یمین سیلا کی لڑکیاں لے بھاگے اور ان سے بیاہ کر لیا۔

جناب موسیٰ نے اپنے ماموں لابن کی سات سال خدمت کی کہ وہ اس کی بیٹی راخل سے بیاہ کر سکیں۔ سات سال کے بعد لابن نے دھوکے سے انہیں بڑی بیٹی لیاہ سے بیاہ کر دیا جس کی آنکھیں چندھی تھیں۔ راخل حسین تھی۔ جناب موسیٰ کو اس کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے لابن کی مزید سات سال خدمت کرنا پڑی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دو سگی بہنیں ایک آدمی کے نکاح میں آ سکتی تھیں۔ بعد میں اس رسم کو ممنوع قرار دیا گیا۔ قدیم زمانے میں اپنی سوتیلی بہن سے بھی نکاح جائز تھا جیسا کہ جناب ابراہام کے احوال سے معلوم ہوتا ہے۔ [1]

"ابراہام نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ خدا کا خوف تو اس جگہ ہرگز نہ ہوگا اور وہ مجھے میری بیوی کے سبب سے مار ڈالیں گے فی الحقیقت وہ میری بہن بھی ہے کیوں کہ وہ میرے باپ کی بیٹی ہے اگرچہ میری ماں کی بیٹی نہیں پھر وہ میری بیوی ہوئی۔"

بنی اسرائیل میں بیوی کو حق مہر دیا جاتا تھا اور مہر مقرر کر کے نکاح کرتے تھے۔ شادی کے موقع پر دلہن کے سر پر گندم کی مٹھیاں بھر بھر کر ڈالتے اور کہتے جاتے "پھلو پھولو" خیال یہ تھا کہ اس لئے دلہن بہت بچوں کو جنم دے گی۔ بڑھاپے میں نوخیز کنواریوں سے نکاح کرنے کا رواج بھی تھا۔ قدیم چینیوں کی طرح یہودی اعادۂ شباب کے لئے کمسن لڑکیوں سے نکاح کیا کرتے تھے جیسا کہ جناب داؤد کے سوانح سے ظاہر ہے۔

"اور داؤد بڈھا اور کہن سال ہوا اور وہ اسے کپڑے اڑھاتے پر وہ گرم نہ ہوتا تھا۔ سو اس کے خادموں نے اس سے کہا کہ ہمارے مالک بادشاہ کے لئے ایک جوان

---

[1] پیدائش

کنواری ڈھونڈی جائے جو بادشاہ کے حضور کھڑی رہے اور اُس کی خبر گیری کیا
کیا کرے اور اُس کے پہلو میں لیٹی رہے تاکہ ہمارے مالک بادشاہ کو گرمی پہنچے
چنانچہ اُنہوں نے اسرائیل کی ساری مملکت میں ایک خوبصورت لڑکی تلاش کرتے
کرتے شونمیت ابی شاگ کو پایا اور اُسے بادشاہ کے پاس لائے۔" لہ

جنسی نفسیات میں اعادۂ شباب کے اس طریقے کو "نسخۂ داوٗد" یا "شونمیت کامنت" کہتے ہیں۔
بیوہ کا نکاح دیور سے کر دیا جاتا تھا اس سے جو اولاد ہوتی وہ مرحوم شوہر کی اولاد سمجھی جاتی
تھی۔ مُتعہ کا رواج بھی تھا اور حقِ خلوت دے کر مباشرت کرنا جائز تھا چنانچہ ایک سردار یہوداہ نامی نے
بکری کے بچے کے عوض تمر سے مباشرت کی تھی۔

امثال میں عورت کا ذکر حقارت سے کیا گیا ہے۔

"میں نے ہزار میں ایک مرد پایا لیکن ان سبھوں میں عورت ایک بھی نہ ملی۔"
"بیابان میں رہنا جھگڑالو اور چڑچڑی بیوی کے ساتھ رہنے سے بہتر ہے۔"
"بے تمیز عورت میں خوبصورتی گویا سوٗر کی ناک میں سونے کی نتھ ہے۔"

بنی اسرائیل نے عصمت فروشی، لواطت اور فحاشی کو خلافِ قانون قرار دیا۔ کنعان کے مندروں میں قدیم
زمانے سے دیوداسیاں عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں۔ سدوم کے معبدوں میں اَمرد رکھے جاتے تھے۔
بنی اسرائیل نے قانون بنایا کہ زانیہ اور زانی کو سنگسار کیا جائے اور لوطیوں کو جان سے مار دیا جائے۔
یوں بنی اسرائیل نے ہر قسم کی فحاشی اور جنسی کجروی کا انسداد کر دیا۔

یہودیوں کے یہاں بکارت کو اہم سمجھا جاتا تھا۔ شبِ زفاف کی صبح کو دُلہن کی ماں قبیلے کی عورتوں
کو اپنی بیٹی کی بکارت کے ثبوت میں بستر کی چادر دکھلاتی تھی

"اگر یہ بات سچ ہو کہ لڑکی میں کنوار پنے کے نشان نہیں پائے گئے تو وہ اُس لڑکی
کو اُس کے گھر کے دروازے پر نکال لائیں اور اُس کے شہر کے لوگ اُسے سنگسار

لہ سلاطین

کریں کہ وہ مر جائے کیوں کہ اُس نے اسرائیل کے درمیان شرارت کی اور اپنے باپ
کے گھر میں فاحشہ پن کیا۔ یوں تو اِس بُرائی کو اپنے درمیان سے دفع کرنا" [۱]

بنی اسرائیل طلاق کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بامر مجبوری طلاق دینا پڑتی تو مُطلّقہ کو نان نفقہ فراہم کیا جاتا تھا اور اُسے نکاحِ ثانی کی ترغیب دلائی جاتی تھی۔

شریعتِ مُوسوی میں جادو اور کہانت کو ممنوع قرار دیا گیا لیکن اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل جھاڑ پھُونک، ٹُونوں ٹوٹکوں اور جنوں کے اثرات کے قائل تھے۔ خود جناب موسیٰ نے سانپوں کے ضرر سے بچنے کے لئے پیتل کا ایک سانپ بنوایا اور اُسے بلّی پر لٹکا دیا اور کہا کہ "جس جس سانپ کے ڈسے ہوئے آدمی نے اُس پیتل کے سانپ پر نگاہ کی وہ جیتا بچ گیا" [۲]

بنی اسرائیل کے یہاں قسم کھانے اور سوگند لینے کا طریقہ یہ تھا کہ جس سے قسم لینا ہوتی وہ دوسرے شخص کے خصیتین پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا تھا جیسا کہ جناب ابرہام نے اپنے خادم سے قسم لی تھی۔

"اور ابرہام نے اپنے گھر کے سالخوردہ نوکر سے جو اُس کی سب چیزوں کا مختار تھا
کہا تو اپنا ہاتھ ذرا میری ران کے نیچے رکھ کہ میں تجھ سے خداوند کی جو زمین و
آسمان کا خُدا ہے قسم لوں کہ تو کنعان کی بیٹیوں میں سے جن میں میں رہتا ہوں
کسی کو میرے بیٹے سے نہیں بیاہے گا۔"

معافی مانگنے اور اظہارِ پشیمانی کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص معافی کا طالب ہوتا وہ اپنی کمر پر ٹاٹ باندھ کر اور سر پر رسّی لپیٹ کر دوسرے شخص کے پاس جایا کرتا تھا۔ اِس ہیئت میں دیکھ کر اُسے معاف کر دیا جاتا تھا۔

بنی اسرائیل کے تہوار مذہبی نوعیت کے تھے اِن میں عید فطر اور عید فسح خاص اہتمام سے مناتے تھے

"خدا کی عیدیں جن کا اعلان تم کو مقدّس مجمعوں کے لئے وقت مقرّرہ پر کرنا ہوگا
سو یہ ہیں۔ پہلے مہینے کے ۱۴ ویں تاریخ کی شام کو خداوند کی فسح ہوا کرے اور اُسی

---

[۱] استثناء   [۲] گنتی

مہینے کی ۱۵ ویں تاریخ کو خداوند کے لئے عیدِ فطیر ہو۔ اس میں تمام سات دن تک
بے خمیری روٹی کھانا۔ پہلے دن تمہارا مقدّس مجمع ہو۔ اِس میں تم کوئی خادمانہ کام نہ کرنا
اور ساتویں دن تم خُدا کے حضور آتشین قربانی گذارنا اور ساتویں دن پھر مقدّس مجمع ہو۔"

فسح اور فطیر کی عیدیں خروج سے یادگار ہیں جب بنی اسرائیل نے مصر چھوڑا تھا۔ مصر میں جب خداوند کا فرشتہ مصریوں کو تباہ کرنے کے لئے آیا تو بنی اسرائیل نے اپنے دروازوں پر لہو کا نشان لگا رکھا تھا جسے دیکھ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی یہودی اِس تقریب پر اپنے دروازوں کی دہلیز پر ذبیحہ کا لہو چھڑکتے ہیں۔

بنی اسرائیل کی تمدّنی میراث بیشتر مذہبی نوعیت کی ہے۔ اُن سے پہلے عراق میں لعل مردوخ اور مصر میں آتن کے روپ میں معبودِ واحد کا تصوّر اُبھر چکا تھا لیکن جیسا کہ محمد عبدہ مصری نے کہا ہے مروّجہ مفہوم میں توحید کا تصوّر عبرانی الاصل ہے۔ آلڈس ہکسلے نے بنی اسرائیل کو توحید کے موجد کہا ہے۔ جناب عیسٰی ابن مریم یہودی تھے اور بقولِ خود بنی اسرائیل کی بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو راہِ راست پر لانے کے لئے آئے تھے۔ اسلام کی الٰہیات، فقہ، شریعت، قانون وغیرہ پر شریعتِ موسوی نے گہرے اثرات ثبت کئے ہیں۔ اسرائیلیوں کی سب سے قابلِ قدر دین یہ ہے کہ اُنہوں نے معاصر اقوام کی جنسی بے راہ روی کو روکا اور عصمت و عفت پر زور دے کر فحاشی کا انسداد کیا۔ اُن کی میراث کا منفی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ٹھس، تعصّب اور مذہبی جنون کو ہوا دی اور لوگ مذہب کے نام پر بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہانے لگے گویا انہیں بے رحمانہ قتل و غارت اور کُشت و خون کا مذہبی جواز مل گیا۔ سائنس کی ترقی اور روشن خیالی کی اشاعت کے باوجود آج بھی اِس سلبی روایت نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا رکھی ہے جس سے انسان دوستی کا نصب العین مجروح ہوتا رہا ہے۔

یُونان

یُونان یورپ کے جنوب میں بحیرۂ روم میں واقع ہے۔ اِس میں بحیرۂ ایجین کے بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی شامل رہے ہیں۔ بحیرۂ ایجین کے مغرب میں ترکیہ کا ملک ہے۔ قدیم زمانے میں یہاں فریگیا، لیڈیا اور میسیا والوں کی راج دھانیاں تھیں۔ شاہ پرائم کا مشہور شہر ٹرائے میسیا میں تھا۔ یُونان کے مغرب میں بحیرۂ آئونین ہے جو آئونین قبیلے کے نام سے موسوم ہے۔ ملک یُونان کا نام اسی قبیلے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ شمال میں مقدونیہ کی راج دھانی تھی۔ جسے فلپ اور اُس کے نامور بیٹے سکندر نے شہرت بخشی۔ جنوب میں جزیرۂ کریٹ ہے جہاں کے ترقی یافتہ تمدن نے نو وارد یُونانیوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ یُونان میں بحیرۂ روم کے خطے کی آب و ہوا ہے یعنی گرما میں خشک اور سرما میں بارش۔ سال بھر میں بیس انچ کے قریب بارش ہو جاتی ہے۔ مغربی حصّے میں ایک طویل سلسلۂ کوہ ہے جو کوہ ایلپس کی شاخ ہے۔ سب سے اونچا پہاڑ اولمپس کا ہے جس کی چوٹی کو یُونانی اپنے دیوتاؤں کا مسکن سمجھتے تھے۔ اس کی بلندی نو ہزار سات سو چوّن فُٹ ہے۔ پہاڑوں کے درمیان اور ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ زرخیز میدان ہیں جہاں گندم، انگور، نارنگی اور زیتون اُگائے جاتے ہیں۔ شدید جاڑے میں بھی کہرا نہیں پڑتا اس لئے گرم آب و ہوا کی بعض فصلیں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ دریا چھوٹے اور تیز رفتار

ہیں۔ اِس لئے آب پاشی ممکن نہیں ہے۔ کھیتوں کو بالعموم کنوؤں کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اکثر کھیت ڈھلوان ہیں اور اوسطاً چار پانچ ایکڑ پر مشتمل ہیں۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر بھیڑ بکریاں پالی جاتی ہیں۔ خزاں کے موسم میں فصل بوئی جاتی ہے اور مئی میں کاٹ لی جاتی ہیں۔ گرما میں بارش نہ ہوتے کے باعث اندرون ملک میں پانی کمیاب ہو جاتا ہے۔ زرعی پیداوار کے لحاظ سے یُونان کسی زمانے میں بھی خود مکتفی نہیں تھا۔ اور اِس کی خوش حالی کا اِنحصار شروع سے بیرونی تجارت پر رہا ہے۔ اِس جُغرافیائی ماحول میں یُونان کے عظیم تمدّن نے جنم لیا تھا۔

جناب مسیح کی پیدائش سے کم وبیش ڈیڑھ ہزار برس پہلے آریاؤں کے خانہ بدوش قبائل شمال کی طرف سے یُونان میں داخل ہوئے۔ یہ لوگ نیم وحشی تھے اور مواشی پال کر گذر اوقات کرتے تھے۔ اِن کے ورود سے صدیوں پہلے کریٹ اور مائی کنی کے باشندے تہذیب وتمدن کے برکات سے رُوشناس ہو چکے تھے۔ کریٹ والے مِصر کے خوشہ چیں تھے چنانچہ سپنگلر نے کریٹ کے تمدّن کو تمدّنِ مصر کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔ نووارد آریا جفاکش اور تنومند تھے اِس لئے عیش پسند اور کاہل اہلِ کریٹ شکست کھا کر مغلوب ہوئے۔ اُن کے بارونق شہروں کو جن کی تعداد ہومر نے اِلیڈ میں نوّے بتائی ہے تباہ وبرباد کر دیا گیا اور اُن کے تمدّن کا بھی وہی حشر ہوا جو ہندی آریاؤں کے ہاتھوں ہڑپائی تمدّن کا ہوا تھا۔ کریٹ کا سب سے بڑا شہر نوسس دیکھتے دیکھتے سُلگتے ہوئے قبرستان میں بدل گیا۔ جیساکہ آغازِ تاریخ سے ہوتا آیا ہے وحشی حملہ آوروں نے مفتوح اہلِ کریٹ سے کسبِ فیض بھی کیا۔ دورِ اوّل کے ان حملہ آوروں کو ایکین کہا جاتا ہے۔ ۱۳۰۰ء سے لے کر ۱۱۰۰ء (ق م) کے ایکین دَور کو یُونانِ قدیم کا عہدِ شجاعت کہا جاتا ہے۔ اِسی زمانے میں ٹرائے کا شہزادہ پیرس سپارٹا کی ملکہ ہیلن کو بھگا لایا اور ہیلن کے حُسن وجمال نے "ایک ہزار جنگی جہازوں کے بیڑے کو حرکت دی"۔ اہلِ یُونان شاہ اگا میمنون کی سرکردگی میں متحد ہو کر ٹرائے پر چڑھ دوڑے

سے شہر ٹرائے پر حملہ آور ہوتے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ ہیلن کی بازیابی تو محض ایک بہانہ تھا فی الحقیقت یونانی ٹرائے والوں کی بڑھتی ہوئی خوش حالی سے جلتے تھے اور انہیں اپنا حریفِ غالب سمجھتے تھے۔ آخر انہیں نیچا دکھانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ ٹرائے والوں نے پیرس کے بھائی ہیکٹر کی قیادت میں دس برس تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ آخر یولیسیز اور اُس کے ساتھی چوبی گھوڑے میں بیٹھ کر ٹرائے میں گھس گئے اور رات کو دروازے کھول دیئے۔ یونانی فوج نے شہر کو غارت کیا اور پھر آگ لگا دی۔ ہزاروں مرد تہ تیغ کر دیئے گئے اور عورتیں لونڈیاں بنالی گئیں۔ ایلیڈ اور اوڈیسی میں ہومر نے اس محاصرے کے حالات افسانوی رنگ میں لکھے ہیں۔ محاصرہ ٹرائے سے یورپ اور ایشیا میں یا مشرق و مغرب میں اُس تاریخی دشمنی کا آغاز ہوا جو کسی نہ کسی صورت میں ہمیشہ برقرار رہی ہے۔

۱۱۰۴ (ق م) کے لگ بھگ شمال سے مزید آریائی قبائل نے یونان کا رخ کیا اور ایکین پر غلبہ پا کر انھیں اپنی رعیت بنالیا۔ نو وارد ڈورین لوہے کی تلوار رکھتے تھے جب کہ ملکیوں کے پاس کانسی کی تلواریں تھیں۔ ڈورین نے میکینی اور ایکین کو شکست دے کر تتر بتر کر دیا اور کورنتھ کا شہر بسایا۔ بچے کھچے ایکین بھاگ کر ایشیا کے ساحلوں پہ آباد ہو گئے۔ میکینی، ایکین، ڈورین اور ان کے بعد آنے والے اَئولین اور آئونین کے نسلی اختلاط سے ایک نئی قوم وجود میں آئی جسے یونانی کا نام ملا۔ یونانیوں نے اٹیکا اور پیلو پونیس کے علاقوں میں شہر تعمیر کئے جن میں سپارٹا، ایتھنز، تھیباس، کورنتھ اور آرگوس نے شہرت پائی۔ ان کے علاوہ اطالیہ، قبرص اور ایشیا کے ساحلوں پر بھی بستیاں تھیں۔ یہ شہری ریاستیں ایک دوسری سے برسرِ پیکار رہتی تھیں البتہ بیرونی خطرے کے وقت متحد ہو جاتی تھیں۔ پہلے پہل ان ریاستوں پر بادشاہ حکومت کرتے تھے لیکن آٹھویں صدی میں یہ رسم چل نکلی کہ کوئی طاقتور شخص بزورِ شمشیر ریاست پر قبضہ کر لیتا اور بجبر و تشدد حکومت کرتا۔ انہیں مستبد[1] کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ عوام نے ان سے بھی گلو خلاصی

---

[1] TYRANT

کرالی اور چند ریاستوں میں جن میں ایتھنز کو اولیت حاصل ہے جمہوریت کا آغاز ہوا یعنی عوام کی حکومت عوام کی فلاح کے لئے۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں دُنیا کی پہلی حکومت ایتھنز میں قائم کی گئی۔ سپارٹا میں شاہ لکرگس کے قوانین نے عرصۂ دراز تک بادشاہت کو قائم رکھا۔ سپارٹا کے جنگ جُو باشندے ایتھنز کے جمہوریت پسندوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

پانچویں صدی کے اوائل میں شہنشاہ ایران خشارشیا نے کشتیوں کا پُل بنوا کر آبنائے باسفورس کو عبور کیا اور مقدونیہ کے راستے یُونان پر حملہ آور ہوا۔ اِس سے پہلے داریوش نے بھی تسخیرِ یُونان کی ناکام کوشش کی تھی۔ اِس حملے کی فوری وجہ یہ تھی کہ بعض یُونانی شرپسندوں نے ساحلِ ایشیا کے ایک معبد کو، جو ایرانی عملداری میں تھا لُوٹ کر جلا دیا تھا۔ خشارشیا کے مقابلے کے لئے یونانی ریاستوں نے متحدہ محاذ قائم کیا۔ سپارٹا کے تین سَو جنگ آزماؤں نے تھرموپلی کے درّے میں ایرانی لشکر کو روکنے کی کوشش کی۔ اِس خیال سے کہ کسی شخص کی نسل منقطع نہ ہو۔ صرف بیٹوں کے باپ اِس دستے میں شامل کئے گئے۔ یہ جانباز مردانہ وار لڑتے ہوئے پیوندِ زمین ہوگئے لیکن اِس سے ایتھنز والوں کو اپنا شہر خالی کر کے بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ خشارشیا فاتحانہ ایتھنز میں داخل ہوا تو وہاں ہُو کا عالم تھا۔ اُس نے شہر کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔ بعد میں سکندر نے اِسی کے بدلے میں ایرانیوں کے دارالسلطنت اِصطخر کو نذرِ آتش کیا تھا۔ ایتھنز کے ایک سالار تھیمسٹوکلیز نے زبردست فوجی بیڑا تیار کیا اور جنگ سالامس میں ایرانی بیڑے کو شکست دے کر تباہ کر دیا۔ خشارشیا واپس چلا گیا تو اس کی باقی ماندہ فوج کو پلیٹیا کے میدان میں شکست ہوئی اور ایرانیوں کو سرزمین یُونان سے نکال دیا گیا۔ اِس فتح نے یونانیوں کے حوصلے بلند کر دیے اور ایتھنز کو تمام ریاستوں پر برتری حاصل ہوگئی۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ کے دوران میں جو ریاستیں ایتھنز کے قائم کردہ دفاعی

میں شامل ہوئی تھیں اُن پر ایتھنز نے اپنا تسلط جمالیا۔ اُس کا جنگی اور تجارتی بیڑا طاقتور تھا۔ اُس کے تجارتی جہاز ہر کہیں دکھائی دینے لگے اور اہلِ ایتھنز مالا مال ہوگئے۔ فتح و نصرت کے نشے میں سرشار ہو کر ایتھنز والوں نے علوم و فنون میں بھی درخشاں کارنامے انجام دیئے پریکلیز کا عہد (۴۶۰ - ۴۳۰ ق م) تاریخِ عالم میں منفرد سمجھا جاتا ہے۔ پیریکلیز کی موت کے بعد اُس کے بھتیجے السی بائدیس کی حماقتوں سے ایتھنز اور سپارٹا میں جنگ چھڑ گئی اور پیلو پونیسی لڑائیوں کا آغاز ہوا۔ انجام کار سپارٹا والے غالب آگئے اور ۴۰۴ (ق م) میں ایتھنز کی آزادی اور عظمت کا خاتمہ ہوگیا۔ سپارٹا کا تسلط بھی چند روزہ ثابت ہوا۔ یونان تنزل پذیر ہو چکا تھا۔ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے ۳۶۰ (ق م) میں چڑھائی کی اور قیرونیہ کی جنگ میں یونانیوں کی متحدہ فوج کو شکست فاش دے کر انہیں اپنی مملکت میں ضم کر دیا اور یونانِ قدیم صفحۂ تاریخ سے غائب ہوگیا۔

قدیم یونانیوں کے مذہب کو کثرت پرستی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اُن کا سب سے بڑا دیوتا زوس تھا۔ جو بادلوں کو اکٹھا کرتا اور برق و رعد کے نیزے سے انہیں چھید کر مینہ برساتا تھا۔ اِس کے دو بھائی تھے: ہیڈیس اور پوزی دون، بیوی کا نام ہیرا تھا۔ زوس کی اولاد نرینہ میں ایریس، اپالو، ہرمیس اور ہیفیسٹس تھے ایتھینا، افرودائٹی اور آرٹیمس اُس کی بیٹیاں تھیں۔ زوس مختارِ مطلق تھا۔ البتہ تقدیر کی تین دیویوں پر اُس کا بھی تصرف نہیں تھا۔ اِن میں ایک دیوی قسمت کا دھاگا کاتتی ہے، دوسری ہر شخص کو اس کا مقسوم دیتی ہے اور تیسری اِس دھاگے کو کاٹ دیتی ہے۔ سمندروں پر پوزی دون کی حکومت تھی اور زمین دوز مملکت پر ہیڈیس کا راج تھا۔ اپالو نور اور صداقت کا دیوتا تھا اور ایک باکمال مغنی تھا جو اپنے سنہرے بربط کو چھیڑ کر سامعین پر جادو کر دیتا تھا۔ ایریس جنگ کا دیوتا تھا اور ہرمیس زوس کا خاص ایلچی تھا۔ ہیس ٹیس زوس کی کنواری با عصمت ہمشیرہ تھی۔ جس کے معبد میں صبح و شام آگ جلتی رہتی تھی۔ چھ کنواری دیوداسیاں

اِس آگ کی نگہداشت پر مامور تھیں۔ اتھینا اور آرٹیمس بھی کنواریاں تھیں۔ اتھینا زراعت اور تہذیب و تمدّن کی دیوی تھی۔ اُسے پارتھے ناس بھی کہتے تھے۔ ایتھنز کا شہر اسی کے نام پر بسایا گیا تھا۔ پیریکلز کے عہد میں اِس کا شاندار معبد پارتھی نون تعمیر کیا گیا۔ افروڈائٹی حُسن و عشق کی دیوی تھی جو جوان مردوں عورتوں کے دلوں میں ہیجان پیدا کرتی تھی۔ یہ دیویاں اور دیوتا کوہ اولمپس کی چوٹیوں پر رہتے تھے جہاں ہر وقت بادلوں کا پردہ رہتا تھا۔ امرت پینا اور انسانوں کے معاملات میں دخل در معقول دینا اِن کا محبوب مشغلہ تھا۔ زوس اور اپالو حسین دو شیزاؤں سے معاشقے کرتے رہتے تھے۔ افروڈائٹی اپنے بیٹے ایراس (عشق کا دیوتا) کے ہاتھوں پریشان ہر وقت کسی نہ کسی سے عشق کیا کرتی تھی۔ یُونانی دیو مالا میں شراب اور انگور کے دیوتا دیونیسس کا قصہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ دیونیسس کے بارے میں یُونانیوں کا خیال تھا کہ اُس نے اپنی جان کی قربانی دے کر نوعِ انسان کو بچایا تھا چنانچہ اُس کی موت اور احیاء کو مذہبی شعائر میں شمار کرنے لگے۔ جب موسم بہار میں پھول کھلتے اور کونپلیں پھوٹتیں تو عورتیں پہاڑوں پر نکل جاتیں، وہاں دن رات دل کھول کر شراب پینتیں اور نشے میں مدہوش دیوانہ وار جھومتی اور ناچتی ہوئی جلوس نکالتی تھیں۔ اِس حالت میں کسی بکرے یا بیل کو دیونیسس کا اوتار سمجھ کر پکڑ لیتیں اور اُسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کچا چبا جاتی تھیں۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اِس طرح دیوتا اُن کے اندر حلول کر جاتا ہے۔ یہی تصور بعد میں کلیسیائے رُوم کے عشائے ربانی کی صورت میں نمودار ہوا جس میں روٹی کو جنابِ مسیح کا گوشت سمجھ کر کھایا جاتا ہے اور شراب کو اُن کا خون سمجھ کر پیا جاتا ہے۔

دمیتر کی پُوجا کے ساتھ یُونانیوں کی پُراسرار رُسوم وابستہ تھیں جو خفیہ مجالس میں ادا کی جاتی تھیں۔ ان میں صرف منتخب افراد حصہ لیتے تھے۔ پلوٹارک نے جو اِس کا رُکن تھا۔ اشارۃً اِس کا ذکر کیا ہے۔ دمیتر کی پُوجا کا مرکزی خیال یہ تھا کہ انسان مر کر دوبارہ زندہ ہو جائے گا۔ یُونان میں عارفی مَت بھی بڑا مقبول تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اِس کا بانی ایک گویا

عارفیوس تھا۔ اِس کے پیرو کڑی ریاضت، اور ترکِ لذّات کے قائل تھے۔

یُونان میں ہرکیس لِنگ کی پُوجا کی جاتی تھی۔ دیونیسس کے تہوار میں عورتیں لِنگ کے مجسمے اُٹھا کر فحش گیت گاتی ہوئی جلوس نکالتی تھیں۔ لِنگ کی علامت کو تبرک کے بطور گلے میں لٹکاتے تھے۔ یُونانی دیو مالا میں عالمگیر سیلاب کی روایت ظاہراً بابلیوں سے مستعار تھی۔ یُونانیوں کی روایت کے مطابق صرف ایک شخص دیوکیلین اور اس کی زوجہ پرہا کشتی میں بیٹھ کر اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اِن کا بیٹا ہلین تھا جس کے نام پر یُونانیوں کو ہلینی بھی کہنے لگے۔ یونانیوں کی دیو مالا[1] میں پرومیتھیس کا کردار بڑا دلچسپ ہے۔ اُس نے دیوتاؤں کے مسکن سے آگ چرا کر انسان کو دی تھی۔ زوس نے غصّے میں آ کر اُسے ایک چٹان سے باندھ دیا اور ایک گِدھ کو مامور کیا جو اُس کا دل و جگر نوچ نوچ کر کھایا کرتا۔ آخر ہرکیولیز نے اُسے اِس قید سے رہائی دلائی۔ پرومیتھیس عذاب کی اِس حالت میں بھی زوس کے خلاف بغاوت کے نعرے لگاتا رہا۔ اِس قصّے میں اِنسان کی حوصلہ مندی اور عزم راسخ کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک صندوقچے میں دنیا بھر کی برائیاں بند کر دی گئی تھیں۔ پنڈورا نے اُسے کھول دیا۔ سب بُرائیاں باہر نکل کر ہر کہیں پھیل گئیں چنانچہ شاعر ہیزیڈ نے عورت کو مجسّم شر قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے " زوس نے عورت ایک بُرائی کی صورت میں انسان کو دی تھی" دوسری آریائی اقوام کی طرح یُونانی بھی آگ کو مُقدّس مانتے تھے۔ ہر شہر میں اور ہر گھر میں دن رات آگ جلتی رہتی تھی۔ یُونانی حیات بعد ممات کے قائل تھے۔ مُردے کے مُنہ میں ایک سکّہ رکھ دیتے تھے کہ وہ شاروں ملاح کو دے کر دریائے سٹائکس کو پار کر سکے۔ کبھی کبھی قبروں پر کھانے پینے کی اشیاء رکھ دی جاتی تھیں تاکہ مُردوں کی رُوحیں اُن سے پیٹ بھر سکیں۔

---

[1] یُونانی اُن قصوں کو جو دیوتاؤں کے حالات زندگی سے متعلق تھے MYTHOS کہتے تھے۔ لفظ MYTHOLOGY اسی سے مشتق ہے۔ یعنی قصوں کا علم، عربی خرافیات۔

موت کے بعد رُوح ہیڈیس دیوتا کی زیرِ زمین دوزتاریکیوں میں کھو جاتی۔ عُظماء کی رُوحوں کے لئے الیسین میدان تھا جسے اہلِ یونان کی جنّت کہا جا سکتا ہے۔

یُونانیوں کا سب سے مُقدّس مندر دلفی میں تھا جس کے دروازے پر یہ الفاظ کندہ کرائے گئے تھے "اپنے آپ کو جانو۔" اِس میں ایک کاہنہ رہتی تھی جس سے فال لینے کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے تھے۔ وہ عالمِ وجد و کیف میں سائلوں کے جواب مُقفّیٰ عبارت میں دیا کرتی تھی۔ اہم مواقع پر اِس کاہنہ سے رجوع لاتے تھے۔

یُونانیوں کا مذہب دیومالا کے قِصوں اور رُسُومِ عبادت پر مُشتمل تھا اور اُس میں اِلہام کا معروف تصوّر نہیں تھا نہ کوئی خاص دستورِ اخلاق اُس سے وابستہ تھا۔ اُن کے دیوتا اُنہیں کی طرح کے اِنسان تھے جو ہر وقت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے یا معاشقے کیا کرتے تھے۔ خداوند خدا زوس کسی نہ کسی نوخیز حسینہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا۔ دراصل یُونانی اخلاق کو مذہب سے جُدا سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے اخلاق کا باقاعدہ فلسفہ مُرتّب کیا۔ وہ ذاتی نجات کے قائل نہیں تھے اور اپنی بہترین کوششیں ریاست کی بہبود کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ البتہ تقدیر پر اُن کا یقین محکم تھا۔ اُن کے خیال میں سب اِنسانوں پر تقدیر کا اٹل قانون مُسلّط ہے جس سے گُریز کی کوئی بھی صورت ممکن نہیں ہے لیکن ہندوؤں کی طرح یاسیّت کا شکار ہونے کی بجائے وہ مردانہ وار تقدیر کا مقابلہ کرتے تھے۔ اُن کے اِسی اندازِ نظر نے عظیم المیہّ کو جنم دیا تھا۔

یُونانیوں کی اپنی روایت کے مطابق اُنہوں نے چودھویں صدی (ق م) میں کنعانیوں سے حروفِ تہجّی سیکھے تھے۔ اِس بات کا ثبوت یُونانی کی الفبا سے بھی ملتا ہے لکھنے کے لئے وہ مصری پپائرس یا کھالیں استعمال کرتے تھے۔ ساتویں اور چھٹی صدیوں (ق م) میں اُن کے یہاں علوم و فنون کو بڑا فروغ ہوا۔ یاد رہے کہ یُونان جس فلسفے، آرٹ اور سائنس کے لئے مشہور ہوا اُن کا آغاز و اِرتقاء خاص یُونان میں نہیں بلکہ ساحلِ ایشیا کے اُن باشندوں سے ہوا تھا۔ جو ڈورین قبائل کے حملوں سے بھاگ کر وہاں مقیم ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے مصریوں، بابلیوں اور کنعانیوں

سے کسبِ فیض کیا۔ مورخین ملیٹس کی شہری ریاست کو فلسفے اور سائنس کا گہوارہ بتاتے ہیں۔
یہاں کے باشندوں نے مصر سے جیومیٹری اور طب اور بابل سے علمِ ہیئت، کا اکتساب کیا فلسفے
کا باوا آدم طالیس ۶۴۰ء (ق م) میں ملیٹس میں پیدا ہوا تھا۔ اُسے سائنس، ہیئت اور ریاضی
کا بھی موسس خیال کیا جاتا ہے۔ بعد میں اقلیدس نے جیومیٹری میں اُس سے خوشہ چینی کی۔
طالیس بہ یک وقت ایک فلسفی بھی تھا اور سائنس میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ طالیس ہی
سے سائنس اور فلسفے کے باہم مربوط ہونے کی روایت کا آغاز بھی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یونان میں
دونوں اصناف آخر تک ایک دوسری سے وابستہ رہیں۔ یونانی سائنس کے مفروضات منطق
و جدلیات ہی کے قیاسات پر مبنی تھے۔

طالیس کا سب سے اہم کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس نے علمِ ہیئت کو علمِ نجوم سے
جُدا کیا تھا۔ اُس نے مئی ۵۸۵ء (ق م) میں سورج گرہن کی پیش گوئی کی جو مصری اور
بابلی ہیئت دانوں کا فیضان تھا۔ اُس کا شمار عہدِ عتیق کے گنے چنے دانش وروں میں ہوتا
ہے جب ایک شخص نے اُس سے پوچھا کہ دنیا کا سب سے مشکل کام کونسا ہے تو اُس نے جواب
دیا " اپنے آپ کو جان لینا " جب سوال کیا گیا کہ سب سے آسان کام کون سا ہے تو وہ بولا "
دوسروں کو مشورہ دینا "طبیعی" فلسفے کا آغاز اُسی سے ہوا تھا۔

اُس کا نظریہ یہ تھا کہ کائنات پانی سے بنی ہے گویا اُس نے کائنات کی تخلیق کو دیوتاؤں
سے منسوب کرنے کے بجائے اُس کی علمی و تحقیقی توجیہہ کرنے کی کوشش کی جس کی توفیق طالیس
سے پہلے کسی کو نہیں ہوئی تھی۔ طالیس کے بعد اُس کے ایک شاگرد انا کسی مینڈر نے اسی طبیعی
روایت کی پاسبانی کی۔ رفتہ رفتہ یہ اندازِ نظر اہلِ علم میں اتنا مقبول ہوا کہ دو صدیوں ہی میں
سائنس اور فلسفے کی تدوین عمل میں آگئی۔ اِس زمانے میں فلسفے کے دو متوازی رُجحانات صُورت پذیر
ہوئے جو کسی نہ کسی صورت میں آج بھی باقی ہیں ۱۔ طبیعی ۲۔ مثالیاتی۔

پہلا طالیس سے شروع ہو کر انا کسی مینڈر، زینوفینیس، پیروٹاگورس، ہپو کریطس (بقراط)

اور دیما قریطس سے ہوتا ہوا ابیقورس اور لکریشیس تک پہنچا اور دوسرا فیثا غورس سے شروع ہوا اور پارمی نائدیس، ہیریقلیتس اور افلاطون کے واسطے سے فلاطینوس پر منتہی ہوا۔

فیثا غورس کروٹونا کا شہری تھا۔ اُس کے مکتب میں عورتیں مرد مِل کر تعلیم پاتے تھے۔ اس طرح افلاطون سے دو سو برس پہلے اُس نے عملی طور پہ مرد عورت کی مساوات کا درس دیا۔ اُس کے خیال میں مرد عورتوں کے حقوق یکساں ہیں۔ اُس کے طلبہ دو جماعتوں میں منقسم تھے ظاہریہ اور باطنیہ۔ موخرالذکر کو فیثا غورس اپنے قریب بٹھا کر خفیہ تعلیم دیا کرتا تھا۔ فیثا غورس کی اولیات کثرت سے ہیں، اُس نے MATHAMATICS اور PHILOSOPHE کی اصطلاحات وضع کیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے کرۂ ارض کو گول کہا اور سورج گرہن، چاند گرہن کی عملی تشریح کی۔ وہ موسیقی سے دماغی امراض خفقان، مالیخولیا، مراق اور سودا کا علاج کرتا تھا۔ اُس نے علمِ موسیقی کو سب سے پہلے ریاضیاتی بنیادوں پر مُرتّب کیا۔ اُس کے افکار میں پہلے پہل الٰہیات اور ریاضیات کا امتزاج عمل میں آیا۔ وہ تناسخ ارواح کا قائل تھا۔ دیونسیس کے مَت کی اصلاح عارفیوس نے کی تھی۔ فیثا غورس نے عارفی مَت کی تنظیم نئے سرے سے کی۔ اُس کے واسطے سے عارفیوں کے افکار افلاطون کے فلسفے میں بار پا گئے۔ وہ اعداد کو کائنات کے تخلیقی عناصر سمجھتا تھا اور جفت اور طاق اعداد کے تضاد سے قُدرتی مظاہر کی تشریح کرتا تھا۔ افلاطون کے امثال میں اعداد کا یہی تصوّر شکل پذیر ہوا تھا۔

ہیریقلیتس کے فلسفے کو یُونانی ذہن و دماغ کی عظیم تخلیق کہا گیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ کائنات کی اصل پانی نہیں ہے بلکہ آگ ہے جسے وہ "یزدانی آگ" کہا کرتا تھا۔ اُس کے اضداد کے نظریے کی تجدید ہمارے زمانے میں ہیگل اور کارل مارکس نے کی ہے۔ اُس کے تغیّرِ مسلسل کے خیال کی ترجمانی برگساں نے کی ہے اُس کے جنگ و جدال کے ازلی و ابدی اُصولِ اِرتقا کو نیٹشے اور سپنگلر نے نئے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

پارمی نائڈیس سے دنیائے فلسفہ میں مابعد الطبیعات کا آغاز ہوا۔ ہیریقلیتس کے برعکس اُس کا دعوٰے یہ تھا کہ دُنیا کی ہر شے ثابت و قائم ہے اور کسی شے کو تغیر نہیں ہے۔ مثالیت کا بانی بھی اُسے سمجھا جاتا ہے۔ اُسی سے ظواہر و حقائق کی تفریق اور غیر مرئی حقیقت اور غیر حقیقی ظواہر کی نزاع شروع ہوئی جو کانٹ کے فلسفے میں نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔
پارمی نائڈیس نے ایک فلسفیانہ نظم بھی لکھی تھی۔ جس کا عنوان ”فطرت“ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ آغاز و انجام، پیدائش و مرگ، کون و فساد صرف ظواہر میں ہوتا ہے۔ حقیقت واحد کا نہ آغاز ہے اور نہ انجام ہوگا۔ صرف 'وجود' ہے۔ تکوین و تخلیق محض واہمہ ہے۔ ”نا وجود کہیں نہیں ہے“۔ وجودِ واحد کائنات میں ہر کہیں محیط ہے اور ساکن ہے تغیر و تبدّل فریبِ نظر ہے۔ اسی بنا پر پارمی نائڈیس کو وحدت الوجود کے نظریّے کا پہلا شارح کہا گیا ہے۔

لیوکپس ملیٹس کا شہری تھا۔ وہ اپنے افکار میں پارمی نائڈیس سے متاثر ہوا۔ دیما قریطس نے اُس سے کسبِ فیض کیا دیما قریطس کے خیال میں کائنات مادے کے ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنی ہے جن کا مزید تجزیہ ممکن نہیں ہے۔ انہیں اصطلاح میں ایٹم کہا گیا جن کا ترجمہ عربوں نے اجزائے لایتجزّٰی سے کیا۔ یہ اجزاء ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے رہتے ہیں۔ دیما قریطس مادیّت پسندوں کا امام ہے۔ اُس کے خیال میں انسانی رُوح بھی ایٹموں ہی سے مرکّب ہے اور ان سے الگ رُوح کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دیما قریطس فطرت میں ہر نوع کی مقصدیّت اور غایت کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ ہر مسبّب کا ایک سبب ضرور ہوتا ہے۔ اُس نے کہکشاں کے بارے میں کہا کہ وہ ستاروں کا جھرمٹ ہے۔ اُس کے مقولوں میں پختہ دانش و خرد کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اُس کا قول ہے ”ایک دانش ور اور نیک آدمی کے لئے تمام کرۂ ارض اُس کا مادرِ وطن ہے“۔ ایک اور قول ہے ”خوشی مال و متاع سے میسّر نہیں آتی۔ خوشی کا سرچشمہ

خود انسان کے بطون میں ہے"

ایمپی وکلیس نے ڈارون کے نظریے سے ملتا جلتا اِرتقاء کا تصوّر پیش کیا۔ اُس کے خیال میں انسان کا اِرتقاء حیات کی اسفل صورتوں سے ہوا تھا۔ اُس نے انسان کے وحشت سے تہذیب کی طرف کے اِرتقائی سفر کی تشریح بھی کی ہے۔ عناصرِ اربعہ خاک، ہوا، مٹی، پانی کا تصوّر بھی اُسی سے یادگار ہے۔ اس کے خیال میں کائنات انہیں عناصرِ اربعہ سے مل کر بنی ہے۔ تعجب ہے میں فیثا غورس کے ایک پیرو فلولاس نے کہا کہ سیارے زمین کے گرد نہیں گھومتے بلکہ زمین دوسرے سیاروں کی طرح "ایک مرکزی آگ" کے گرد گھومتی ہے۔ انا کسا غورس کے خیال میں چاند ٹھوس ہے جس پر پہاڑ اور وادیاں ہیں چاند سورج سے روشنی لیتا ہے اور تمام اجرامِ سماوی میں زمین سے قریب ترین ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان وحوش کی صف سے اس لئے جدا ہوا کہ وہ دو پاؤں پر کھڑا ہو گیا جس سے اُس کے ہاتھ کام کرنے کے لئے آزاد ہو گئے۔ اُس نے شہابِ ثاقب کی بھی علمی توجیہہ کی جس سے معاصر اہلِ مذہب خفا ہو گئے۔ دریائے نیل کے بارے میں اُس نے کہا کہ اِس میں کوئی دیوتا سیلاب نہیں لاتا بلکہ حبشہ میں بارش ہونے اور برف کے پگھلنے سے سیلاب آتا ہے۔

سُقراط سے پہلے کے یونانی فلاسفہ کائنات کے مظاہر اور اُس کی تکوین و تخلیق کے آفاقی مسائل پر غور و فکر کرتے تھے۔ سُقراط کے عہد میں سوفسطائیوں کا زور تھا۔ لفظ "سوفسطائی" کا لغوی معنیٰ ہے "دانش مند" آج کل یہ لفظ حقارت کا مفہوم رکھتا ہے۔ جو شخص ایک وکیل کی طرح اپنی بات منوانے کے لئے حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرے اُسے سوفسطائی کہتے ہیں۔ سُقراط کے زمانے میں یہ بات نہ تھی۔ سوفسطائیوں نے زبان و بیان کے قواعد اور اُصول مرتب کئے، فصاحت و بلاغت کے مبادیات کا تحقیقی مطالعہ کیا اور منطق و جدلیات کو ترقی دی۔ فکری مغالطوں کی نشان دہی کے طریقے بھی اُنہوں نے وضع کئے تھے۔ سوفسطائی پیشہ ور اُستاد تھے جو آج کل کے اتالیقوں کی طرح اُمراء

کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور اُس کا معاوضہ وصول کرتے تھے اس لیئے اُن کے مخالف انہیں دانش فروش کہنے لگے۔ سوفسطائیوں نے اہلِ فکر کی نگاہیں آفاقی مسائل سے ہٹا کر خود انسانی مسائل پر مرکوز کر دیں۔ پروتاغورس سوفسطائی کا مقولہ ہے "انسان ہر شئے کا پیمانہ ہے"۔ اِس قول سے فلسفے میں موضوعیت نے بار پایا۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی قدر انسانی ذہن و قلب سے ماوراء نہیں ہو سکتی۔ انسان ہی صداقت اور خیر کا معیار قائم کرتا ہے بُری شئے وہ ہے جسے انسان بُرا سمجھے اور اچھی چیز وہ ہے جسے انسان اچھا سمجھے۔ اسی طرح "صداقت وہ ہے جسے انسان صداقت قرار دے"۔ یہ کہہ کر سوفسطائیوں نے معروضی صداقتوں اور قدروں سے انکار کیا۔ سقراط کا اپنا استدلال بھی سوفسطائیوں جیسا تھا لیکن اُس نے موضوعیت کی مخالفت کی۔ اُس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بعض صداقتیں اور قدریں ایسی بھی ہیں جو سراسر معروضی ہیں اور انسان کے ذہن و قلب سے ماوراء ازلی و ابدی وجود رکھتی ہیں۔ سقراط نے بھی سوفسطائیوں کی پیروی میں آفاقی مسائل سے قطعِ نظر کر کے اخلاقی اور سیاسی مسائل چھیڑے اور کائنات کی بجائے انسان کو موضوعِ فکر بنایا۔

سقراط نے پیریکلیز کے دوست فلسفی اناکساغورس سے استفادہ کیا تھا۔ اُس نے یہ معمول بنا لیا تھا کہ لوگوں کے دیوان خانوں میں جا کر یا سرِ بازار کھڑے ہو کر اپنے مخاطب سے سوالات پوچھتا اور اُس کے جواب کا تجزیہ کر کے اُسے یہ سمجھاتا کہ اُس کے خیالات میں اُلجھاؤ اور انتشار ہے اور وہ گوناگوں مغالطوں کا شکار ہو گیا ہے۔ اُس کے ان مباحث کو اُس کے ایک شاگرد افلاطون نے اپنے مکالمات میں محفوظ کر لیا۔ ان کے مطالعے سے مفہوم ہوتا ہے کہ سقراط کائنات کے ظواہر کے پسِ پردہ ایک حقیقتِ اولیٰ کا قائل تھا اور اناکساغورس کی طرح خیال کرتا تھا۔ کہ ایک ہمہ گیر ذہن[1] ہر ذی حیات میں نفوذ کیئے ہوئے ہے۔ سقراط

---

[1] NOUS

جدلیات میں زینو کا خوشہ چین تھا۔ یہ جدلیات افلاطون کے واسطے سے ارسطو تک پہنچی تھی۔ جس نے اِسے منطق کی صورت عطا کی۔ سقراط کے یہاں فلسفہ الٰہیات یا مابعدالطبیعات پر مشتمل نہیں تھا بلکہ اخلاقیات و سیاسیات پر محیط تھا۔ اواخرِ عمر میں اُس پر الزام لگایا گیا کہ وہ قومی دیوتاؤں کی پوجا نہیں کرتا، ہر بات میں تجسّس سے کام لیتا ہے اور نوجوانوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اُس پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا دی گئی۔ اُس کے عقیدت مندوں نے اُسے قید خانے سے بھگا لے جانے کا منصوبہ بنایا لیکن وہ نہ مانا اور نہایت سکون اور اطمینان سے زہر کا پیالہ پی گیا۔ سقراط کو بجا طور پر پہلا شہیدِ فلسفہ کہا گیا ہے۔ چوتھی صدی عیسوی (ق م) کو فلسفہ یونان کا عہدِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ اِس سے پہلے کے فلاسفہ کے افکار و نظریات منتشر اور غیر منظّم تھے۔ سوفسطائیوں نے ہر طرف شکوک و شبہات پھیلا دیئے تھے۔ سقراط نے سیکڑوں سوالات اُٹھائے تھے لیکن بہت کم کے شافی جواب دیئے تھے۔ افلاطون نے اُس کے افکارِ پریشان کو باقاعدہ نظامِ فکر کی صورت میں مرتب و منضبط کیا اور ذاتی اجتہادات کے اِضافے بھی کئے۔ دُنیائے فلسفہ میں افلاطون کو مثالیت پسندی کا شارحِ اوّل مانا گیا ہے۔ اُس کا نظریۂ امثال مختصراً یہ ہے کہ امثال ازلی و ابدی ہیں اور غیر متحرک ہیں۔ دُنیا میں جتنی اشیاء دکھائی دیتی ہیں سب امثال کے عکس ہیں۔ مثلِ اعلیٰ ہی حقیقتِ اولیٰ ہے۔ مثل حقیقی ہے مادہ غیر حقیقی ہے اور اپنے وجود کے لئے مثل کا محتاج ہے۔ مادی اشیاء فریبِ نظر کے کرشمے ہیں۔ امثال کا اِدراک باطنی قوّت یا اشراق سے ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر افلاطون کو اشراقیت کا بانی بھی کہا گیا ہے۔ افلاطون نے خُدا کو خیرِ محض، کہا ہے اور اپنے مکالمات میں سقراط کی تین اقدارِ اعلیٰ خیر، حُسن اور صداقت سے مفصل بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی کی طرح حُسن بھی توافق و تناسب ہی کا دوسرا نام ہے۔ عشق حُسن کا تعاقب کرتا ہے۔ خیرِ محض کی محبت عشقِ حقیقی ہے۔

افلاطون کی مثالیت کا اہلِ مذہب کے حلقوں میں پُرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ ولی آگسٹائن اُسے فلاسفہ کا مسیح کہا کرتا تھا۔ اِتحاد اور اِشراقیت کے تصورات تصوّف میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ فلاطینوس نے نوا شراقیت کے نام پر افلاطون ہی کے اِشراق کی نئے سرے سے تدوین کی تھی۔ اواخرِ عمر میں افلاطون فیثا غورس کی تعلیمات کے زیرِ اثر آگیا اور اُسی کی طرح تناسخِ ارواح کا قائل ہو گیا۔ مکالماتِ افلاطون دنیائے ادب و فلسفہ کے شاہ کار ہیں۔ 'سمپوزیم' اور 'فیدرو' میں "عشقِ افلاطونی" کا اعلیٰ تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ 'جمہوریہ' میں اُس کا فلسفہ تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ 'قوانین' میں سپارٹا والوں کی کڑی تادیب کی پیروی پر زور دیا گیا ہے۔ افلاطون نے اپنی خیالی ریاست میں اشتمالی نظامِ معاشرہ کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔ وہ املاک کے ساتھ عورت کے اِشتراک کی بھی دعوت دیتا ہے۔ اُس نے اپنی مثالی ریاست سے شاعروں، موسیقاروں اور اداکاروں کو جلا وطن کر دیا ہے کیوں کہ اُس کے خیال میں موسیقی اور شاعری کے فنون نوجوانوں کے عزم و حوصلہ کو کمزور کرتے ہیں۔ سیاسیات میں اُس کا مسلک یہ ہے کہ جب تک زمامِ حکومت فلسفی بادشاہوں کے ہاتھ میں نہیں دی جائے گی معاشرے کی بُرائیوں کا خاتمہ نہیں ہو گا۔ اُس کے سیاسی اور معاشرتی استدلال کا مقصود عدل و انصاف کا قیام ہے۔ ہر شخص کا اپنی صلاحیتوں کے مطابق معاشرتی فرائض کو انجام دینا ہی افلاطون کے خیال میں عدل و انصاف ہے۔ افلاطون کی درس گاہ کو اکیڈمی کہا جاتا تھا جس میں صدیوں تک اُس کے افکار کی تدریس و اشاعت ہوتی رہی۔

ارسطو اپنے اُستاد افلاطون کے برعکس تحریر میں رنگینی اور خیال آفرینی کا قائل نہیں تھا۔ اُس کا اسلوب بیان سادہ اور خشک ہے۔ وہ ماقل و دل کا قائل ہے۔ اُس نے اپنے اُستاد کے نظریۂ مثالیت پر معرکہ آرا نقد لکھا۔ وہ بھی افلاطون کی طرح مثالیت پسند ہی ہے لیکن اُس کی مثالیت میں حقیقت پسندی کا عُنصر موجود ہے۔ ارسطو

نے کہا کہ جیسا کہ افلاطون کا دعویٰ ہے امثال سراسر غیر مادی نہیں ہیں۔ مثل[1] کو مادے سے جدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ مثل مادے ہی میں مضمر ہے اور اسی کا حصول مادے میں حرکت پیدا کرتا ہے جو عملِ ارتقا کا باعث ہوتی ہے۔ ارسطو نے رُوح کی تعریف میں کہا کہ رُوح کسی ذی حیات میں وہ حرکی عنصر ہے جو اُسے اپنی ہیئت یا فارم کی تکمیل پر اُکساتا رہتا ہے۔ جسم کے ساتھ رُوح کا تعلق وہی ہے جو آنکھ کے ساتھ بصارت کا ہے۔ رُوح کے تین مدارج ہیں نامیہ، حسی اور ناطقہ۔ جس طرح رُوح جسم کی فارم یا ہیئت ہے اسی طرح خُدا کائنات کی ہیئت ہے۔ ارسطو شخصی خُدا کا قائل نہیں ہے۔ وہ اسے علت العلل یا محرّک غیر متحرک کہتا ہے۔ ارسطو کو دنیائے فلسفہ میں منطق، جمالیات، اخلاقیات اور سیاسیات کا مدوّن سمجھا جاتا ہے۔ اخلاقیات میں اُس نے اعتدال کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ وہ کہتا ہے کہ انسان بالطبع مسرت کا طالب ہے اور اعلیٰ مسرت صرف فلسفیانہ تفکر و تعمق ہی سے میسّر آ سکتی ہے۔ اُس کے خیال میں اخلاق اور سیاسیات باہم گر وابستہ ہیں۔ جو شخص اچھا شہری نہ ہو وہ بااخلاق نہیں ہو سکتا۔ مسرت حظ و لذت سے مختلف ہے اگرچہ "مسرت میں حظ کا عنصر لازماً موجود ہوتا ہے۔" المیہ کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ المیہ رحم اور خوف کے جذبات کو اُبھار کر اُن کی تنقیح کرتا ہے۔ آرٹ اُس کے خیال میں محاکات یا نقالی ہے لیکن ظاہر کی نقالی نہیں بلکہ کسی شے کی ہیئت یا فارم کی نقالی ہے۔ مذہب میں وہ رُوح کی بقا کا منکر تھا۔ ارسطو کا اندازِ نظر اپنے اُستاد کی بہ نسبت زیادہ تحقیقی اور حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ حیاتیات، حیوانیات اور ارضیات میں بھی دلچسپی لیتا تھا اور ان کے متعلق حقائق اور شواہد جمع کرتا رہتا تھا۔ اُس نے عام پڑھے لکھے لوگوں کی سہولتِ فہم کے لیے ستائیس مکالمات فلسفے پر لکھے تھے جو وحشیوں کی تُرکتازی میں تلف ہو گئے۔ اُس کے فلسفے کو مشائیت کہا گیا ہے کیوں کہ وہ درس دیتے وقت

---

[1] اس نے مثل کو FORM بھی کہا ہے اور IDEA بھی۔

اِدھر اُدھر ٹہلتا رہتا تھا۔ ارسطو کی ذات پر فلسفۂ یونان کا عظیم دور ختم ہوگیا۔

سائنس اور فلسفے کے ساتھ ساتھ قدمائے یونان نے تاریخ نگاری کے اصول بھی وضع کیے۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ وہ پیریکلیز کا معاصر تھا۔ اُس نے مصر، بابل اور فنیقیہ کی سیاحت کی اور اُن کے تمدن کا بھرپور نقشہ کھینچا۔ وہ کہتا ہے کہ مشرق و مغرب کی طویل کشمکش کا آغاز محاصرۂ ٹرائے سے ہوا تھا۔ دوسرا مورخ تھکی دیدیس حقائق کی جرح و تعدیل میں ہیروڈوٹس سے زیادہ محتاط ہے۔ وہ ہیروڈوٹس کی طرح جا و بے جا اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنے کے بجائے واقعات کو من و عن بیان کر دیتا ہے۔

ہپوقریطیس (بقراط) طبِ یونان کا بانی ہے۔ قدیم مصری طبیب اپنی حذاقت کے لیے دور دور مشہور تھے۔ بقراط نے اپنے اصولِ علاج اُنہیں سے اخذ کیے تھے لیکن مریضوں کے ذاتی مشاہدے سے جو نتائج اُس نے اخذ کیے وہ زیادہ قابلِ قدر ہیں۔ بعد میں اُس کے اصولِ علاج کو جالینوس (گیلے نس) نے اپنا لیا اور اُن پر اضافے بھی کیے۔ ہمارے یہاں کے یونانی اطباء بقراط اور جالینوس کی طبی روایات کے ترجمان سمجھے جا سکتے ہیں۔

قدمائے یونان نے فنونِ لطیفہ میں بھی شاہکار پیش کیے۔ شاعری میں ہومر کو رزمیہ کا امام مانا گیا ہے اُس نے اِلیڈ میں جنگ ٹرائے کے مناظر بڑے پُرشکوہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ ہیکٹر اور پیٹروکلس کی جنگ، ہیکٹر کا اکیلیس کے ہاتھوں مارا جانا، ساحلِ بحر کی خون آشام جنگِ مغلوبہ، ٹرائے کی تسخیر اور قتلِ عام کی تصویر کشی ہومر کی قدرتِ بیان اور شعر توانائی پر دلالت کرتی ہے۔ پنڈار کے گیت بڑے ولولہ انگیز ہیں۔ آرکی لوکس شاعر کے متعلق کسی نے ارسطو فینیس سے پوچھا "اُس کی کون سی نظم آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے" اُس نے جواب دیا "جو سب سے طویل ہے" ہیزیڈ شاعر کے اسالیبِ بیان نے اہلِ مغرب کے احیاء العلوم کے دور کے شاعروں کو متاثر کیا۔ یونانیوں کی غنائی شاعری بڑی دلکش تھی۔ جزیرہ لزباس کی مشہور شاعرہ سیفو کی نظموں میں عشق جنوں پرور اور والہانہ شیفتگی کی اُستادانہ

ترجمانی کی گئی ہے۔ سیفو نے فلسفے اور فنونِ لطیفہ کی تدریس کے لئے لزباس میں ایک درس گاہ کھولی تھی جس کی حسین طالبات سے وہ عشق کیا کرتی تھی[1] اور اُن کے فراق میں دلدوز نظمیں لکھتی تھی۔ اہلِ یونان موسیقی کے بھی دلدادہ تھے۔ اُن کے ہاں کمانچہ نہیں تھا بربط کے تاروں کو انگلیوں یا مضراب سے چھیڑتے تھے۔ اُن کے ایک ساز LYRE ہی کے نام پر غنائی نظم کو LYRIC کہا جانے لگا یعنی وہ نظم جو ساز کے ساتھ گائی جا سکے۔ دیہات میں القوزہ بجاتے تھے۔ سپارٹا میں اجتماعی ناچوں کا رواج تھا۔ سُقراط بھی رقص کیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ رقص سے تمام جسمانی اعضاء کی ورزش ہو جاتی ہے۔ موسیقی کا لفظ یونانی زبان سے ماخوذ ہے[2] اہلِ یُونان عارفیوس کو مثالی موسیقار مانتے تھے۔ یُونانِ قدیم کی مصوّری کے بہت کم نمونے دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہے ہیں۔ یُونانیوں کا سب سے بلند پایہ مصوّر اپلیس تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک دفعہ اُس نے سکندرِ اعظم کے گھوڑے بوسی فیلس کی تصویر بنائی۔ سکندر نے دیکھی تو پسند نہ آئی لیکن بوسی فیلس اُسے دیکھ کر ہنہنانے لگا۔ مصوّر نے کہا "جہاں پناہ! آپ کا گھوڑا بہتر نقاد ہے" اُسے شبیہ میں شخصیت و کردار کے دکھانے میں کمال حاصل تھا۔

جن فنون نے یُونان کے آرٹ کو ضرب المثل بنا دیا وہ اُن کی تمثیل نگاری اور سنگ تراشی ہیں یونانیوں کے مجسّمے تناسبِ اعضاء اور حُسن و جمال کے مثالی نمونے سمجھے جاتے تھے۔ یُونانی ورزش اور کھیل کود کے شیدائی تھے اور جسم کے خطوط کی رعنائی کو برقرار رکھنے میں بڑا اہتمام کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے دیوتاؤں کے مجسّمے اپنے ہی خوبصورت جسم پر تراشے تھے "ڈسکس پھینکنے والا" اور "وینس دی مائلو" مردانہ اور نسوانی حُسن کے بہترین نمونے ہیں مصری یک رُخے مجسمے تراشا کرتے تھے،

---

[1] اسی رعایت سے عورتوں کے ہم جنسی عشق کو LESBIAN کہا جاتا ہے۔

[2] MUSIKE یعنی جو فنونِ لطیفہ کی نو دیویوں MUSES سے منسوب ہو۔

یونانیوں نے اپنے مجسموں میں ہر رُخ اور ہر زاویے کو دکھایا ہے اس لئے اُن کی سنگ تراشی میں زیادہ لچک اور نفاست پیدا ہوگئی ہے۔ یونانی عورتیں اپنی خواب گاہوں میں اپالو، زوس اور ایراس کے مرمریں مجسّمے رکھتی تھیں تاکہ انہیں دیکھتے رہنے سے اُن کے ہاں بھی خوبصورت بچے پیدا ہوں۔ نوجوان کھلاڑی ناچوں اور کھیلوں میں برہنہ ہو کر حصہ لیتے تھے مقصد اس کا یہ تھا کہ ہر شخص اپنے تناسب اعضاء اور رعنائی خطوط کو برقرار رکھنے کے لئے ورزش کرتا رہے۔ پیریکلیز کے عہدِ حکومت میں سنگ تراشی کا فن اپنی معراج کو پہنچ گیا۔ اِس دَور کے مجسّمے اپنے خطوط کی دلآویزی کے لئے خاص طور سے مشہور ہیں۔ پیریکلیز نے ایتھنز کی سرپرست دیوی پارتھے ناس کے نام پر پارتھے نوں کا معبد تعمیر کرایا تھا۔ ۴۴۷ (ق م) میں اکٹی ناس نے فیدیاس کی نگرانی میں معبد کی تعمیر شروع کی۔ اس کے در و دیوار پر حسین برجستہ نقوش کندہ کئے گئے۔ اس معبد کی دیواروں کے کچھ ٹکڑے برٹش میوزیم میں محفوظ ہیں۔ پارتھے نوں کی تکمیل ۴۳۸ء (ق م) میں ہوئی۔ اِسے یونانی فنِ تعمیر اور سنگ تراشی کا شاہ کار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اسالیب ایسے مقبول ہوئے کہ روم کے محلوں سے لے کر ورسائی کے قصر تک میں اِن کی تقلید کی گئی ہے۔ اِسی دَور کے ایک اُستاد پراکسی طیلس کے بارے میں وِل ڈیوراں لکھتے ہیں[۱]

"پراکسی طیلس نے اپنے مجسّموں میں نفس پرور حسنِ نسوانی اور عشق انگیز رعنائی کی نقش گری کی ہے۔ اُس نے حُسن کی دیوی افرودائٹی کا شہرۂ آفاق مجسمہ اپنی پری تمثال محبوبہ فرنی کو سامنے کھڑا کر کے تراشا تھا۔ ایک دن فرنی نے پراکسی طیلس سے پوچھا "تمہارا حسین ترین مجسّمہ کون سا ہے۔ پراکسی طیلس کو معلوم تھا کہ وہ اُس کا بہترین مجسّمہ لینے کی خواہش مند ہے۔ اُس نے جواب دیا تم خود نگار خانے میں جا کر انتخاب کر لو"۔ ایک دن فرنی گھبراہٹ کے عالم میں دوڑتی ہوئی پراکسی طیلس کے پاس آئی اور کہا تمہارے نگار خانے میں آگ لگ گئی ہے اور چاروں طرف شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ پراکسی طیلس

---

[۱] LIFE OF GREECE.

کے منہ سے بے اختیار نکلا "آہ میرا ساٹر اور ایراس جل گئے تو میں تباہ ہو جاؤں گا" اس ترکیب سے فرنی نے اس کی ذاتی پسند معلوم کرلی اور ایراس کا مجسمہ مانگ لیا۔"

فیدیاس نے زوس کا وہ شہرۂ آفاق مجسمہ تراشا تھا جس کی بلندی ساٹھ فٹ تھی اور جو عجائباتِ عالم میں شمار ہوتا تھا۔ یہ شہکار بھی دستِ بردِ زمانہ کا شکار ہو گیا۔

یونانی المیہ کی بنیاد مذہب اور دیومالا پر رکھی گئی تھی۔ یونانی ڈرامے کے موجد ہیں۔ ڈرامہ کی داغ بیل چھٹی صدی عیسوی (ق م) میں ڈالی گئی۔ دیونیسس کے تہوار اور جلوس میں جو واقعات پیش آتے تھے انہیں "ڈرومینا" کہتے تھے جس کا لغوی معنیٰ ہے "باتیں جو ادا کی جائیں"۔ لفظ ڈرامہ اسی کی ایک صورت ہے جس کا معنیٰ ہے "عمل"۔ یونانی تمثیل کے تین عناصر ترکیبی تھے: عمل، شاعری اور موسیقی۔ ان سب میں عمل کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ عام طور سے دیونیسس کے معبد کے قریب تھیٹر میں ڈرامے کھیلے جاتے تھے۔ سٹیج پر چند آدمی مل کر کورس[1] بناتے تھے۔ ایکٹر المیے اور فرحیے دونوں میں چہرے پر نقاب[2] اوڑھ لیتا تھا اور اپنے منہ میں پیتل کی پتی رکھتا تھا جس سے اس کی آواز گونج کر دور دور تک پہنچ جاتی تھی۔ کوئی تمثیل شاذونادر ہی دوسری بار دکھائی جاتی تھی۔ ۴۸۰ء اور ۳۸۰ (ق م) کے درمیان دو ہزار ڈرامے ایتھنز میں سٹیج کئے گئے تھے۔ جو شخص کورس کا جواب دیتا تھا اُسے ہپوکرائٹ[3] کہتے تھے سٹیج کے عقب میں لکڑی کی بنی ہوئی ایک عمارت تھی جو حسب ضرورت مکان یا معبد کو ظاہر کرتی تھی۔ اِسے یونانی زبان میں سکین کہتے تھے۔ یہی لفظ بدل کر سین[4] بن گیا۔ شروع شروع میں صرف کورس ہوتا تھا جو مل کر نظم پڑھتے تھے بعد میں تھیسپس نے کورس سے

---

[1] CHORUS

[2] MASK

[3] HYPOCRITE

[4] SCENE

ایک شخص کو الگ کر کے اسے ایکٹر بنا دیا۔ اسکیلس نے دوسرے ایکٹر کا اضافہ کیا اور اس طرح ڈیونیسی انشاد نے تمثیل کی صورت اختیار کر لی۔ بعض اوقات کورس کے لیڈر کو تیسرا ایکٹر بنا لیا جاتا تھا۔ چھوٹے موٹے کرداروں لونڈیوں، غلاموں، سپاہیوں وغیرہ کو ایکٹروں کے زمرے میں شمار نہیں کرتے تھے۔ یونانی سٹیج پر کشت وخون اور مار کٹائی کے مناظر نہیں دکھائے جاتے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔

یونانی تمثیل کا بنیادی موضوع انسانوں اور دیوتاؤں کے مابین آویزش یا مقدر کے خلاف انسان کی کشمکش کو دکھانا تھا۔ المیہ نگاروں کا پسندیدہ موضوع یہ تھا کہ ایک مغرور اور سرکش آدمی کو دیوتاؤں کی جانب سے کڑی سزا ملتی ہے اور یہ عذاب اس کی دانش وخرد کو روشن اور اس کے ضمیر کو بیدار کر دیتا ہے۔ یونانی ڈرامے میں شاعری، عمل، موسیقی اور رقص کا ایسا لطیف امتزاج عمل میں آیا کہ آج تک اس کا جواب نہیں ہو سکا۔ اسکیلس کا شاہکار "قیدی پرومیتھیس" ہے۔ پرومیتھیس کا قصور یہ تھا کہ وہ دیوتاؤں کے مسکن سے آگ چرا لایا اور یہ تحفہ انسان کو دیا۔ اس جرم کی پاداش میں خداوند خدا زیوس نے اسے ایک چٹان سے باندھ دیا اور ایک گدھ کو مامور کیا کہ اس کا دل نوچ نوچ کر کھاتا رہے۔ رات کو پرومیتھیس کا دل پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا تھا اور اگلی صبح وہی گدھ اپنا کام شروع کر دیتا تھا۔ ایک عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ روح فرسا عذاب پرومیتھیس کو مغلوب نہ کر سکا اور وہ برابر زیوس کے خلاف زہر اگلتا رہا۔ اسکیلس نے اپنی "اورستائی تثلیث" (تین ڈراموں کا مجموعہ) میں دکھلایا ہے کہ کس طرح انسان اپنے مقدر کے خلاف کشمکش جاری رکھتا ہے اور کس طرح یہ کشمکش بالآخر مذہب اور تفکر کی کشمکش میں بدل جاتی ہے۔ آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ علم کا حصول دکھ اور اذیت کا باعث ہوتا ہے۔ اسکیلس نے اخلاق و مذہب کے عمیق ترین مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ دیوتاؤں کا وجود، مسئلۂ شر، حب الوطنی، انسانی ذمے داری وغیرہ اس کے عظیم موضوعات ہیں۔ اس کے خیال میں دیوتا عادل اور غالب ہیں اور انسان پر ان کی اطاعت واجب ہے۔ گناہ موروثی ہے لیکن انسان شخصی حیثیت میں

اس کا ذمے دار بھی ہے۔ غرور و تکبر، قتل اور دوسرے سنگین جرائم کا کفّارہ دکھ اور اذیت اٹھانے سے دیا جاتا ہے۔

اِسکیلس کا موضوع آفاقی تھا۔ سوفوکلیز کردار نگاری پر زور دیتا ہے اور اپنی نفسیاتی بصیرت کے باعث آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اِسکیلس روایتی اخلاق کا حامی تھا، سوفوکلیز اِس سے اعتنا نہیں کرتا۔ فرائڈ نے اپنی مشہور 'ایڈیپس کی اُلجھن' اور اُس کا نسوانی پہلو "الیکٹرا کی اُلجھن" سوفوکلیز کے کرداروں سے اخذ کی ہے۔ اُس کی سب سے مشہور تمثیل 'شاہ ایڈیپس' ہے جسے مثالی المیہ قرار دے کر ارسطو نے المیہ نگاری کے اُصول وضع کئے تھے۔ اِس تمثیل کا دوسرا منظر بڑا زوردار اور مؤثر ہے۔ اس میں ایک پروہت شاہ ایڈیپس کے سامنے یہ انکشاف کرتا ہے کہ ایڈیپس نے بے خبری کے عالم میں اپنے باپ کو قتل کرکے اپنی ماں سے نکاح کر لیا تھا۔ کردار نگاری میں سوفوکلیز کا حریفِ غالب یوری پیڈیز تھا۔ سوفوکلیز کہتا ہے "میں اِنسانوں کو ایسے پیش کرتا ہوں جیسے کہ انھیں ہونا چاہیے اور یوری پیڈیز انہیں ایسے پیش کرتا ہے جیسے کہ وہ ہیں۔"

یوری پیڈیز کے المیہ میں یونانی تمثیل نگاری اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ یوری پیڈیز اوائلِ عمر میں فلسفے کا طالبِ علم تھا بعد میں تمثیل نگاری کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ سوفسطائیوں سے متاثر ہوا تھا اور عقلِ انسانی پر کامل اعتماد رکھتا تھا۔ دنیائے ادب میں اُس کی تمثیل میڈیا کو پہلا عشقیہ المیہ کہا گیا ہے۔ اِسکیلس اور سوفوکلیز انضباط کے قائل تھے۔ یوری پیڈیز کہیں کہیں جذبات کی رَو میں بہہ گیا ہے جس بنا پر ارسطو نے اُس پر گرفت بھی کی ہے۔ بعض اوقات وہ عمل کے تقاضوں کو بھی پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اُس کے یہاں تمثیل میں عمل اور کشمکش کے بجائے کردار نگاری پر زور دیا گیا ہے۔ وہ آزاد مشرب ہے اور دیوتاؤں اور دوسرے مذہبی خرافات کا مذاق اڑاتا ہے اور سوفسطائیوں کی طرح کھلم کھلا تشکک کا اظہار کرتا ہے۔ وہ بردہ فروشی کا مخالف ہے اور معاشرے کی اِصلاح و تجدید کی دعوت دیتا ہے۔ عشقیہ تمثیل نگاری میں بقول گوئٹے، شیکسپیئر بھی اُس کی برابری نہیں کر سکا۔ ایک دن گوئٹے نے اِکرمان سے کہا۔ "کیا

اقوامِ عالم میں کوئی تمثیل نگار ایسا بھی ہے جو یوری پیڈیز کی جوتیاں سیدھی کر سکے۔" ایک مفکر کی حیثیت سے بھی اُس کا مرتبہ بلند ہے۔ وہ دیوتاؤں کے وجود کا منکر تھا۔ کہانت کا مخالف تھا اور جنگ و جدال سے نفرت کرتا تھا۔ اُس کا یہ قول بڑا فکرانگیز ہے کہ جمہوریت کے نام پر اُمراء کا طبقہ عوام پر اپنا اقتدار قائم کر لیتا ہے۔

یونانی المیہ کے مقابلے میں فرحیہ کو حقیر جانتے تھے کیوں کہ ابتداء میں فرحیہ المیہ ہی کی ایک معمولی فرع تھی۔ شُدہ شُدہ اُسے مستقل حیثیت دے دی گئی۔ ارسطوفینیس سب سے بڑا فرحیہ نگار تھا۔ وہ قدامت پسند تھا اور کہا کرتا تھا کہ سُقراط، اناک غورس اور پروٹا گورس سوفسطائی تے مذہب کے وہ اصول منہدم کر دیئے ہیں جو معاشرے کے استحکام کا باعث تھے۔ اپنی ایک تمثیل 'بادل' میں اس نے معاصر فلاسفہ کا مذاق اڑایا ہے۔ اس کا ایک منظر یہ ہے کہ سُقراط نے فضل فروشی کی دکان کھول رکھی ہے جس میں ہر جھوٹے سچے دعوے کے ثبوت فراہم کئے جاتے ہیں ایک نووارد جماعت کے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور دیکھتا کیا ہے کہ سُقراط ایک ٹوکرے میں بیٹھا چھت سے لٹک رہا ہے اور اپنے خیالات میں کھویا ہوا ہے۔ اُس کے شاگرد زمین پر سجدے میں گرے ہوئے ہیں۔ نووارد پوچھتا ہے" یہ لوگ کیوں سربسجدہ ہیں"۔ جواب ملتا ہے " زمین دوز حالات کا مطالعہ کر رہے ہیں"۔ وہ کہتا ہے " اِن کے چوتڑ آسمان کی جانب کیوں اُٹھے ہوئے ہیں؟" جواب ملتا ہے " افلاک کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔" بقول ارسطو فرحیہ کا آغاز اُن فحش گیتوں اور سُوقیانہ کود پھاند سے ہوا تھا۔ جو لنگ کے جلوس میں شرکت کرنے والے گیا کرتے تھے۔ ارسطوفینیس کے ہاں بعض مقامات خاصے فحش ہیں۔ یونانیوں میں فحاشی کو فرحیہ کا لازمہ سمجھا جاتا تھا۔

یونانی معاشرہ دو طبقات پر مشتمل تھا: آزاد شہری اور غلام۔ بعض ریاستوں میں غلاموں کی تعداد آزاد شہریوں سے زیادہ تھی۔ جنگی قیدیوں سے کاشتکاری کا کام لیتے تھے۔ املاک پر چند بڑے بڑے خاندان متصرف تھے جن کے ہاتھوں میں حکومت کے نظم و نسق کی باگ ڈور بھی تھی۔ یونان میں جزائرِ ایجین سے لے کر ساحلِ ایشیا اور اطالیہ تک سینکڑوں چھوٹے بڑے شہر آباد

تھے۔ ہر شہر ریاست کہلاتا تھا۔ بڑے شہر ایتھنز اور سپارٹا تھے جن کے طرزِ حکومت، علوم و فنون اور معاشرت و تمدن کی نقالی باقی ریاستیں کرتی تھیں۔ سپارٹا والے مشہور جنگ جُو تھے۔ شاہ لئکرگس کے دستورِ قوانین کے مطابق شہریوں کو زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت سے منع کر دیا گیا تھا۔ یہ کام غلاموں کے سپرد تھے۔ سپارٹا میں سونے چاندی کی بجائے لوہے کا سکّہ چلتا تھا تاکہ لوگ حُبِّ زر و مال سے محفوظ رہیں۔ بچے کو پیدائش کے دن ہی سے سپاہیانہ زندگی کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ کمزور اور ناقص الاعضا بچوں کو ولادت کے وقت ہی جان سے مار دیتے تھے۔ لڑکوں کو گھروں سے الگ تھلگ فوجی بارکوں میں رکھا جاتا تھا جہاں اُن کی کڑی تربیت کی جاتی تھی۔ اُنہیں صبح و شام کھیلوں میں مصروف رکھتے تھے اور ہتھیاروں کا استعمال سکھاتے تھے۔ تمام نوجوان ریاست کی املاک تھے۔ ماں باپ کے پاس جانے کی اجازت اُنہیں شاذ و نادر ہی ملتی تھی۔ سپارٹا کی عورتیں جنگ پر جاتے وقت اپنے بیٹوں سے کہا کرتی تھیں "اپنی ڈھال کے ساتھ آنا یا ڈھال پر (مر کر) آنا"۔ نوجوان لڑکیوں کو بھی لڑکوں کے دوش بدوش ورزشی کھیلوں میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ خاص خاص تہواروں پر وہ حالتِ برہنگی میں اجتماعی ناچوں میں حصہ لیتی تھیں۔ سپارٹا میں تجرّد کو جُرم سمجھا جاتا تھا۔ مجرّد رائے دہندگی کے حق سے محروم تھے۔ ہر سال شدید جاڑے میں اُن کے کپڑے اُتروا کر اُن کا جُلوس نکالتے تھے۔ شادی بعض اوقات یوں کی جاتی تھی کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو برابر برابر تعداد میں ایک اندھیرے کمرے میں بند کر دیتے تھے۔ جس لڑکے کا ہاتھ جس لڑکی پر جا پڑتا تھا وہ اُس سے شادی کر لیتا تھا۔ سپارٹا والے کہتے تھے کہ اِس نوع کا انتخاب اندھی محبت کے انتخاب سے بہر نوع بہتر ہوتا ہے۔ شادی کے بعد بھی دُلہا فوجی بارک میں رہتا تھا۔ اور راتوں کو چوری چھُپے اپنی بیوی سے مِلتا تھا۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہتا۔ پلوٹارک[1] کہتا ہے کہ بعض اوقات اُن کے ہاں بچے بھی پیدا ہو جاتے حالاں کہ اُنہوں نے ایک

---

[1] LIVES

دوسرے کی شکل تک نہ دیکھی ہوتی تھی۔ طلاق خلاف قانون تھی اور بھائی اپنی بیوی کا اشتراک دوسرے بھائیوں سے کرتے تھے۔ جو شخص بلا وجہ اپنی بیوی کو چھوڑ کر کسی اور عورت کا پیچھا کرتا اُسے سزا دی جاتی تھی۔ کاہلی اور بے کاری خلاف قانون تھی۔ جن لوگوں کی توند بڑھ جاتی انہیں جلا وطن کر دیتے تھے۔ کوئی شخص بیمار یا کمزور ہوتا تو وہ اپنی بیوی کو اجازت دے دیتا کہ کسی طاقت ور شخص کے پاس جا کر صحت مند اولاد حاصل کرے۔ لکرگس عصمت و عفت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور کہا کرتا تھا "وہ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ اپنے کتوں اور گھوڑوں کی جفتی بہترین جوڑے سے کراتے ہیں اور اس پر روپیہ بھی صرف کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں کو گھروں میں بند کر دیتے ہیں کہ صرف اُن کے شوہر ہی جو ممکن ہے احمق ہوں اُن سے اولاد پیدا کر سکیں"۔ ہم جنسی محبت کا رواج عام تھا۔ ہر نوخیز لڑکے کو ایک معلّم کی تحویل میں دے دیا جاتا تھا جو اُس کی تربیت کا ذمے دار تھا اور اُس سے محبت کا دم بھرتا تھا۔ اگر میدان جنگ میں کوئی نوجوان بزدلی اور کم ہمتی کا اظہار کرتا تو اُس کے معلّم کو سزا دی جاتی تھی۔ اس قسم کے جوڑے پیار کے رشتے میں بندھے ہوتے تھے اس لئے میدانِ جنگ میں ایک دوسرے پر پروانہ وار جانیں نثار کرتے تھے۔ ریاست تھیباس کا مشہور "دستۂ مقدّس" اسی قسم کے جوڑوں پر مشتمل تھا۔ یہ دستہ جس جنگ میں شریک ہوتا تھا فتح و نصرت اُس کے قدم چومتی تھی۔ افلاطون کا مثالی معاشرہ سپارٹا ہی کے معاشرے کا چربہ ہے جس میں سپارٹا والوں کے اشتراکِ نسواں، اشتمالیت اور جنگی تربیت کے عناصر موجود ہیں۔

یونانی ریاستوں میں ایتھنز کو سب سے زیادہ شہرت اور عظمت نصیب ہوئی۔ پیریکلیز کے دورِ حکومت کو بجا طور پر یونان کی تاریخ کا دورِ زرّیں کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں فلسفہ، تمثیل نگاری، فنِ تعمیر اور سنگ تراشی معراجِ کمال کو جا پہنچے تھے۔ انگریز شاعر شیلے نے پیریکلیز کی پیدائش اور سقراط کی موت کے درمیانی دور کو تاریخ عالم کا یادگار زمانہ کہا ہے۔ پیریکلیز علوم و فنون کا بڑا فیاض سرپرست تھا۔ وہ فیدیاس اور نسی کلیز جیسے عظیم سنگ تراشوں

کا مربی تھا۔ اناکساغورس اور سقراط اُس کے دلی دوست تھے۔ پیریکلیز کی محبوبہ اسپاشیا فنونِ لطیفہ کے علاوہ فلسفے سے بھی شغف رکھتی تھی اور اپنے مکتب میں درس دیا کرتی تھی۔ سقراط جیسے یگانۂ روزگار بھی اُس کی تقریروں کو غور سے سنتے تھے۔ اسپاشیا کا دیوان خانہ اہلِ کمال کا مرجع بن گیا تھا جہاں ہر روز فلسفی، تمثیل نگار اور فن کار مل بیٹھ کر علم و فن کے رموز و نکات بیان کرتے تھے۔ اسپاشیا اربابِ نشاط کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ پڑھی لکھی اور آزاد کسبیوں کو ہِٹیرے کہتے تھے۔ آلی ٹرائڈز گانے اور ناچنے والی رنڈیاں تھیں۔ سب سے گھٹیا طبقہ اُن ٹکیوں کا تھا جو بردہ فروشوں کے بازار اور ساحلِ سمندر کے قحبہ خانوں میں بیٹھتی تھیں۔ یونانی اپنی بیاہتا عورتوں کو پردے میں رکھتے تھے اور اُنہیں پڑھانا لکھانا غیر ضروری خیال کرتے تھے۔ صرف اربابِ نشاط ہی کو فنی تربیت اور حصولِ علم کے مواقع میسّر آتے تھے۔ تھکی دیدیس مورّخ نے کہا ہے "شریف عورت کو پردے میں رہنا چاہیئے" مشہور یونانی خطیب ڈیماستھنیز کہتا ہے "ہمارے ہاں لطف اندوز ہونے کے لئے کسبیاں ہیں، صحت کو بحال رکھنے کے لئے لونڈیاں اور اولاد پیدا کرنے کے لئے بیویاں ہیں"۔ اربابِ نشاط کے سب سے بڑے حریف سادہ عذار خوبصورت لڑکے تھے جن سے اظہارِ عشق کرنا آدابِ معاشرہ میں داخل تھا۔ یونانی ہم جنسی محبت کو باعثِ ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے بلکہ شیوۂ مردانگی قرار دیتے تھے۔ اِس قسم کے معاشقوں کا اظہار برملا کیا جاتا تھا۔ افلاطون نے اپنے ایک مکالمے 'فیدرا' میں ہم جنسی عشق کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔

جہاں تک عام اخلاق کا تعلق ہے ایرانیوں کو یونانیوں پر برتری حاصل تھی۔ یونانیوں کے معاہدوں اور قول و قرار کا اعتبار نہیں کیا جاتا تھا ۱۵ اُن میں غداروں کی کمی نہ تھی۔ جنگِ ایران و یونان میں سینکڑوں یونانی ایرانیوں کی فوج میں بھرتی ہو کر اپنے ہم وطنوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے تھے۔

---

۱۵ آج بھی جوئے میں دھوکا دینے والے کو GREEK کہتے ہیں۔

جب سپارٹا کے سردار فوبائڈیس نے عہد کے باوجود تھیباس کے قلعے پر قبضہ کر لیا تو کسی نے کہا یہ حرکت نہایت نامناسب ہے۔ جواب ملا "جو بات میرے ملک کے حق میں مفید ہے وہی درست ہے" اس کے برعکس ایرانی پاسِ عہد و پیماں کے لئے ضرب المثل تھے۔ وہ جان پر کھیل جاتے تھے لیکن کسی بھی صورت میں عہد شکنی نہیں کرتے تھے۔

یونانی قانون سازوں میں سپارٹا کا لکرگس اور ایتھنیز کا سولن مشہور ہیں۔ لکرگس کا ذکر ہو چکا ہے۔ سولن بڑا روشن خیال تھا۔ اُس کا قول ہے

"نا مستحق امیر بن گئے ہیں اور مستحق نادار ہیں لیکن ہم اُس سے جو امراء کے پاس ہے اُس کا جو ہمارے پاس ہے تبادلہ نہیں کریں گے کیونکہ ذاتی قابلیت برقرار رہتی ہے اور روپیہ ایک کے پاس سے دوسرے کے پاس منتقل ہوتا رہتا ہے۔"

سولن کے ضابطۂ قوانین میں کاہلی اور بے کاری جرم تھی۔ اُس نے ایک قانون یہ بنایا کہ جو شخص اپنے ملک کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے اُس کی بیوی بچوں کی کفالت ریاست کو کرنا ہوگی۔ جب اُس سے پوچھا گیا کہ ایک اچھی ریاست کی تعریف کیا ہوگی تو اُس نے جواب دیا "جس میں عوام حکّام کے تابع ہوں اور حکّام قوانین کا احترام کریں"۔ وہ جانتا تھا کہ صرف قوانین بنانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُن پر عمل کرانا بھی ضروری ہے۔ اُس کا قول ہے" قانون مکڑے کا جالا ہے جو ننھے مُنّے کیڑوں پتنگوں کو پکڑ لیتا ہے لیکن بڑے بڑے کیڑے اور بھونرے اُسے توڑ کر صاف نکل جاتے ہیں"۔ جب اُسے ڈکٹیٹر بننے کے لئے کہا گیا تو وہ بولا "ڈکٹیٹری بلاشبہ ایک بلند مقام ہے لیکن افسوس کہ اس سے نیچے اُترنے کا کوئی راستہ نہیں ہے"۔

ایتھنیز میں قید کی سزا نہیں دی جاتی تھی تاکہ ریاست پر بار نہ پڑے۔ مجرم کو جان سے مار دیتے تھے یا جلا وطن کر دیتے تھے۔ شہر میں خفیہ جماعتیں موجود تھیں جن کے اجلاس راتوں کو چوری چھپے ہوتے تھے۔ اُمراء نے الگ ایک خفیہ جماعت بنا رکھی تھی تاکہ عوام آمادۂ بغاوت ہوں تو انہیں کچل دیا جائے۔ معماروں اور سنگ تراشوں کی بھی خفیہ تنظیمیں تھیں۔ آج کل کے فری میسن

انہیں کے جانشین ہیں۔

قدیم یونانی ریاستوں میں اُلمپک کے کھیل بڑے مقبول تھے۔ ان میں شرکت کرنے کے لئے دُور دُور سے کھلاڑی آتے تھے اور بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ دوڑوں کے علاوہ ڈسکس پھینکنے، نیزہ پھینکنے اور کشتیوں کے مقابلے ہوتے تھے[1]۔ اس زمانے کے جو مجسّمے ہم تک پہنچے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کیسے کیسے جوانانِ رعنا اِن مقابلوں میں شریک ہوتے تھے۔ جیتنے والے کو جنگلی لارل کے درخت کی ٹہنیوں اور پتّوں کا تاج پہنایا جاتا تھا۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا انعام ہے لیکن یونان میں اِس سے بڑا اعزاز اور کوئی نہ تھا۔ ہمارے زمانے میں اِن کھیلوں کا اِحیا ہُوا ہے اور اِن میں اُسی ذوق و شوق سے شرکت کی جاتی ہے جس کا مظاہرہ قدمائے یونان کیا کرتے تھے۔ اہلِ یونان کی اوّلیات نہایت گراں قدر ہیں۔ سائنس اور فلسفے کو سب سے پہلے یونانیوں نے قدیم مذہب اور دیو مالا کے خرافات و اوہام سے جدا کر کے انہیں تحقیقی بنیادوں پر مرتّب کیا اور فطری مظاہر کی علمی توجیہہ کی۔ اُن کی فلسفیانہ بصیرت کا عالم یہ تھا کہ اب تک فلسفے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے یا لکھا جا رہا ہے وہ یونانیوں ہی کے افکار کی تشریح و توضیح ہے۔ اُنہوں نے مابعدالطبیعیات، منطق، جدلیات، سیاسیات، اخلاقیات، جمالیات، نقدِ ادب، طب، ہندسہ وغیرہ کے علوم کی تحقیقی نقطۂ نظر سے تدوین کی۔ ادبیات میں وہ رزمیہ کے بانی ہیں اور تمثیل نگاری کے مخترع ہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے مبادیات اُنہوں نے مرتّب کئے۔ فنِ تعمیر اور سنگ تراشی میں اُن کے حسین شاہکار صدیوں سے اربابِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اعتدال، تناسب اور توافق کو حُسن و جمال ادبی و فنّی تخلیقات کا مرکزی نقطہ قرار دے کر ایک ایسی روایت قائم کی جو ہمیشہ کے لئے فن کاروں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی رہے گی۔ سب سے آخر لیکن سب سے اہم تاریخِ عالم میں پہلی جمہوریت ایتھنز میں قائم کی گئی جو کئی پہلوؤں سے ناقص تھی لیکن صدیوں کے مقہور و مظلوم عوام کے ذہن و دماغ میں اُسی

---

[1] ATHLETE کا لفظ ATHLOS سے ہے جس کا معنیٰ ہے "مقابلہ کرنا"

کے طفیل اپنے حقوق کا شعور پیدا ہوا تھا۔ اشتمالیت کا تصوّر بھی یونانیوں سے یادگار ہے۔ یونانی علوم کے احیاء نے اہلِ مغرب کو اور اُن کے ساتھ تمام اقوامِ عالم کو ازمنۂ وسطیٰ کی اتھاہ تاریکیوں سے نکال کر جدیدیت کی راہ دکھائی تھی اور سائنس اور فلسفے کو نئی زندگی بخشی تھی۔ جہاں تک اجتہادِ فکر کا تعلق ہے وہ معاصرین میں بھی منفرد تھے۔ اور علوم کی بے پناہ ترقی کے باوجود آج بھی منفرد سمجھے جا سکتے ہیں۔

ایران

ایران براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحیرۂ کیسپین اور جنوب میں خلیج فارس ہے۔ اس کا کل رقبہ چھ لاکھ اٹھائیس ہزار مربع میل ہے لیکن رقبے کے لحاظ سے آبادی کم ہے۔
ایران ایک سطح مرتفع ہے۔ شمال میں کوہ البرز دیوار کا کام دیتا ہے۔ سب سے اونچی چوٹی دماوند کی ہے جو اٹھارہ ہزار پانچ سو پچاس فٹ بلند ہے اور سال بھر برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ دماوند ہمالیہ کے بعد ایشیا کا دوسرا سب سے اونچا پہاڑ ہے۔ قدیم ایرانی اسے دیوؤں کا مسکن سمجھتے تھے۔ ایران کی سطح مرتفع سمندر کی سطح سے تین ہزار سے پانچ سو فٹ تک بلند ہے۔ مشرقی حصہ صحرائے لق و دق ہے۔ سب سے بڑا ریگستان لوط کہلاتا ہے۔ پہاڑوں پر درخت کم ہیں، گھاس البتہ اُگتی ہے جس پر بھیڑ بکریاں پالی جاتی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں جا بجا پانی کے چشمے ہیں جو باغوں اور کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں ہر چشمے پر کوئی نہ کوئی گاؤں آباد ہو گیا ہے۔ گرما میں بارش کم ہوتی ہے۔ سرما میں ملک کے مغربی حصے میں پندرہ انچ اور مشرقی حصے میں پانچ انچ کے قریب بارش ہو جاتی ہے۔ سرما میں برف پڑتی ہے اور جاڑا شدید ہوتا ہے۔
بحیرۂ کیسپین کے ساحل کے قریب پچاس انچ سالانہ تک بارش ہوتی ہے۔ سطح مرتفع پر گندم، جَو، مکئی، کپاس اور چقندر کی کاشت ہوتی ہے۔ انگور اور تربوز بھی با افراط اُگائے جاتے ہیں۔ بحیرۂ کیسپین کا علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ یہاں چاول، چائے، تمباکو، گنّا اور پھل پھول اُگائے جاتے ہیں۔
ایران میں دریا کم ہیں اور اُن میں بھی اکثر دلدلوں میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑا دریا زندہ رود ہے جو کوہ بختیاری سے نکلتا ہے اور اصفہان کے نواح کو سیراب کرتا ہے۔ قدیم زمانے

عیلام یا خوزستان کا صوبہ ایران کا سب سے زرخیز علاقہ تھا اور گنے کی کاشت کے لئے مشہور تھا۔ اسی میں نہروں سے آب پاشی کا انتظام کیا گیا تھا۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ یہ نہریں غائب ہوگئیں جس سے علاقے کی زرخیزی ختم ہوگئی۔ سوسہ ایلیم کا دارالخلافہ تھا۔ اِس کا شمار تاریخِ عالم کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ ایران کے مغربی حصے کو میدیا کہتے تھے جس کا پایہ تخت ہمدان تھا۔ یہاں ایرانی روایت کے مطابق پیش دادی سلاطین حکومت کرتے تھے۔ اس خاندان کا پہلا حکمران کیومرث تھا۔ سیستان کا صوبہ بھی تاریخِ ایران میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ اِس کے پہاڑ کوہ خواجہ کو مقدس سمجھتے تھے۔ آج کل اِس علاقے کو دریائے ہلمند نے دلدلی بنا دیا ہے۔

قدیم میدیا تین حصوں میں منقسم تھا، عراقِ عجم، آذربائیجان اور طہران کے نواح کا علاقہ۔ پارس جو بعد میں فارس کہلایا ملک کا ایک صوبہ تھا جس سے دو نامور شاہی خانوادوں ہخامنشی اور ساسانی نے جنم لیا تھا۔ بعد میں سارے ملک کا نام فارس پڑ گیا۔ مشرق میں خراسان۔ خور بہ معنیٰ آفتاب سے۔ کا صوبہ تھا جس کی سرحدیں توران یا ماوراالنہر سے ملتی ہیں۔ قدیم زمانے میں ایرانیوں اور تورانیوں میں صدیوں تک جنگ و جدال کا سلسلہ جاری رہا جس کے واقعات فردوسی نے شاہنامے میں افسانوی رنگ میں لکھے ہیں۔ بلخ یا باختر خراسان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ ایرانی بلخ کو مقدس مانتے تھے کیونکہ زردشت کی آگ پہلے پہل یہیں روشن ہوئی تھی۔

جیسا کہ ایران کے نام سے ظاہر ہے یہ ملک آریاؤں کا وطن بن گیا تھا۔ وسطِ ایشیا سے کم و بیش دو ہزار برس قبل مسیح میں آریاؤں نے خروج کیا جب بابل، مصر، فنیقیہ وغیرہ کے تمدن عروج و زوال کی کئی منزلیں طے کر چکے تھے۔ ان قبائل کے خروج اور آبادکاری کا عمل صدیوں تک جاری رہا۔ کچھ قبائل نے مغرب کا رخ کیا اور یونان تک بڑھتے چلے گئے، کچھ ایران میں آباد ہوئے یا ہند کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس زمانے میں عراقِ عجم پر اشوریوں کی حکومت تھی چنانچہ جس طرح ہندی آریائی قبائل وادیٔ سندھ کے ہڑپائی تمدن سے فیض یاب ہوئے اسی طرح اشوری تمدن، نظامِ حکومت، مذہب اور فنون نے ایرانی قبائل کو متاثر کیا۔ سپائگل کا خیال یہ ہے کہ ۱۰۰۰ ء ق م

تک اشوری اثرات اُن کے معاشرے میں پوری طرح نفوذ کر چکے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ قبائل تمدن زندگی سے روشناس ہوئے اور شہر تعمیر کرکے رہنے لگے۔ ایرانی تاریخ کا پہلا دَور میدیوں کا ہے جنہیں ۵۵۰ ق م) میں ہخامنشی خانوادے کے بانی کوروش کبیر (۵۹ ۵ ۶ – ۵۲۹ ۶ ق م) نے آخری میدی بادشاہ اسٹیاگس کو شکست دے کر میدی حکومت کا خاتمہ کردیا۔ کوروش کبیر بڑا اولوالعزم فاتح تھا۔ اُس نے چند ہی برسوں میں لیدیا سے لے کر ترکستان تک کے ممالک فتح کر لئے۔ بابل کی تسخیر اُس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہودی اُسے اپنا نجات دہندہ اور مسیحا سمجھتے رہے ہیں کیوں کہ اُس نے اُنہیں بابل کی قید سے رہائی دلا کر دوبارہ فلسطین جانے کی اجازت دے دی تھی۔ کوروش بڑا روشن خیال حکمران تھا۔ اُس کا قول ہے کہ جو شخص ذاتی خوبیوں کی بنا پر دوسرے انسانوں سے اعلیٰ و ارفع ہو اُسے حکمرانی کا حق پہنچتا ہے۔

کوروش کے بعد اس کا بیٹا کمبوجیہ تخت نشین ہوا۔ وہ بڑا سفاک اور مغرور تھا۔ اُس نے مصر پر چڑھائی کی اور اُسے فتح کر کے حبشہ پر حملہ کیا جو ناکام رہا۔ اُس کی موت پر امراء نے داریوش کے سر پر تاج رکھا۔ داریوش اول ہخامنشی خاندان کا عظیم ترین بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اُس کے زمانے میں گندھارا، سندھ اور کشمیر کے کچھ علاقے ایرانی سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔ داریوش نے بیستوں کے کتبات میں اُن نئے صوبوں کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے اپنی وسیع سلطنت میں سڑکوں کا جال بچھا دیا اور ان پر سرائیں تعمیر کروائیں۔ اُس کے پُرامن عہد میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ تاجروں کے قافلے چین سے لے کر مصر تک سامانِ تجارت لے جاتے تھے۔ اُس کے عہد کو نظم و نسق کی عمدگی کے لئے بے مثال سمجھا جاتا ہے۔ اُس نے سونے کے سکے ڈھالے۔ دارک سونے کا سکہ تھا اور سگلوس چاندی کا۔ انگریزی پونڈ اور شلنگ ٹھیک دارک اور سگلوس کے ہم وزن ہیں۔ یہودیوں نے سگلوس کا نام شیکل رکھ لیا۔ ایرانیوں اور یونانیوں کی تاریخی چشمک کا آغاز بھی اِسی زمانے میں ہوا۔ چند یونانی لٹیروں نے ساحلِ ایشیائے ایک معبد کو جو ایرانی عملداری میں تھا۔ لوٹ کر اُسے آگ لگادی۔ داریوش نے اُن کی گوشمالی کے لئے

فوج بھیجی لیکن اُس کا وقت آخر آ گیا۔ اُس کے جانشین خشارشیا نے یونان پر چڑھائی کی جس کا ذکر گزشتہ باب میں آ چکا ہے۔ خشارشیا نے اصطخر کا حسین شہر تعمیر کرایا۔ اُس کے کھنڈروں کے خوش وضع ستون آثارِ صنادید عجم میں خاصے اہم سمجھے جاتے ہیں خشارشیا کے جانشین عیش پرست تھے اور عزم و حوصلہ سے عاری تھے۔ ارتا خشارشیا اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اُس نے اپنے قومی معبود اہورا مزدا کے دوش بدوش متھرا دیوتا اور اناہیتا دیوی (ناہید۔ حسن و عشق کی دیوی تھی) کی پوجا کو رواج دیا۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ داریوش سوم نے سکندر سے شکست کھائی اور اپنے ہی ایک امیر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اُس کی موت پر ہخامنشی خاندان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سکندر کے بعد اُس کی وسیع سلطنت کئی صوبوں میں بٹ کر رہ گئی۔ اُس کے سرداروں نے جا بجا اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ بابل اور شمال مغربی ایران سلیوکس کے حصے میں آئے۔ یونانی تسلط کے اس دور میں پارتھیا میں جو آج کل کے خراسان اور استرآباد کے صوبوں پر مشتمل تھا مُلکی سلاطین حکومت کرتے رہے۔ پارتھی ہخامنشیوں کی اولاد ہونے کا دعوے کرتے تھے۔ اُنہیں مؤرخین نے اشکانی بھی کہا ہے۔ عرب انہیں طوائف الملوک کا نام دیتے تھے۔ پارتھی جنگجو بڑے بہادر تھے۔ اُن کے سوار تعاقب کرتے ہوئے دشمن پر سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے مُڑ مُڑ کر تیروں کی بارش کرتے تھے اور شکست کو فتح میں بدل دیتے تھے۔

اُردشیر بابکاں نے ۲۲۶ء میں پارتھی بادشاہ اردوان کو جنگِ ہرمزدگان میں شکست دے کر پارتھی سلطنت کا خاتمہ کیا اور دولتِ ساسانیہ کی بنیاد رکھی۔ اس فتح کی یادگار کو اُس نے نقشِ رستم کے حجری کتبے میں کندہ کرایا۔ اُردشیر بابکاں بڑا بلند ہمت بادشاہ تھا۔ اُس نے کئی نئے شہر تعمیر کرائے اور نہریں کھدوا کر آب پاشی کو فروغ دیا۔ اُس کے جانشینوں میں شاپور اعظم، انوشرواں اور خسرو پرویز نے شہرت پائی۔ شاپور اعظم نے روما کے قیصر ویلیرین کو شکست دے کر قید کر لیا۔ وہ بڑا خوبصورت اور شجاع نوجوان تھا اور لڑائی کی اگلی صف میں لڑتا تھا۔ انوشرواں یا خسرو اوّل کا شمار تاریخ عالم کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔ اُس نے عدل و انصاف

کی شاندار روایات قائم کیں اور رُومیوں کو تابڑ توڑ شکستیں دیں۔ وہ علوم و فنون کا سرپرست تھا۔ اُسے برزویہ اور بزرگ مہر جیسے دانش مند وزیر مل گئے۔ خسرو پرویز اپنی شان و شوکت اور عیش و عشرت کے لئے مشہور ہے۔ بقول طبری اُس کے حرم میں بارہ ہزار منتخب پری چہرہ کنیزیں تھیں جن کی گُلِ سرسبد عیسائی کنیز شیریں تھی۔ خسرو شیریں اور شیریں فرہاد کے معاشقے فارسی شاعری کی تلمیحات بن چکے ہیں۔ خسرو پرویز کے جانشین نااہل ثابت ہوئے اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہو گیا۔ یزدگرد سوم کے عہد میں عربوں کے ہاتھوں دولتِ ساسانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

آشوری اور بابلی بادشاہوں کی طرح شاہانِ ایران کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ مذہب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اُردشیر بابکاں نے مرتے وقت اپنے بیٹے شاپور کو وصیت کی تھی کہ معبد اور تخت کو ایک ہی سمجھنا، یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے، اور ہمیشہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہوتے رہیں گے۔ کسرائے ایران اپنے نام کے ساتھ شہنشاہ قرینِ ستارگاں، برادرِ مہر و ماہ لکھتے تھے انوشرواں نے قیصرِ رُوم کو خط لکھا تو اپنے القاب لکھوائے "وجودِ ربانی، نیکوکار، مُلک کو امن دینے والا، واجب الاحترام، خسرو شہنشاہ، ارجمند، پارسا، فیض رسا، خداؤں کا ہم شکل" خسرو پرویز کے القاب تھے "خداؤں میں انسانِ غیر فانی، انسانوں میں خدائے لاثانی، اُس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع کرنے والا، شب کی آنکھوں کا اُجالا۔" دین کرد میں لکھا ہے "اِس دنیا میں بہترین بادشاہ وہ ہے جو علمائے دین کا مُعتقد ہو، جو اہورا مزدا کے علم و دانش کا جامع ہو"

شاہ ایران مطلق العنان تھا۔ وہ ہر چیز پہ قادر تھا سوائے اِس کے کہ اپنا دیا ہوا حکم واپس نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مافوق الفطرت ہستی سمجھتا تھا چنانچہ جو شخص بارگاہِ عالی میں باریاب ہوتا اُسے بادشاہ کو سجدہ کرنا پڑتا تھا۔ بادشاہ اپنے مُنہ پہ رُومال رکھ لیتا مبادا وہ اُس شخص کے ناپاک سانس سے آلودہ ہو جائے۔ تاجپوشی کی رسم مُوبداں موبد ادا کرتا تھا اِس لئے بادشاہ ہمیشہ اہلِ مذہب کی تالیفِ قلب میں کوشاں رہتا تھا۔

شاہانِ ایران اپنے قول کے بڑے پابند تھے اور معاہدے پر قائم رہتے تھے۔ داریوش اوّل نے اپنے ایک کتبے میں لکھوایا تھا کہ جھوٹ تمام بُرائیوں کی جڑ ہے۔ راست گفتار راست کردار کا معیار ہے۔

شاہانِ ایران نہایت بیش قیمت لباس پہنتے تھے۔ ہیرے جواہرات کے جڑاؤ زیور پہننے کا بھی رواج تھا۔ جب کبھی بادشاہ کسی پر خوش ہوتا وہ اپنا لباس (خلعت بلغوی معنی اُترا ہوا لباس) اُسے بخش دیتا اور وہ خوش نصیب عمر بھر کے لئے فکرِ معاش سے آزاد ہو جاتا تھا۔ تافتہ اور زربفت کے پارچے خاص اہتمام سے شاہی کارخانوں میں بُنوائے جاتے تھے۔ طیسفون (مدائن) کے خزانوں کی چار دانگ عالم میں دھوم تھی۔ طبری اور ثعلبی نے خسرو پرویز کے سات خزانوں کا ذکر کیا ہے۔ سب سے عجیب تخت تاکدیس تھا جس پہ سونے اور لاجورد کا گنبد بنا تھا۔ اس گنبد میں آسمان، ستاروں، برجوں اور سات اقلیموں کی اشکال بنائی گئی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک آلہ تھا جس سے گھنٹوں کا حساب معلوم کرتے تھے۔ فردوسی نے شاہنامے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دہار خسرو (بہار خسرو) وہ ایک تاریخی قالین تھا جو طیسفون کے ایوان میں بچھایا جاتا تھا۔ بلعمی نے اُسے فرشِ زمستاں کہا ہے۔ وہ ساٹھ ہاتھ لمبا اور ساٹھ ہاتھ چوڑا تھا اور اُس پہ باغ کی روشیں، جدولیں، نہریں اور پھولوں کے پودے دکھائے گئے تھے جن کی شاخیں سونے چاندی کے تاروں اور مختلف قیمتی جواہرات کی بنائی گئی تھیں۔ قصہ "شاہ خسرو اور اُس کا غلام" میں خسرو کے غلام خوش آرزو نے شاہانہ لباسوں، کھانوں اور خوشبوؤں کی طویل فہرست دی ہے۔

شاہانِ ایران اپنی رعایا کی حسین لڑکیوں کو حرم سرائے میں داخل کرنا اپنا حقِ خصوصی سمجھتے تھے۔ اُن کے محلوں میں سیکڑوں پری جمال لڑکیاں اُن کے ذوقِ جمال کی تسکین کے لئے موجود رہتی تھیں۔ ان کی حفاظت پر خواجہ سرا مامور تھے۔ ان لڑکیوں کا انتخاب خاصا کڑا تھا۔ مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں۔

"شہنشاہ خشارشیا تاجدارِ ایران کے لیے کسی نئی حسینہ کی تلاش ہوئی۔ بادشاہی غلاموں کی تحریک پر ساری قلمرو میں حکم جاری ہو گیا کہ ہر جگہ حسین اور کنواری لڑکیاں جمع کی

جائیں اور ان میں سے جو جادو نگاہ عورتیں منتخب ہوں وہ لا کے ایوانِ شہریاری میں شاہی خواجہ سراؤں کی زیر نگرانی رکھی جائیں تاکہ وہ انہیں بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کرنے کے قابل بنائے۔ بادشاہ کی خلوت میں پیش ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ہر حسینہ ایک سال تک خواجہ سراؤں کے زیرِ اہتمام رہے جسے چھ مہینے تک مُر اور مُوبان اور عود وغیرہ کی دھونی دی جاتی اور چھ مہینے تک اس کے کپڑے میں عُود، اگر اور دوسری خوشبودار چیزوں کے تیل اور اُبٹنے لگائے جاتے۔" (مضامین)

اس اہتمام کے باوجود کوئی خوش نصیب حسینہ ہی ایک سے زیادہ بار شبستانِ شاہی میں طلب کی جاتی تھی۔ اکثر کنیزوں کی عمریں عالمِ حسرت و آرزو میں سسک سسک کر بیت جاتی تھیں۔ شاہانِ ایران میں فراعینِ مصر کی طرح بعض اوقات اپنی حقیقی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کر لیتے تھے کہ یہ مجوسی مذہب میں جائز تھا۔ بہمن نے اپنی بہن ہما سے شادی کی تھی۔ ارتاخشارشیا نے یکے بعد دیگرے اپنی دو بیٹیوں سے نکاح کیا تھا۔

بادشاہ شکار کے شیدائی تھے۔ بہرام گور کی ساری عمر اسی مشغلے کی نذر ہوگئی۔ شکار کے جانوروں کے لئے ایک سیر حاصل ذخیرہ ارانی مخصوص کر دیتے تھے۔ یہ سبزہ زار میلوں پر محیط ہوتا تھا اور اس کے اردگرد باڑ لگا دی جاتی تھی۔ شکار کے جانور اس میں آزادی سے چرتے پھرتے تھے۔ اس سبزہ زار کو پیرے دوزا کہتے تھے۔ یہ لفظ زینوفون یونانی نے اپنی تحریروں میں برتا اور یونانی پیراڈائز کی صورت میں انگریزی میں آیا۔ شکار کے علاوہ چوگان بڑے شوق سے کھیلتے تھے۔ خسرو پرویز کے احوال میں ہے کہ اس کی محبوبہ شیریں چوگان بازی میں فرد تھی۔ بادشاہوں کو باغ لگانے کا بڑا شوق تھا۔ طیسفون کے باغات نہایت خوش قطع اور نظر افروز تھے۔ شمشاد اور سرو کے درخت چاروں طرف باڑ کے ساتھ ساتھ لگاتے تھے۔ نہر کا پانی نالیوں میں لایا جاتا تھا اور کیاریوں اور روشوں کو سیراب کرتا تھا۔ روشوں اور خیابانوں کی ترتیب اس سلیقے سے کی جاتی تھی کہ باغ پر کسی اقلیدسی شکل کا گمان ہوتا تھا خانہ باغ اور کوشک سنگِ سرخ یا سنگِ مرمر

کے بنائے جاتے تھے۔ مُقطّع کیاریوں میں لالہ، گُل، نرگس، نسترن، کلغہ، نسرین، سمن، نافرمان، خطمی وغیرہ کے پھول اِس قرینے سے اُگائے جاتے تھے کہ دُور سے قوسِ قزح کا شبہ ہوتا تھا۔ مرُورِ زمانہ سے ایرانی باغ کا یہی نقشہ قالینوں کا بھی فنّی پیکر بن گیا۔ ایرانیوں کو شروع سے جاپانیوں کی طرح سرسبز درختوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے محبت رہی ہے۔ میراثِ ایران میں لکھا ہے۔

"خشیارشیا ہخامنشی یورپ پر حملہ آور ہوا تو راستے میں اُس نے شمشاد کا ایک شاندار درخت دیکھا۔ بادشاہ دیر تک اُس کے سامنے کھڑا حالتِ وارفتگی میں اُس کی رعنائی اور خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور آگے بڑھنے سے پہلے اُس کی ٹہنیوں پر طلائی زنجیریں آویزاں کرنے کا حکم دیا"

آج بھی ایران میں ایسے مکانوں کی کمی نہیں جن کے صحن میں جُوئے آب گذرتی ہے، فوارہ چلتا ہے اور پھول اُگائے جاتے ہیں۔ براؤن نے لکھا ہے کہ وہ دیہات میں سے گذرتا تھا تو لڑکے اُسے گلدستے پیش کرتے تھے۔

شاہانِ ایران عدل و انصاف کے قیام میں ہر وقت کوشاں رہتے تھے۔ بد دیانتی اور رشوت خوری کی سزائیں بڑی سخت تھیں۔ ایک دفعہ شاہ کمبوجیہ پر ثابت ہو گیا کہ اُس کا ایک منصف رشوت لیتا ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ منصف کی زندہ کھال کھینچ لی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور یہی کھال اُس مسند پر منڈھ دی گئی جہاں بیٹھ کر وہ عدالت کرتا تھا۔ اس کے بعد کمبوجیہ نے اُسی منصف کے بیٹے کو اپنے باپ کے عہدے پر مامور کر کے وہاں بٹھا دیا۔ تادیبی قوانین سخت تھے۔ بغاوت، نافرمانی، حرمِ شاہی میں تصرّف کرنے، بادشاہ کی تضحیک و توہین کرنے کے لیے موت کی سزا دی جاتی تھی۔ بعض سزائیں نہایت وحشیانہ تھیں۔ مُجرموں کو دیوار میں زندہ گاڑنے، زندہ کھال کھینچوانے اور چومیخ کرنے کی سزائیں سنگین جرائم پر دی جاتی تھیں۔ کشتیوں کا عذاب سب سے خوفناک تھا۔ اردشیر سوم ہخامنشی

کے چھوٹے بھائی کوروش نے اُس کے خلاف بغاوت کی کُنا کسا کے میدان میں گھمسان کا رن پڑا۔
کوروش مردانہ وار لڑتا ہوا بادشاہ کے قریب پہنچ گیا اور اُس پر حملہ کر دیا لیکن ایک سپاہی مہرداد
کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے باغی کو قتل کیا ہے۔ ایک دن
مہرداد شراب کے نشے میں بنکارنے لگا کہ بادشاہ خواہ مخواہ جواں مرد بنا پھرتا ہے کوروش کو میں نے
قتل کیا تھا۔ اردشیر کو خبر ملی تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور حکم دیا کہ اِس گستاخی کی سزا میں مہرداد
کو کشتیوں کا عذاب دیا جائے چنانچہ دو کشتیاں ایک ہی حجم اور صورت کی اس طرح بنوائی گئیں کہ
ایک دوسری پر ٹھیک جفت ہوتی تھیں۔ ایک کشتی میں مہرداد کو لٹا کر دوسری اُس پر مضبوطی
سے جڑ دی گئی۔ مہرداد کے ہاتھ پاؤں اور مُنہ کشتی کے باہر رہا۔ پھر اُسے خوب پیٹ بھر کر کھانا
کھلایا گیا اور ساتھ ہی مُسہل بھی دیا گیا۔ اُس کے چہرے پر شہد مَل دیا گیا جس سے بے شمار کیڑے
مکوڑے اور مکھیاں ہجوم کر آئیں اور اُس کے لب و رُخسار کو کاٹنے لگیں۔ اُدھر مسہل نے اپنا
کام کیا تو نچلی کشتی غلاظت سے بھر گئی۔ دنوں کے گذرنے کے ساتھ اُس میں کرم پیدا ہو گئے
جو مہرداد کی انتڑیوں، دل اور جگر کو چاٹنے لگے۔ مہرداد سترہ دن تک اِس عذاب میں تڑپتا رہا
اور مر گیا۔ بعض اوقات باغیوں کی آنکھیں نکلوا دی جاتی تھیں یا پاؤں میں گھوڑے کے نعل
ٹھونک دیئے جاتے تھے۔

حاکمِ عدالت کا عُہدہ اُن عُہدوں میں سے تھا جو سات ممتاز خاندانوں میں متوارث چلے
آتے تھے۔ منصف کو داذ ور اور سب سے بڑے منصف کو داذ ورِ داذ وراں کہا جاتا تھا۔ ایک
عہدہ آئین بذ کا تھا جو آداب و آئین کا محافظ تھا۔ فوجی عدالت کے عہدہ دار کو سپاہ داذور
کہتے تھے۔ صیغۂ عدالت کے انتہائی اختیارات بادشاہ کے اپنے ہاتھ میں تھے۔ بادشاہ کے
مُنہ سے نکلی ہوئی بات ناقابلِ تنسیخ ہوتی تھی۔ نوروز اور مہرگاں کے تہواروں پر دربارِ عام لگتا
تھا۔ جس میں ہر شخص اصالتاً بادشاہ کے حضور میں فریاد کر سکتا تھا۔ بعض اوقات بادشاہ عام
ملزموں کی طرح مُوبدِ مُوبداں کے سامنے پیش ہو کر اپنی صفائی دیتا تھا۔ قانونی اُمور میں مُوبدِ مُوبداں

کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی اور اُس کا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا۔ شک کی صورت میں ملزموں کی آزمائش کی جاتی تھی جس میں بعض اوقات انہیں بھڑکتی ہوئی آگ میں سے گذرنا پڑتا تھا جب کوئی شخص حلف اُٹھاتا تو اُسے گندھک ملا ہوا پانی پلاتے تھے۔ اِسی سے فارسی کا محاورہ نکلا ہے و سوگند خوردن؛ بعض ملزموں کو قلعۂ گیل گرد یا قلعۂ فراموش میں قید کیا جاتا تھا۔ اِس قلعے یا قیدی کا نام لینا تک جرم تھا۔

شاہانِ ایران کا نظامِ مملکت تاریخ میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ انہیں نظم و نسق، مالگذاری بندوبست اور عسکری تنظیم کی روایات، میدیوں اور اشکانیوں سے ورثے میں ملی تھیں۔ دولتِ ساسانیہ کا سرکاری طمطراق، حکومت کے محکموں کی تقسیم و تنظیم اور عہدے داروں کے القاب و مناصب وہی تھے جو اشکانی دربار کے تھے۔ مُلک متعدد صوبوں میں منقسم تھا جن پر واسپہر (گورنر) بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے اور جنگ کے زمانے میں فوج بھرتی کر کے ذاتی قیادت میں بادشاہ کے پاس جاتے تھے۔ جاگیرداری نظام رائج تھا منصب داروں کی جاگیریں ریاست کے ہر کونے کھدرے میں موجود تھیں اس لئے وہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ انتظامِ مملکت کی باگ ڈور وزیروں کے ہاتھوں میں تھی۔ شاپور اعظم اور انوشرواں خسرو اوّل جیسے شہنشاہوں کے سامنے جاگیرداروں کو سرتابی کی مجال نہیں تھی لیکن بہرام گور جیسے غفلت شعار عیش پرستوں کے زمانے میں وہ سرکشی پر اتر آتے تھے اور موبد موبداں سے ایکا کر کے ہر بات میں من مانی کرتے تھے۔ شہنشاہِ ایران اصولی طور پر مطلق العنان تھا لیکن سلطنت کا آئین ایسا تھا کہ اُسے وزیروں اور مشیروں کی رائے پر چلنا پڑتا تھا۔

ساسانیوں کا نظم و نسق انوشرواں کے عہد میں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ انوشرواں نے اُمرا و روساء کی ایک نئی جماعت پیدا کی جو ذاتی طور پر اُس کے مطیع اور نمک خوار تھے۔ اُس نے خراج اور شخصی محصولات کے طریقوں میں اصلاح کی، تمام مزروعہ اراضی کی پیمائش

کر کے لگان کی نئی شرحیں مقرر کیں اور ایسے کارندے مقرر کئے جنہیں بادشاہ کا ذاتی اعتماد حاصل تھا۔ نیا لگان لوگوں کی خوش حالی کا باعث ہوا اور شاہی خزانے میں بھی مستقل اضافہ ہونے لگا۔ انوشرواں نے نئے لگان کا نرخ نامہ لکھوا کر سندات کے دفتر میں رکھوا دیا اور اس کی نقلیں محکمۂ مال کے تمام کارندوں کو بھجوا دیں۔ اس طرح لگان کی وصولی میں جو زیادتیاں عام طور سے ہُوا کرتی تھیں اُن کا سدِّباب ہوگیا۔ انوشرواں نے فوجی نظام کی بھی اصلاح کی اور عرضِ سپاہ یا موجودات کا طریقہ نافذ کیا۔ اسواروں میں جو نادار ہوتے تھے اُنہیں شاہی خزانے سے ہتھیار اور گھوڑے فراہم کئے جاتے تھے۔ اسوار کا مکمل اسلحہ گھوڑے کی زرہ بکتر، جوشن، سینے کی زرہ، ران پوش، تلوار، نیزہ، ڈھال، گرز، طبرزین اور ترکش پر جس میں دو کمانیں چند چلّے اور تیس تیر ہوتے تھے مشتمل تھا۔ سب سے اہم ہتھیار کمان اور نیزہ تھے جن کے استعمال میں ایرانی ید طولےٰ رکھتے تھے۔ بقولِ جاحظ اسوار کو معزز سمجھا جاتا تھا۔ نوشرواں کے دربار میں شہزادے اور اسوار سب سے اعلیٰ مقام بر فائز ہوتے تھے۔ انوشرواں نے ایرانی سپاہ بذ (سپہ سالار) کا عہدہ منسوخ کر دیا۔ چار سپاہ بذ مقرر کئے اور ایک کو مُلک کے ایک چوتھائی حصے پر مقرر کر دیا۔ ہر سپاہ بذ کے ساتھ ایک مرزبان بطور نائب اور مددگار کام کرتا تھا۔ طبری اور فردوسی نے ایک حکایت بیان کی ہے جس میں پاپگ نامی دبیر نے عرضِ سپاہ کے وقت خود بادشاہ کو اس کا اسلحہ ناقص ہونے پر جرمانہ کیا تھا۔ مرکزی حکومت دفتروں اور دیوانوں پر مشتمل تھی۔ بادشاہ کی کئی مہریں تھیں اور ہر صیغے کا دیوان الگ تھا۔ لفظِ دیوان آج بھی دیوانی عدالت کی صورت میں عہدِ قدیم سے یادگار ہے۔ بقولِ ابنِ خلدون دیوان کا لفظ شروع شروع میں اُن رجسٹروں کے لئے بولا جاتا تھا جن میں آمدنی اور خرچ کا حساب رکھا جاتا تھا۔ شدہ شدہ وہ کمرا جس میں محکمۂ مالیات کے ملازم کام کرتے تھے۔ دیوان کہلانے لگا۔

تعلیم و تدریس مذہبی حلقوں تک محدود تھی۔ شہزادوں کو معلّمِ اسواراں تعلیم دیتا تھا۔ وہ اُنہیں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ شکار، چوگان اور سواری کے فنون بھی سکھاتا تھا۔

روساء کے بیٹوں کو ہتھیاروں کے استعمال کی سخت مشق کرائی جاتی تھی۔ منذر شاہ حیرہ نے بہرام گور کی تعلیم و تربیت کے لیے فقہاء، شہسوار، تیرانداز اور خوش نویس ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلوائے تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں تعلیم ختم ہو جاتی تھی۔ بیس برس کی عمر میں موبد امتحان لیتے تھے۔ موسیقی اور علم نجوم بھی سکھائے جاتے تھے۔ تمام علوم کا ماخذ و مصدر اوستا کو سمجھا جاتا تھا اور مدرسین موبدوں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ طب کی تعلیم کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ عیسائیوں نے گندیشاپور میں انوشرواں کی سرپرستی میں طب یونانی کا مدرسہ قائم کیا تھا جو دورِ اسلامی میں بھی جاری رہا ۵۲۹ء میں جسٹینین قیصر روم نے ایتھنز کی درس گاہ فلسفہ بند کرا دی اور فلاسفہ پر جور و تعدی کا آغاز کیا۔ اُس کے ظلم سے تنگ آ کر سات فلسفی ایران بھاگ آئے۔ انوشرواں نے گرم جوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا اور سرِ دربار فلسفیانہ موضوعات پر بحث مباحثے ہونے لگے کچھ مدت کے بعد یہ فلاسفہ واپس چلے گئے لیکن اُن کے افکار نے ایرانیوں کے ذہن و دماغ میں جو ہلچل پیدا کر دی تھی وہ باقی و برقرار رہی۔ اندرزیا اخلاق اور پند و موعظت کی کتابیں ایران میں بڑی مقبول تھیں۔ برزویہ حکیم نے سنسکرت سے کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ کیا۔ برزویہ بہت بڑا مفکر تھا۔ اُس کا شمار دُنیا کے عظیم ترین اہلِ علم میں ہوتا ہے۔

ایرانیوں کے مذہب کو مزدائیت یا مجوسیت کہا جاتا ہے مجوسیت سے پہلے صابئیت یا ستارہ پرستی کا رواج تھا جو بابلیوں کا مذہب تھا۔ ملکی روایت یہ تھی کہ اژدہاک (عربی کا ضحاک) کے عہد میں ستارہ پرستی کا آغاز ہوا۔ صائبین سات سیاروں کی مورتیاں بنا کر اپنے معبدوں میں رکھتے تھے۔ آفتاب یا نیرِ اعظم خداوند خدا تھا۔ ہر معبود کے پجاری جداگانہ تھے۔ ایک سیارے کا پرستار دوسرے کے معبد میں جانے کا مجاز نہ تھا۔ معبد کو پیکرستان شیداں کہتے تھے جو کیوان، ہرمز، بہرام، آفتاب، ناہید، تیر اور چاند کی عبادت کے لئے تعمیر کئے گئے تھے۔ ہر سیارے کی مورتی دھات کی بنائی جاتی تھی اور ہر ایک کی شکل و صورت، لباس، رنگ روپ اور خواص جداگانہ تھے۔ ناہید (زہرہ: حسن و عشق کی دیوی) کا معبد عورتوں

کے لئے مخصوص تھا۔ ہر معبد کے نام کے ساتھ لفظ شِرت بولا جاتا تھا۔ جیسے ہم نام کے ساتھ حضرت یا ہندو شِری بولتے ہیں۔ ہندی آریائی قبائل کے جُدا ہونے سے پہلے ایران کے آریاؤں کے دیوتا دو گروہوں میں منقسم تھے۔ دیوا (بہ معنی رخشندہ) اور اہورا (آقا یا مالک سنسکرت کے اسُر) جُدا ہونے کے بعد دیو ایران میں عفریت بن گئے اور دید میں عفریتوں کو اسُر کہنے لگے۔ اس ابتدائی دَور میں آریا کھُلے میدان میں آگ جلا کر اُس کی تقدیس کرتے تھے۔

زردشت نے قدیم صابئیت کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جو اُس کے نام سے موسوم ہوا۔ زردشت کا لغوی معنیٰ ہے "یزداں پرست"، اُسے زرتشت زرد ہشت، زوراسٹر، زراتشت اور زراتشتر بھی کہتے ہیں۔ وہ قصبہ ارومیا واقع باختر میں پیدا ہوا۔ پروفیسر جیکسن (کولمبیا یونیورسٹی) کے خیال میں وہ میدیوں کے ایک قبیلے میگی (مجوس) کا فرد تھا۔ وہ ۵۸۳ء (ق م) میں ستتّر برس کا ہو کر فوت ہوا یا بروایت مجوس اُسے برق و رعد میں آسمان پر اُٹھا لیا گیا۔ مسعودی اور البیرونی کے خیال میں زردشت سکندر کے حملے سے تین سو برس پہلے ہُوا تھا۔ روما کا مورّخ پلائنی کہتا ہے کہ زردشت نام کے کئی مصلحین ہوئے ہیں جن میں سے ایک مزدائیت کا بانی تھا۔

مغرب میں افلاطون کا مکالمہ الفیبیا دقدیم ترین کتاب ہے جس میں پہلے پہل زردشت کا ذکر کیا گیا ہے۔ زردشت نے تیس برس کی عمر میں تبلیغ کا آغاز کیا۔ شاہ گشتاپ اُس پر ایمان لایا جس پر شاہی خانوادے کے دوسرے افراد اور اُمراء نے بھی اُس کی دعوت قبول کر لی۔ شُدہ شُدہ اُس کا مذہب سارے مُلک میں پھیل گیا۔ ہخامنشیوں کے عہد میں مذہب زردشت کے پہلو بہ پہلو متھرا پرستی وغیرہ کے صابئی فرقے بھی رواج و قبول پاتے رہے لیکن ساسانی بادشاہوں نے اُسے سرکاری مذہب قرار دیا اور دوسرے فرقوں کو بدعتی قرار دے کر اُن کا قلع قمع کر دیا۔ زردشت کے بارے میں شہرستانی لکھتا ہے:۔

"زردشت جب تیس سال کا ہُوا خُدا نے اُسے نبوّت دی اور تمام مخلوق کے لیے

رسول قرار دیا۔ فرشتہ گشتاسب اُس کی رہنمائی کے لئے آیا اور زردشت نے اُس کی رہنمائی کو لبیک کہا۔ چنانچہ زردشت کا پیغام خدا پرستی، اِنکارِ خوشنودیٔ شیطان، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ناپاک کاموں سے بچنے پر مُشتمل تھا۔ نیز زردشت کی تعلیم تھی کہ نور و ظلمت دو مُتضاد قوتیں ہیں۔ اسی طرح یزدان اور اہرمن عالم کے موجود ہونے کے سبب ہیں اِن دونوں کے امتزاج سے کچھ ترکیبیں وجود میں آئیں اور ان مختلف تراکیب سے مختلف صورتیں پیدا ہوئیں۔ باری تعالیٰ نور و ظُلمت کا خالق ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے کوئی اُس کا مثیل و نظیر نہیں ... نُور کا وجود اصلی اور حقیقی ہے ظلمت اِس لئے وجود میں آئی تاکہ نُور کی ضد سے خود نُور اچھی طرح واضح ہو گویا ظلمت کا وجود طبعاً ہے۔''

زردشت نے قدیم دیوتاؤں کی پُوجا سے منع کیا اور اہورا مزدا (آقائے دانش) کی عبادت کی دعوت دی۔ اُس نے کہا کہ اہورا مزدا خالق ہے۔ مختارِ مطلق ہے، حاضر و ناظر ہے۔ غیر مرئی ہے، جسمانی مفہوم میں وہ نُور ہے اور اخلاقی مفہوم میں وہ صداقت ہے۔ آفتاب آسمان پر اور آگ زمین پر اہورا مزدا کے نُور کے مظاہر ہیں اس لئے پاک ہیں۔ بُت پرستی ممنوع ہے ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ''اہلِ فارس دیوتاؤں کے بُت نہیں رکھتے نہ اُن کے ہاں قُربان گاہ موجود ہے۔ وہ ان چیزوں کو حماقت خیال کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یُونانیوں کی طرح یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ انسان اور دیوتا اصلاً ایک ہی ہیں'' مارکھم نے اپنی تاریخِ ایران میں لکھا ہے کہ ''ایرانی واحد قوم ہے جس نے اپنی تاریخ کے کسی دَور میں بُتوں کی پُوجا نہیں کی۔''

الٰہیاتی پہلو سے زردشت کے مذہب کو ثنویت کہا جاتا ہے کہ اُس کے خیال میں کائنات میں دو فعّال قوتیں کارفرما ہیں: نُور یا نیکی کی قوت (اہورا مزدا) اور ظلمت یا شر کی قوت (انگرا مینیو ش یا اہرمن)۔ اُن کے درمیان ازل سے کشمکش ہو رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ اِس دُنیا کو جنگاہ سمجھتا ہے جس میں خیر یا نُور اور شر یا ظلمت

میں جنگ لڑی جا رہی ہے انسان کا فرض ہے کہ وہ نور اور نیکی کی قوت کا ساتھ دے۔ آخری فتح نور یا صداقت ہی کی ہوگی۔ مجوسیت کی رُو سے ہر ہزار برس کے بعد ایک ہادیٔ اعظم کا ظہور ہوتا ہے جس کی دعوت و تعلیم اگلے ہزار برسوں تک ہدایت کا سرچشمہ خیال کی جاتی ہے۔ زردشت کا مذہب الہامی ہے۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ اُس پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور اُس کے احکامِ شریعت اِسی الہام پر مبنی ہیں۔ بعض مجوسیوں نے زردشت کی ثنویت کو وحدت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ انہیں زروانیہ (زروان یعنی زمان) کہتے ہیں۔ زروانیہ کے خیال میں زمان کی دیوی کے توأم بیٹے ہرمزد اور اہرمن تھے۔ اِن کی پیدائش سے پہلے اُسے یہ خوف ہوا کہ ان میں سے جو پہلے پیدا ہوگا وہ زمین و آسمان کی حکومت پر قابض ہو جائے گا اور دوسرا محروم رہ جائے گا۔ وہ اِسی سوچ میں تھی کہ اہرمن اپنی خباثت اور مکاری سے دیوی کا پیٹ چاک کر کے باہر آ گیا اور شریف و پاک ہرمزد سے پہلے زمین و آسمان پر قابض ہوگیا۔ اہرمن کی ماں نے اس کی قسمت میں ایک تبدیلی کی کہ نو ہزار برس بعد اس کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جائے گا۔ اِس کے بعد ہرمزد کی فرماں روائی کا اعلان ہوگا۔ شر کے تاریک پردے چاک ہو جائیں گے اور ہر چہار طرف خیر اور نور ہی کا دَور دورہ ہوگا۔ راسخ العقیدہ مجوسی زروانِ اکرن کے اِس تصور کو نہیں مانتے مگر وحدانیت کو منوانے کے لئے آج کل اِس عقیدے کی آڑ لے رہے ہیں۔ زروانیہ کے علاوہ ایک اور اہم فرقے کیومرثیہ نے اِس دُوئی کو دیومالائی رنگ میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کیومرث انسانوں کا باوا آدم ہے جو خیر و شر کے فتنے میں پڑ کر قتل ہوا۔ اُس کے خون سے ایک مرد میلشہ نامی اور ایک عورت میلشانہ پیدا ہوئے۔ اِن دونوں نے نکاح کر لیا اور نسلِ انسانی کا آغاز ہوا۔ اِسی بنا پر مجوسی بہن بھائی کی شادی کو جائز سمجھتے ہیں۔

زردشت کا مقدس الہامی صحیفہ اوستا ہے جس کا زمانہ کم و بیش وہی ہے جو ہندی آریاؤں کی رگ وید کا ہے۔ اس کے اکیس نسکوں (حصے) میں سے صرف ایک نسک دست

بردِ زمانہ سے بچ سکا ہے جس کا نام وندیداد ہے (اصل لفظ ودیوت ہے جس کا معنیٰ ہے دیوؤں کے خلاف قوانین) باقی حصے صرف بکھرے ہوئے پاروں کی صورت میں ملتے ہیں جو دین کرد اور بندہشن میں ہیں۔ اوستا کی شرح جو قدیم پہلوی میں کی گئی ہے ژند کہلاتی ہے ژند کی شرح پاژند کے نام سے مشہور ہے۔ خوردا اوستا (چھوٹی اوستا) دعاؤں کی کتاب ہے جسے شاپور دوم (۳۱۰ء — ۳۷۹ء) کے زمانے میں آذربذ مہر سپند نے عوام کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس میں کچھ اقتباسات اوستا سے لئے ہیں اور کچھ پاژند سے اخذ کئے ہیں۔ اوستا کے قدیم ترین جزو کو گاتھا (ہندوؤں کے ہاں گیتا، گیت) کہتے ہیں۔ ایک اور مقدس صحیفہ ارداویراف نامہ ہے جس میں ولی ارداویراف کے مکاشفات درج ہیں۔

پہلوی زبان میں پیغمبر کو وخشور، جنیئو کو کستی یا زنار، معجزے کو فرجود اور پل صراط کو چنیود کہتے ہیں۔ زردشت نے حشر نشر، حیات اور ممات اور جزا سزا کی تعلیم دی۔ اس نے نیکوکاروں کو بخشش اور بہشت کی بشارت دی اور بدوں کو عذاب دوزخ سے ڈرایا۔ مجوسیت کی رو سے موت کے چوتھے دن بعد محاسبہ ہوتا ہے جب نیک روح کو ایک حسین دوشیزہ خوش آمدید کہتی ہے اور بد روح کو ایک بدصورت بڑھیا ڈراتی ہے۔

مجوسیت کے بنیادی اصول تین ہیں: ہمتا (پاک خیال) ہختا (پاک الفاظ) اور ہوورشتا (پاک عمل) اس کی رو سے انسان مادی اور روحانی عناصر سے مل کر بنا ہے، جسم فانی ہے اور روح غیر فانی ہے۔ عقل و خرد انسان کی سب سے اعلیٰ اور ارفع قوت ہے، اس کے بعد دینا[۱] (ضمیر) اردوان (روح) اور فروشی (ہمزاد) کی روحانی قوتوں کا درجہ ہے۔ انسان ہر طرح فاعلِ مختار ہے اور اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہے۔ اُسے اِس بات کا اختیار ہے کہ چاہے تو نور یا صداقت کا ساتھ دے اور چاہے تو ظلمت یا باطل کی حامی بھرے۔

---

[۱] دے نا: یہ لفظ عربی میں دین بن گیا۔ نہر وارش میں اسے دین ہی لکھا گیا ہے۔

مجوسیت میں توالد و تناسل کی دعوت دی گئی ہے اور رہبانیت کی سخت مخالفت کی گئی ہے۔ وندیداد میں لکھا ہے کہ "جو لوگ سیر ہو کر کھانے پینے سے گریز کرتے ہیں نہ وہ نیکی کرنے کے قابل ہوتے ہیں نہ اپنا گھر سنبھال سکتے ہیں اور نہ طاقتور بچے پیدا کر سکتے ہیں" اوستا میں کھیتی باڑی کو شریف ترین پیشہ کہا گیا ہے جو اہورا مزدا کو بہت پسند ہے۔ مجوسیت میں عناصر اربعہ: پانی، ہوا، مٹی، آگ کو آلودہ کرنا منع ہے۔ مجوسی بہتے ہوئے پانی میں کپڑے دھونے اور شمع کو پھونک مار کر بجھانا گناہ سمجھتے ہیں۔ مٹی، ہوا اور آگ کو آلودگی سے بچانے کے لئے وہ اپنے مُردے دفن نہیں کرتے نہ جلاتے ہیں بلکہ بُرجِ خاموشی یا دخمہ میں رکھ دیتے ہیں جہاں چیلیں اور کوّے اُنہیں چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔

مجوسی کتّے اور اُود بلاؤ (سگِ ماہی) کو مُقدّس مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جانور ہرمزد کے محبوب ہیں۔ مرتے وقت چار چشم زرد رنگ کے کُتّے کو مریض کے بستر کے قریب لاتے ہیں تاکہ مرنے والا اُس کا مُنہ دیکھ کر جان دے سکے۔ اِسی رسم کو سگ دید کہتے ہیں روایت یہ ہے کہ یِیم یا جم (ہندوؤں کا یاما) خُداوندِ مُردگاں ہے جس کے پاس دو چار چشم کُتّے ہیں جو مُردوں کو سُونگھ کر تلاش کیا کرتے ہیں۔ سگ دید اِسی عقیدے سے یادگار ہے۔ مجوسی پندرہ یا سولہ برس کے لڑکے کو کُستی باندھنے کی رسم ادا کرتے ہیں اور آگ کی تقدیس میں غُلو کرتے ہیں اُن کے آتشکدوں میں دن رات آگ جلتی رہتی ہے جس کی نگہداشت پر ہیربذ معیّن ہوتے ہیں جو مقررہ وقتوں پر اس میں خوشبودار لکڑیاں جلا کر پہلوی زبان میں زمزمہ کرتے ہیں۔ آگ کے کئی نام ہیں جن میں مُقدّس تین ہیں گشنپ، فرنگ اور بُرہرسپاہیوں کے آتشکدے کو آذر برزین کہتے ہیں۔ آذربائیجان میں بکثرت آتش کدے تھے۔ اُس کا نام ہی آتُور آباد کان پڑ گیا۔ جو بگڑ کر آذربائیجان بن گیا۔ مجوسیوں کا بہشت کوہِ البرز میں واقع ہے جس میں نیک ارواح چنیود کے پُل پر سے گزر کر داخل ہوتی ہیں۔

بدروحیں اس پل پر سے کٹ کٹ کر دوزخ میں جاگرتی ہیں۔ مجوسیوں کا ایک اور مشہور عقیدہ یہ ہے کہ قیامت کے قریب شاہ بہرام آئے گا جو ان کا بول بالا کرے گا۔

مذہب زردشت کے علاوہ قدیم ایران میں متھرامت، مانویت اور مزدکیت کی اشاعت بھی ہوئی۔ ان میں متھرامت سب سے قدیم ہے اور ہندی ایرانی دور سے یادگار ہے۔ زردشت سے بہت پہلے صابئیت کے دور میں متھرا (مہر، آفتاب، سنسکرت کا مترا، اور اناہتا (ناہید، زہرہ) کی پرستش بڑے ذوق و شوق سے کی جاتی تھی۔ زردشت نے صابئیت کو منسوخ کیا تو ان کی پوجا کو بھی زوال آگیا۔ ہخامنشیوں کے بعض کتبوں میں البتہ متھرا اور اناہتا کا ذکر کیا ہے۔ ارتاخشترشیا دوم نے متھرا اور اناہتا کی پوجا کا احیا کیا اور اس مذہب نے سنبھالا لیا۔ ابتدا میں متھرا کا درجہ اہورا مزدا اور اہرمن کے بین بین تھا اور وہ نور، کثرت اور زرخیزی کا دیوتا تھا۔ ارتاخشترشیا کے زمانے میں وہ رب الافواج بن گیا۔ ہر مہینے کا ساتواں اور سولھواں دن اس کا مقدس دن تھا۔ مجوس متھرامت کی مخالفت میں سرگرم رہے لیکن عوام میں اس کی رسوم مقبول ہوگئیں۔ ان کے خیال میں متھرا نے نوع انسان کی نجات کے لیے اپنے خون کی قربانی دی تھی۔ اس کے دوش بدوش اناہتا کا مت بھی رواج پاگیا۔ بیل متھرا کا اور گائے اناہتا کا مقدس جانور بن گئی۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ متھرامت ان رومی لشکریوں میں پھیل گیا جو ایران کی سرحدوں پر تعینات تھے۔ ان کے واسطے سے یہ مت رومۃ الکبریٰ میں بھی نفوذ کرگیا اور عیسائیت کی اشاعت کے ابتدائی دور میں عیسائیت کا زبردست حریف بن گیا۔ قریب تھا کہ متھرامت تیسری اور چوتھی صدیوں میں عیسائیت پر غالب آجائے کہ مسیحی پیشواؤں کے مذہبی جوش و خروش اور مسلسل قربانیوں کے باعث آخری فتح عیسائیت ہی کی ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ متھرامت کے مذہبی شعائر عیسائیت میں بار پاگئے جن میں سب سے مشہور کرسمس کا تہوار ہے۔ متھرا کے پجاری دسمبر کے آخری ہفتے میں جب آفتاب سرما کے چنگل سے آزاد ہوجاتا ہے

متھرا کا جنم دن مناتے تھے۔ کرسمس اس تہوار کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ علاوہ ازیں جناب مسیح کے منجی اور شفیع ہونے کا تصور بھی متھرا مت سے لیا گیا ہے۔

مانی ۲۱۵ء میں بابل میں پیدا ہوا۔ وہ ایرانی نژاد تھا اور ابتدائے عمر میں زردشت کے مذہب کا ایک پیشوا تھا۔ اس نے مجوسیت، بدھ مت اور عیسائیت میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک نیا مذہب مرتب کیا جسے اسی کے نام پر مانویت کہا جاتا ہے۔ وہ زردشت، گوتم بدھ اور جناب عیسٰے تینوں کو نبی سمجھتا تھا لیکن یہودیوں کے انبیاء کا منکر تھا۔ عرب مورخ یعقوبی اس کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ [1]

"مانی ابن حماد شاپور ابن اردشیر کے عہد میں ظاہر ہوا۔ اس نے شاپور کے (زردشتی) مذہب کو باطل ٹھہرایا اور اسے اپنی تعلیم ثنویت کی طرف بلایا اور شاہ پور مائل بھی ہو گیا۔ مانی کہتا تھا کہ کائنات میں منصرف ازلی وابدی عناصر دو ہیں نور اور ظلمت۔ خالق دو ہیں خالق خیر اور خالق شر۔ نور و ظلمت میں سے ہر ایک پانچ صفات یعنی رنگ ذائقہ، بو، لمس اور صوت سے متصف ہے۔ انہیں کے ذریعے وہ سننے، دیکھنے اور علم حاصل کرتے ہیں جو کچھ اچھا اور مفید ہے اس کا منبع نور ہے اور جو کچھ برا اور مضر ہے اس کا منبع ظلمت ہے۔ ابتداء میں یہ دونوں عناصر الگ الگ تھے، بعد میں وہ ایک دوسرے سے مل گئے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ پہلے کچھ نہ تھا بعد میں حوادث کا وجود ہونے لگا۔ ظلمت کی طرف سے اس آمیزش کی ابتداء ہوئی کیوں کہ پہلے وہ ایک دوسرے سے اس طرح متصل تھے۔ جیسے سایہ اور دھوپ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز کے بغیر وجود میں لانا ممکن نہیں۔ آمیزش کی ابتدا ظلمت کی طرف سے ہوئی۔ سبب یہ ہے کہ ظلمت و نور کی آمیزش آخر الذکر کے لیے مضر تھی۔ نا ممکن ہے کہ ابتداء نور نے کی کیوں کہ

---

[1] یہ اقتباس براؤن کی تاریخ ادبیات ایران میں درج ہے۔

نور فطرتاً خیر ہے۔ اس بات کی شہادت کہ خیر و شر دونوں ازلی و ابدی ہیں اس سے ملتی ہے کہ ایک شئے کا وجود تسلیم کیا جائے تو اس سے متضاد و فعال پیدا نہیں ہو سکتے مثلاً آگ گرم اور جلتی ہوئی چیز ہے اس لئے وہ چیزوں کو ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ جو شئے باعثِ خیر ہو وہ شر پیدا نہیں کر سکتی اور جو باعثِ شر ہے وہ خیر نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کا ثبوت یہ کہ دونوں عناصر زندہ اور عامل ہیں یہ ہے کہ خیر ایک کا نتیجہ ہوتا ہے اور شر دوسرے کا۔"
زردشت اور مانی دونوں کی الٰہیات ثنویاتی ہے لیکن ایک فرق ایسا ہے جس نے دونوں میں بُعد المشرقین پیدا کر دیا ہے۔ زردشت کے خیال میں دونوں ابتدائی ارواح فعال ہیں مانی کے ہاں قوتِ نور منفعل ہے اور قوتِ ظلمت فعال ہے۔ جیسا کہ یعقوبی نے کہا ہے خیر اور شر کی آمیزش میں قوتِ شر نے مسابقت کی تھی۔ یہ مانی کا عقیدہ ہے۔ اس الٰہیات سے جو اخلاقیات متفرع ہوئی وہ یہ تھی کہ نور کو ظلمت سے الگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس کے لئے مانی نے تجرد، ترکِ دنیا اور نسل کُشی کی ترغیب دی تاکہ نہ اولاد پیدا ہو اور نہ شر پھیل سکے۔ اس رہبانیت کے باعث مجوسی اُس کے دشمن بن گئے کیوں کہ زردشت نے توالد و تکاثر کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ شاہ ہرمز نے کہا کہ یہ شخص دنیا کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ مانی کی یاسیت پر بدھ مت کا گہرا اثر ہے۔ بدھ مت کی اشاعت ایران میں بالعموم اور خراسان میں بالخصوص اشوک کے عہد کے بعد ہوئی تھی۔ بودھوں نے جا بجا اپنے وہار (خانقاہیں) بنا رکھے تھے بلخ کا نوا وہارا اُن کا سب سے بڑا مرکز تھا جہاں کے پرمک کشمیری الاصل تھے۔ جو بعد میں برامکہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان وہاروں میں بودھ سوامی تجرد اور ترکِ علائق کی زندگی گزارتے تھے۔ مانی نے ترکِ دنیا کا منفی نظریہ بودھوں ہی سے لیا تھا۔

مانویہ پانچ طبقات میں منقسم تھے: مُعلّمون (تعلیم دینے والا) مُشمسّون (جنہیں ضیاءِ آفتاب نے منور کیا) قسیسّون (مذہبی راہنما) صدیقون (تصدیق کرنے والے)

اور سماعون (سننے والے۔ مانویہ دن میں چار دفعہ نماز پڑھتے تھے، بت پرستی کے قائل نہیں تھے، جھوٹ، لالچ، قتل، زنا، چوری، سحر و ساحری اور ریاکاری سے منع کرتے تھے اور مہینے میں سات روزے رکھتے تھے۔ مانی نے اپنی کتابوں کے لئے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا۔ وہ اپنی کتابیں جن میں شاپورکاں (شاپور کے نام پر) مشہور ہوئی سونے چاندی کے حروف میں لکھتا تھا اور جلد بندی میں بھی سونا استعمال کرتا تھا۔ جب اُس کی کتابیں جلائی گئیں تو سونا چاندی اُن میں سے پگھل پگھل کر گرتے تھے۔ ایرانی روایت کے مطابق مانی ایک عظیم مصوّر بھی تھا۔ وسط ایشیا کے اُغوریوں نے مانویت اختیار کر لی تھی۔ اُن کے شہر خوچو میں مانی کی جو کتابیں حال ہی میں برآمد ہوئی ہیں اُن میں بڑی بڑی خوبصورت تصویریں بھی ملی ہیں۔

مانی کی دعوت کے آغاز پر بادشاہ شاپور نے اُس کا مذہب قبول کر لیا تھا لیکن مُوبد موبداں کے سامنے اُس کی کچھ پیش نہ گئی۔ مُوبدوں کی مخالفت سے بچنے کے لئے مانی ہندوستان چلا گیا۔ وہاں سے لوٹنے پر بہرام اوّل نے اُسے وحشیانہ عذاب دے دے کر قتل کرا دیا اور مانویہ کا استیصال کر دیا لیکن اُن کے عقائد صدیوں تک دوسرے مذاہب پر اثر انداز ہوتے رہے۔ بنو اُمیہ اور بنو عباس کے زمانے میں کئی اشخاص ایسے تھے جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن بہ باطن مانویہ تھے۔ صاحب الفہرست کے خیال میں جعد بن درہم، بشار بن برد اور ابن الزیات مانویہ تھے۔ مانویہ کو زندیق کہا جاتا تھا۔ اُن کا کھوج لگانے کے لیے خلیفہ منصور نے ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کا نام صاحب الزنادقہ تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مانی کا اہرمن مشرق و مغرب کے فلسفے اور ادبیات میں نفوذ کر گیا۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے مانی اہرمن یا شر کو کائنات کے عنصر فعّال مانتا تھا اِس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اہرمن ہی کی کارفرمائی ہے۔ یہ تصوّر ہمیں ملٹن کے شیطان، گوئٹے کے میفسٹوفیلس اور اقبال کے ابلیس میں واضح شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ کلیسائے روم میں ولی آگسٹائن کے توسّط سے جو اوائل عمر میں مانوی رہ چکا تھا۔ رہبانیت نے بار پایا۔

عیسائی رہبان اور مسلمان صوفیہ کے عقائد پر بھی مانویہ کی فاقہ کشی اور ترک علایق کی تعلیم کا اثر ہوا ہے۔ دوسری طرف ابوالعتاہیہ، ابوالعلا معری اور عمر خیام مانی کی قنوطیت سے متاثر ہوتے ہیں ارڈمان نے مانی کو صوفیاء میں شمار کیا ہے اگرچہ اسے صوفی ملحد کہا ہے۔
مزدک کا ظہور شاہ کواذ کے عہد حکومت میں ہوا جو شروع شروع میں اُس کی تعلیمات کا قائل ہو گیا لیکن موبدوں کی شدید مخالفت کے باعث اُس نے مزدک کے مذہب سے رجوع کر لیا۔ مزدک کہتا تھا کہ شر تین چیزوں سے پیدا ہوتا ہے : رشک، غصہ، لالچ جن کے سبب انسانی مساوات کا خاتمہ ہو گیا ہے، اُس کے خیال میں مذہب کا اصل مقصد اسی مساوات کو بحال کرنا ہے۔ وہ گوشت کھانے سے پرہیز کرتا تھا اور جنگ و جدال سے منع کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ انسان کو لالچ، رشک اور غصّہ سے نجات دلانے کے لئے ضروری ہے کہ سب انسانوں میں ہر قسم کی املاک برابر تقسیم کر دی جائے۔ اس کے ساتھ اُس نے افلاطون کے مانند اشتراکِ نسواں کی دعوت دی اُس کے خیال میں املاک اور عورت کا اشتراک معاشرۂ انسانی سے فتنہ و فساد کا خاتمہ کر دے گا۔ نولڈیکے لکھتا ہے ۔
"موجودہ اشتراکیت اور سوشلزم سے مزدک کی تعلیم کو جو چیز جدا کرتی ہے وہ مزدک کا مذہبی ذہن ہے۔ مزدک کے خیال میں ہر بُرے کام کا باعث حسد، غصّہ یا لالچ ہے اور یہی تین رذائل ایسے ہیں جنہوں نے خدا کی مرضی اور حکم کے خلاف مساواتِ انسانی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اِس مساوات کا از سرِ نو قائم کرنا ہی اُس کی دعوت کا اصل مقصد تھا۔ رہبانیت کا عنصر جو مانی کی تعلیم کے اجزائے کبار میں تھا اور جس پر زرد شتیوں کو شدید اعتراض تھا۔ مزدک کے مذہب میں بھی اِس حد تک موجود تھا کہ اِس میں خونریزی اور گوشت خوری سے منع کیا گیا تھا۔"
شاہ کواذ کا بیٹا خسرو (بعد کا انوشیرواں) مزدک کی تعلیم کو مملکت اور معاشرے کے لئے تباہ کن سمجھتا تھا اور مزدک کی اشتمالیت اور اباحتِ نسواں کا سخت مخالف تھا۔ خسرو

کے اصرار پر شاہ کواذ نے مزدکیوں کا قتلِ عام کروایا۔ خُسرو نے مزدک کو زندہ دفن کرا دیا۔ اسی دینی خدمت پر مُوبدوں نے اسے انوشیرواں (غیر فانی روح) کا لقب بخشا تھا۔ مانی کی طرح مزدک کی تعلیمات بھی باقی رہیں۔ نظام الملک سیاست نامہ میں لکھتا ہے کہ اس کی تعلیمات بہت سے اسلامی فرقوں میں بھی نفوذ کر گئیں۔ سُلمغانی، بابک اور مُقنّع جنھوں نے دورِ عباسیہ میں بار بار علمِ بغاوت بلند کیا تھا مزدک کی طرح اشتراکیتِ املاک اور اباحتِ نسواں کے داعی تھے۔ باطنیہ کے اکثر فرقوں میں مزدک کے عقائد کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔[۱]

ایرانِ قدیم کے عُلوم و فنُون کے ذخیرے بہت کچھ جنگ و جدال میں تلف ہو گئے۔ یہ تباہی اِس قدر مکمل تھی کہ ساسانی عہد سے ایک شعر بھی ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ تسخیرِ ایران کے بعد سعد بن وقاص نے حضرت عمر کے کہنے پر ہزاروں کتابیں جو مدائن کے شاہی کتب خانوں سے دستیاب ہوئی تھیں دریا میں بہا دیں یا آگ میں پھکوا دیں۔[۱] جستہ جستہ مخطوطات مثلاً کتاب التاج، خوتائی نامہ، کارنامک اردشیر پاپکاں، کتاب زریر، ہزار داستان، خسرو کواذان اور اس کا غلام بعض امیر گھرانوں سے ملے جن سے فردوسی نے شاہنامے میں استفادہ کیا ہے۔ بغداد کے بیت الحکمت میں برامکہ کی سرپرستی میں کچھ تاریخی اور افسانوی مسودات کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔ کئی کتابیں ابن المقفع نے عربی میں منتقل کیں۔ جبلہ بن سالم نے کتاب رستم و اسفندیار اور بہرام نامہ کا ترجمہ کیا پیکیکین کارنامیہ بھی ترجمہ کیا گیا۔ ان کتابوں میں ہزار افسانہ کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی۔ بعد میں اس کا نام الف لیلہ و لیلہ رکھا گیا اور اس میں دوسری اقوام کی کہانیوں کے افسانے ترجمہ کئے گئے۔ شہرزاد اور اس کی بہن دُنیازاد کے مرکزی کردار ہزار افسانہ ہی سے لئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ شہرزاد یا پرویز، ادب و ثعلب اور بہرام و نرسی

---

[۱] مقدمہ ابنِ خلدون

یہ قصے بھی عربی میں ترجمہ کیے گئے۔ شاہانِ ایران علوم و فنون کے سرپرست تھے۔ ان میں انوشیرواں خاص طور سے بڑا علم دوست تھا۔ اُس نے اپنے خاص وزیر برزویہ کو ہندوستان بھیجا جہاں سے وہ کلیلہ دِمنہ کا قصہ اور شطرنج کا کھیل لایا۔ انوشیروان نے کئی کتابیں سنسکرت اور یونانی زبانوں سے پہلوی میں ترجمہ کروائیں۔ ایرانیوں کی علم دوستی کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ ابن خلدون نے ایک حدیث درج کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "علم آسمان کے کناروں سے جا اٹکے گا پھر بھی عجمی اُسے پالیں گے۔"

فنونِ لطیفہ میں قدیم ایرانیوں نے فنِ تعمیر، مصوّری، سنگ تراشی اور موسیقی کو فروغ دیا۔ ایرانی روایت ہے کہ موسیقی کا ماخذ ایک پرندہ ققنس یا موسیقار ہے جس کی چونچ میں سات بڑے سوراخ ہیں اور ہر سوراخ سے ستّر راگ نکلتے ہیں۔ اس افسانوی روایت کے پردے میں سپتک اور راگنیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شادی بیاہ پر رامشگر (گویئے اور سازندے) رود بجاتے تھے جس میں تار کے بجائے بکری کے بچے کی خشک اور بٹی ہوئی آنت لگاتے تھے۔ کیکاؤس کے جشنِ تاج پوشی پر ماژندرانی گانے کا ذکر آیا ہے۔ بربط کے علاوہ دف، چنگ اور بانسری کے آلات تھے۔ شاہانِ ایران کے محلوں کے دروازے پر ہر روز پانچ مرتبہ نوبت بجا کرتی تھی۔ اِس چوکی کا سب سے اہم ساز شہنائی تھی۔ بہرام گور اور خسرو پرویز کے زمانے میں موسیقی کو بڑی ترقی ہوئی۔ بہرام گور رقص و سرود کا شیدائی تھا۔ اُس نے ہندوستان سے بارہ ہزار گانے بجانے والے لُوریوں کو ایران بلایا تھا۔ موسیقی میں خسرو پرویز کی عطا نمایاں طور پر قابلِ قدر ہے۔ اُس کے درباری گویّوں میں باربد اور نگیسا نے موسیقی کو فنِ کمال تک پہنچا دیا اور کئی نئے نئے راگ ایجاد کیے۔ نوائے باربد ایرانی ادب میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ ایرانی موسیقی ہندی سنگیت کی طرح ریاضیاتی ہے۔ اس کے بارہ مقامات علمِ نجوم کے بارہ بُرجوں پر تقسیم کیے گئے تھے۔ مقامات سادہ اور بسیط راگ تھے۔ انہیں دو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور چوبیس گھنٹوں کی رعایت سے

چوبیس راگ بنائے گئے۔ جو اصول کہلاتے تھے۔ ایرانیوں نے بسیط کے علاوہ دو دو راگوں کو ملا کر مرکب راگ بھی بنائے۔ ان میں چھ کے نام ملتے ہیں جنہیں اصطلاح میں آہنگ کہتے ہیں، سلمک، گردانیہ، نوروز، گوشت، مارہ، شہنانہ۔ ان کے علاوہ متعدد راگنیاں گائی جاتی تھیں جنہیں گوشہ کہتے تھے۔ ان کے نام بڑے دلکش ہیں مثلاً بہارِ نشاط، دلبر، شادباد، شباب، فانوس، بادِ نوروز، دل انگیز وغیرہ۔ عجمی موسیقی میں علمِ عروض کی طرح سترہ بحریں ہیں جنہیں ہندی میں تال کہتے ہیں: دو یک، چہار ضرب، دُر افشاں، اصولِ فاختہ (ہمارے ہاں کی سُلفاختہ) وغیرہ۔ ایرانیوں کے سازوں میں بربط، دف، چنگ، اور نَے مشہور ہیں۔ جنگی باجوں میں ڈُہل، کوس، اور قرنا تھے۔ چنگ مضراب سے بجاتے تھے۔ نَے وہی ہے جسے ہم بانسری کہتے ہیں۔ بربط میں چار تار تھے جو اخلاطِ اربع کے لحاظ سے زرد (صفرا) سُرخ (دم) سفید (بلغم) اور سیاہ (سودا) رنگ کے تھے۔ طنبورہ تاروں کا ساز تھا اور کمچہ رباب کے مشابہ تھا۔[1]

قدیم ایرانیوں کو فنِ تعمیر کی روایات بابل اور اشوریا سے ورثے میں ملی تھیں جن پر انہوں نے خوبصورت اضافے کئے۔ ہخا منشیوں کا دارالسلطنت اصطخر اور ساسانیوں کا دارالحکومت طیسفون اپنے زمانے کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتے تھے۔ خسرو انوشیرواں کے مشہور محل طاقِ کسریٰ کے کھنڈر آج عبرت کا سامان بن گئے ہیں۔ اصطخر کو سکندر نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ اُس کے حملے سے خائف ہو کر ہزاروں ایرانی کاریگر ہندوستان بھاگ آئے۔ پاٹلی پترا میں چندر گپت موریا کے زمانے میں لکڑی کے محل تعمیر کرتے تھے۔ ایرانی کاریگروں نے ہندوؤں کو پتھر کے تراشنے اور اِس کے عمارتی استعمال کے طریقے سکھائے۔ چنانچہ پاٹلی پترا کے آثار میں اصطخر کی وضع کے ستون دکھائی دیتے

---

[1] ابرامکہ۔ عبدالرزاق کانپوری

ہیں۔ سارناتھ کے قریب ایرانی ساختمان کے ستون ملے ہیں جن کے سروں پر چار شیر ایک دوسرے کی طرف پشت کیے بیٹھے ہیں۔ سانچی ستوپا (بھوپال) کے مشرقی دروازے پر آتش کدہ کا نقش موجود ہے۔ اشوک نے لاٹوں پر ہدایات کندہ کرائی تھیں۔ یہ اسلوب ایران کے حجری کتبات سے ماخوذ ہے۔ بازنطینی فنِ تعمیر میں جس گنبد نے رواج پایا وہ ایرانی وضع کا تھا۔ بیل اور شیر ببر کے علامتی نشانات خالص ایرانی ہیں۔ ہندوؤں کا گپتا عہد کا آرٹ بھی ایرانیوں سے متاثر ہوا تھا۔ طاقِ بستان اور اجنٹا اور ھوالی پورم کے جانوروں کے نقوش میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ افغانستان میں دُخترِ انوشِرواں کے نقوش بھی ایرانی وضع کے ہیں۔

شاہانِ ایران سربفلک محل تعمیر کراتے تھے اور ان کی دیواروں پر دربار اور شکار کے مناظر کی تصویریں بنواتے تھے۔ دیواری مصوری کے بہت کم نمونے ہم تک پہنچے ہیں۔ مانی اور اس کے پیرو بلاشبہ نہایت چابک دست مصور تھے۔ خوچو کی تصاویر میں ایرانی آرٹ کی فطرت نگاری کے شگفتہ نمونے ملتے ہیں۔ انہیں میں شبیہہ نگاری اور صغیر نگاری کے وہ اسالیب دکھائی دیتے ہیں جو بعد میں استاد کمال الدین بہزاد اور اس کے شاگردوں کی خصوصیات بن گئے۔ ہرات اور تبریز کے مکاتبِ فن میں انہی روایات کی ترجمانی کی گئی تھی۔

فنونِ صغیرہ میں بھی ایرانیوں نے بڑے بڑے حسین نمونے پیش کئے۔ ساسانی عہد کے جو پارچے دستبردِ زمانہ سے بچے ہیں۔ وہ نساجی کے نہایت دلاویز نمونے ہیں۔ ایرانی تافتہ، زربفت اور کمخواب بُننے میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے بُنے ہوئے پارچے بازنطین اور مغرب میں گراں قیمت سمجھے جاتے تھے۔ ان میں عنقا وغیرہ کے نقوش دکھائی دیتے ہیں ساسانیوں کے دورِ حکومت میں نہایت نفیس قالین بُنے جاتے تھے اور دنیا بھر میں مشہور تھے۔ گُلدار اقلیدسی نمونے جو بعد میں ایرانی قالین

کی خصوصیات بن گئے ساسانی عہد سے یادگار ہیں۔ ایرانی کاریگر دھات کے منقّش کام، ہاتھی دانت کے کام اور سنگِ مرمر کی تراش خراش کے ماہر تھے۔ باز نطین کے قیاصرہ کے محلوں میں شوخ رنگوں کے جو بیل بُوٹے بنائے گئے تھے وہ ایرانی الاصل تھے۔ قیاصرہ کے تاج بھی ایرانی وضع ہی کے بنائے جاتے تھے۔

ایرانی معاشرے میں کھیتی باڑی کو بڑا معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ دیہات میں مالیہ کی وصولی اور عام نظم و نسق کو بحال رکھنے کے لئے حکّام مقرّر تھے جنہیں مرزبان کہتے تھے۔ دہقان (دہ خان: گاؤں کا آقا) رئیسِ دہ ہوتا تھا اور رعایا اور مرزبان کے مابین ضروری واسطہ تھا۔ تجارت اور لین دین کا کاروبار بابلیوں کے ہاتھوں میں تھا جو دُور دراز سے تجارت کا مال لاکر بادشاہوں اور روساء کے محلوں میں فروخت کے لئے پیش کرتے تھے۔ بردہ فروشی کا رواج عام تھا۔ متمدن ممالک سے حسین منتخب کنیزیں خرید کر شبستانِ شاہی میں داخل کی جاتی تھیں۔ رامشگروں اور رقاصاؤں کے طائفے سلاطین و امراء کے درباروں سے وابستہ تھے۔

ایرانی تمیز و شائستگی کے پیکر سمجھے جاتے تھے۔ حد یہ تھی کہ جب بادشاہ کسی کو سزائے موت دیتا تو مجرم جُھک کر شکریہ ادا کرتا کہ بارے جہاں پناہ نے میری ذات کو درخورِ توجّہ تو سمجھا۔ ہیروڈوٹس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

شہنشاہِ ایران کمبوجیہ ہخامنشی نے ایک دن اپنے ایک درباری پراکساپس سے پُوچھا کہ ایرانی رعایا کا اُس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اُس نے جواب دیا "سب لوگ جہاں پناہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں البتہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں پناہ شراب بہت پیتے ہیں" یہ سُن کر کمبوجیہ آگ بگولا ہو گیا اور کہنے لگا "دیکھو تمہارا بیٹا سامنے کھڑا ہے اگر میں ایسا تیر ماروں جو اس کے دل میں ترازو ہو جائے تو ایرانیوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہوگا اور اگر میرا نشانہ چُوک جائے تو البتہ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ شراب نے میرے حواس مختل کر دیئے ہیں" یہ کہہ اُس نے ایک تیر چلّے میں رکھا اور

نشانے پر پھینکا پراکساپس کا جوان بیٹا وہیں ڈھیر ہوگیا۔ کمبوجیہ نے حکم دیا کہ اس کا سینہ چاک کیا جائے۔ فوراً حکم کی تعمیل کی گئی اور زخم کو جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تیر مقتول کے عین دل میں پیوست تھا۔ یہ دیکھ کر کمبوجیہ باغ باغ ہوگیا اور پراکساپس سے بولا "یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانیوں کے اپنے حواس بجا نہیں ہیں" پراکساپس سنجیدگی سے کہنے لگا "ایسا بے خطا نشانہ صرف جہاں پناہ ہی کا ہوسکتا ہے۔"

ایرانیوں کے ایک دشمن امیانوس رُومی نے جو شاپور اعظم کے خلاف لڑتا رہا اعتراف کیا ہے کہ ایرانی قول کے پکے تھے اور اُن کے اخلاق و عادات اعلیٰ تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ملک بھر میں کہیں بھی قحبہ خانے دکھائی نہیں دیتے اور منصف بڑے عادل ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ مُوبدِ موبداں کا بھی بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ مُوبدِ مُوبداں مذہبی اُمور کی قیادت کے ساتھ فال گیری بھی کرتا ہے اور طلسم و نیرنگ سے بھی کام لیتا ہے۔ شاہ ہرمزد ساسانی فوت ہوا تو اُس کے بڑے بیٹے کو نااہل قرار دے کر قید کر دیا گیا۔ اِتفاق سے اُن ایّام بادشاہ کی ایک حرم اُمید سے تھی مُوبدِ موبداں نے نہایت اِعتماد سے اُس حرم کے پیٹ پر تاجِ شاہی رکھ کر رسم تاج پوشی ادا کی چنانچہ اِس حرم کے بطن سے شاہ پور اعظم پیدا ہوا۔ اِسی طرح عسکری جھنڈے درفشِ کاویانی پر سَو کے ہندسے سونے کے پانی سے لکھ کر طلسم بنایا گیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ جس جنگ میں یہ جھنڈا ہوگا اُس میں ایرانیوں کو شکست نہیں ہوگی۔ آخر درفش کاویانی جنگ قادسیہ میں عربوں کے ہاتھوں سرنگوں ہوا۔

ایرانی میلے ٹھیلوں کے بڑے شوقین تھے۔ نَوروز اور مہرگان اُن کے خاص قومی تہوار تھے۔ جو بہار اور خزاں کی آمد پر منائے جاتے تھے۔ نَوروز خاص جوش و خروش سے مناتے تھے۔ آج کل بھی عیدِ نوروز اکیس مارچ سے چار اپریل تک بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی ہے اور سارا کاروبار مُعطّل ہو جاتا ہے۔ قدیم ایرانی یہ "ہفتے عیش و عشرت میں گذارتے تھے۔ وہ چمنستانوں میں جا کر سیر و تفریح کرتے، پیتے پلاتے، گاتے بجاتے

اور ناچ رنگ کی محفلیں برپا کرتے تھے۔ اِن ایام میں ہفت سین کا دسترخوان بچھا رہتا تھا۔ یہ دسترخوان ایسی سات چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا جو حرف سین سے شروع ہوتی ہیں مثلاً سیب، سرکہ، سیر وغیرہ۔ لوگ "نوروز دیدنی" کے لئے عزیزوں اور دوستوں کے گھروں کو جاتے اور ایک دوسرے کو تحائف دیتے تھے۔ وُزراء اور درباری بادشاہ کو قیمتی تحائف دیتے تھے جو عموماً دُگنے کر کے لوٹا دیے جاتے تھے۔ مہرگاں کا تہوار خزاں کے آغاز میں مناتے تھے۔ یہ تہوار متھرا دیوتا سے یادگار تھا۔ ایرانی ۱۳ کے ہندسے کو منحوس سمجھتے تھے۔ آج بھی وہ گنتی کر رہے ہوں تو دوازدہ کے بعد ۱۳ کی بجائے زیاد کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ماہ فرودین کی تیرھویں کو خاص طور سے نحس سمجھتے تھے۔ اس روز سب لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل جاتے تھے۔ یہ رُسوم آج تک باقی ہیں۔

ایران قدیم کے تمدن نے مشرق وسطیٰ کے ممالک پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ یہودیوں نے خدا اور شیطان کی الہیاتی دُوئی بابل کی اسیری کے دوران میں مجوسیوں سے لی تھی۔ اس سے پہلے وہ شیطان کے تصوّر سے ناواقف تھے۔ یہودیت کے واسطے سے جنّت، دوزخ، پل صراط، برزخ، عذاب وثواب، مسیحا، حُوروں اور فرشتوں کے تصوّرات عیسائیت اور اسلام میں بھی نفوذ کر گئے۔ زمان کی مستقیم حرکت کا نظریہ بھی تعلیماتِ زرتشت سے یادگار ہے۔ مجوسی زمان کی گردش دُولابی کے منکر تھے اور زمان کو حقیقی مانتے تھے یعنی کائنات کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی ہوگا۔ اسی تصوّر سے معاد اور حشر نشر کے مذہبی عقائد وابستہ ہیں۔ مشہور انگریز مورّخ ٹوئن بی نے اِس نظریے کو زرتشت کا ایک بہت بڑا فکری اجتہاد قرار دیا ہے۔ ایرانی تمدّن نے مُسلمانوں کو خاص طور سے متاثر کیا۔ بنوعبّاس کے عہد کے تمدّن کو عربی تمدّن کا دورِ زرّیں سمجھا جاتا ہے لیکن اِس تمدّن کی تعمیر و تشکیل میں عربوں کا حصہ برائے نام ہے اور یہ ایرانی تمدّن ہی کی ایک فرع ہے۔ بنوعبّاس نے انتظامِ مملکت، مالگذاری کے طریقے، ڈاک کی ترسیل وغیرہ ساسانیوں ہی سے اخذ کئے تھے۔ اِن کے عہد کے

اکثر علما، فقہا، فلاسفہ سائنس داں اور ادبا عجمی نژاد ہیں۔ ابن المقفع مترجم کلیلہ دمنہ، عربی عروض کا موجد خلیل ابن احمد، سباویہ نحوی، ابن اسحٰق سیرت نگار، نعمان بن ثابت فقیہہ، حمادؔ بن سابور جامع معلقات، الکسائی نحوی، ابو نواس اور بشار بن برد شاعر، فلاسفہ بوعلی سینا، البیرونی، اخوان الصفا، محقق طوسی، متکلمین غزالی، رازی، صوفیہ شیخ عطارؔ، سنائی، رومی، حلاج، شہاب الدین سہروردی مورخین طبری، دینوری، بلاذری، مسعودی، محدثین امام بخاری، امام مسلم، موسیقار ابراہیم موصلی، اسحٰق موصلی، سیاط، زریاب وغیرہ اکثر و بیشتر ایرانی ہیں۔ عباسیوں کے زوال اور ہبوطِ بغداد کے بعد بھی تمدن مغلول اور ترکوں کے توسط سے مصر، ترکی عراق، شام، خراسان، ماوراء النہر، افغانستان اور ہندوستان تک پھیل گیا۔ سلجوقی اور عثمانی سلاطین نے ایشیائے کوچک میں اس کی آبیاری کی، محمود غزنوی اور ظہیر الدین بابر اسے ہندوستان میں لائے۔ پاکستان، ہندوستان، ترکیہ، عراق اور افغانستان کی موسیقی، شاعری، فنِ تعمیر، فلسفے، تصوف، رسوم معاشرہ، آدابِ محفل، لباس کی وضع قطع اور چمن بندی پر ایرانی تمدن کے گہرے اثرات آج بھی باقی و برقرار ہیں۔

برِّصغیر ہند و پاک ایک بہت بڑی تکون ہے جس کا نچلا سرا دُور تک بحرِ ہند میں پھیلتا چلا گیا ہے۔ اِسے چار قدرتی خطّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: شمال مغرب میں ہمالیہ کا سلسلۂ کوہ، سندھ اور گنگا کے میدان جو پنجاب سے لے کر برما تک شرقاً غرباً پھیلے ہوئے ہیں، جنوب میں سطحِ مرتفع دکن، دکن کے مشرقی اور مغربی ساحلی میدان۔ کوہِ ہمالیہ ملک کو شدید سرد ہواؤں سے محفوظ رکھتا ہے اس کے دامن میں ہر قسم کی عمارتی لکڑی کے گھنے جنگل ہیں اور اس کی برف بھری چوٹیوں اور جھیلوں سے ملک کے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں۔ سندھ اور گنگا کے میدان اُس مٹّی سے بنے ہیں جو دریا پہاڑوں سے بہا کر لاتے ہیں۔

اِس میدان کا شمار دنیا کے زرخیز اور گنجان آباد علاقوں میں ہوتا ہے۔ یہاں سال میں دو فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔ مشرقی حصّے میں زیادہ تر چاول کی کاشت کی جاتی ہے اور مغربی حصّے میں گیہوں، کپاس، گنّا، دالیں وغیرہ اُگائی جاتی ہیں۔ آسام اور بنگال میں گھنے جنگل ہیں جن میں شیر اور ہاتھی پائے جاتے ہیں۔ کوہ وندھیاچل شمالی میدان کو سطحِ مرتفع دکن سے جدا کرتا ہے۔ دکن کی زرخیز سیاہ مٹّی میں کپاس، گنّا اور تمباکو کی کاشت کی جاتی ہے۔ ملک کی زرخیزی کا انحصار زیادہ تر موسمی ہواؤں پر ہے جو خلیج بنگال سے اُٹھ کر جولائی اور اگست کے مہینوں میں بارش برساتی ہیں۔ قدرتی اور زرعی پیداوار کے علاوہ ہندوستان میں کم و بیش تمام بڑی بڑی دھاتیں نکالی جاتی ہیں: کوئلہ، لوہا،

چونے کا پتھر، منگانیز، قلعی اور سونے کی کانیں مشرقی اور جنوبی سطح مرتفع میں ہیں۔ کسی زمانے میں ہندوستان میں دُنیا بھر کے سب سے قیمتی ہیرے کھود کر نکالے جاتے تھے اور اِس کی دولت کی تمام اقوام میں دُھوم تھی۔ اِسی شُہرت نے شمال مغربی درّوں سے آریاؤں، ایرانیوں، ہنوں، سیتھیوں، تُرکوں، اور تاتاریوں اور سمندری راستے سے ولندیزوں، پُرتگیزوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں کو فوج کشی کی ترغیب دی تھی۔

جدید تحقیق کے مطابق برِصغیر میں قدیم پتھر کے زمانے کا انسان موجود تھا جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور کس نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ مغربی پنجاب میں وادیٔ سواں سے پتھر کے بنے ہوئے آلات ملے ہیں جو اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ آج سے کم و بیش پانچ لاکھ برس پہلے انسان اِس علاقے میں بُود و باش رکھتا تھا۔ اس کے بعد بیرونِ مُلک سے کچھ وحشی قبائل خوراک کی تلاش میں مُلک میں داخل ہوئے جو بڑی مشرقی حبشی شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور جنہیں آسٹریلائڈ کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد بحیرۂ رُوم کی نسل کے کُچھ لوگ شمال مغربی درّوں سے وارد ہوئے۔ آسٹریلائڈ اور بحیرۂ رُوم کی نسل کے اختلاط سے دراوڑی نسل معرضِ وجود میں آئی۔ دراوڑوں نے کھیتی باڑی شروع کی، جانور پالنے لگے۔ اور شہر بسا کر رہنے لگے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ اُن کے تجارتی روابط قدیم عراق کے مُتمدّن سُمیریوں سے اُستوار ہو گئے۔ اِن تمدّنوں کی اوّلیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ میکڈونلڈ کہتا ہے کہ یہ تمدّن سُمیریا کی فرع تھا جب کہ ہال کے خیال میں سُمیریا کا تمدّن بذاتِ خود ہڑپائی تمدّن کی ایک شاخ ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ وادیٔ سندھ کے جہاز راں بحری سفر کر کے سُمیریا اور بابل تک جایا کرتے تھے۔ اِس بات کے شواہد بھی موجود ہیں کہ جب مِصر میں بڑا اہرام تعمیر کیا گیا اُس وقت ہڑپّا اور موئن جودڑو کا تمدّن عروج پر تھا۔

وادیٔ سندھ کا تمدّن جس کے آثار موئن جودڑو اور ہڑپا سے ملے ہیں جنابِ مسیح کی پیدائش سے تین ہزار برس پہلے موجود تھا۔ اِس مُدّت کا تعین اُن نگینوں سے کیا گیا ہے جو یہاں سے برآمد

ہوئے ہیں اور جو سُمیریا کے نگینوں کے مشابہ ہیں۔ سرجان مارشل نے موئن جو دڑو کے مقام پر کئی شہر کھدائی سے برآمد کیے جن کے آثار ایک دوسرے کے اوپر واقع ہیں۔ پہلا شہر غالباً ۳۲۰۰ء (ق م) کا ہے، دوسرا ۳۰۰۰ء (ق م) کا اور تیسرا کم و بیش ۲۹۰۰ء (ق م) کا پرانا ہے۔ شہروں کی ٹھوس اور مضبوط بنیادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ شہری زندگی سے بخوبی آشنا تھے، مویشی پالتے تھے، سُوتی کپڑا بُنتے تھے، روغنی برتن بناتے تھے۔ جن پر گیروے رنگ، نارنجی رنگ اور سیاہ رنگ کے نقوش بناتے تھے۔ تانبے کے اوزار اور برتن بھی ملے ہیں۔ موئن جو دڑو اور ہڑپا آگ میں پکائی ہوئی اینٹوں کے شہر ہیں جو کھِگل پر چُنی جاتی تھیں۔ معبد اور مناروں کا کوئی نشان نہیں ملا۔ ایک مکان کئی کمروں پر مشتمل ہوتا تھا اور ہر گھر میں سیڑھیاں اور غسل خانے بنائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے عوامی غسل خانے بھی تھے۔ پانی کے نکاس کے لئے ڈھکی ہوئی نالیاں تھیں۔ شہر کے گرد فصیل نہیں تھی۔ گندم، جَو، کپاس اور نیل نکالنے والے بیج اُگائے جاتے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کاشت کار ہل چلاتے تھے یا پھاوڑے سے زمین کھودتے تھے۔ سئور، بھینس، کُتا، مرغی اور بھیڑیں پالتے تھے۔ مُرغیوں کے جو ڈھانچے ملے ہیں وہ اپنی نوع کے قدیم ترین ہیں۔ اُونٹ اور ہاتھی کی ہڈیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ نرم پتھر، ہاتھی دانت، ہڈی اور مٹی کے بنے ہوئے نگینے ہیں جن پر نقش کندہ کئے گئے ہیں۔ بلیں کے قریب ایسے نگینے ہیں جن پر بیل کی شبیہ نقش کی گئی ہے نگینوں پر شیر اور گینڈے کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سینگ والے دیو مالائی بیل اور ہرن کے نقوش بھی ہیں۔ بیل گاڑی کے کھلونے ملے ہیں جو آج کل کے دیہاتی چھکڑوں کے مشابہ ہیں۔ گھوڑے اور گدھے کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ وادیٔ سندھ کے باشندے برتن بنانے کا چاک استعمال کرتے تھے۔ سُوتی کپڑا بُنا جاتا تھا۔ مرد عورتیں ستر پوشی کے لئے چادر استعمال کرتے تھے۔ دراوڑ سونے، چاندی، تانبے اور سیسے کے استعمال سے واقف تھے۔ اور دھاتیں ڈھالنے میں ماہر تھے۔ سونے چاندی کے کڑے، آویزے اور گلے کے ہار اس

قدر عمدہ اور نفیس بنائے گئے ہیں کہ آج کل کے سنار بھی حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ کانسی بنانا جانتے تھے۔ شیشے کا نشان نہیں ملا۔ اُن کی تحریر چار سو کے قریب علامات پر مشتمل تھی اسے پڑھنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اُن کی اپنی دیو مالا تھی۔ کچھ آدمی ہیں جو دو پاؤں پر کھڑے ہوئے شیروں سے کشتی لڑ رہے ہیں لنگ پوجا کا رواج تھا۔ پتھر کے بنے ہوئے لنگ ملے ہیں جو یونی میں نصب ہیں۔ شیو دیوتا سے ملتا جلتا ہوا ایک نقش ہے جس کے تین چہرے ہیں اور جو یوگی کا آسن جمائے بیٹھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی آریاؤں نے دراوڑوں کی دیو مالا اور مذہبی شعائر اپنا لئے، ہندی آریاؤں کا بھوت پریت کا تصور، ناگ پوجا (ایک نگینے پر دو سروں والا سانپ) ملا ہے، دھرتی دیوی کی پوجا، یوگی کا آسن، خرافیاتی حیوان، شیو پوجا، مورتی پوجا، نندی (مقدس بیل) کی پوجا، ہنومان جیسے نیم حیوانی انسان، یکشا اور یکشنیاں، اپسرائیں، دیو مالائی قصے، توہمات اور جادو کی رسوم ہیں وادیٔ سندھ کے اس قدیم تمدن کے آثار موجود ہیں۔ سارناتھ (تیسری صدی قبل مسیح) اور سانچی کے دروازوں پر بنائے ہوئے جانوروں کے نقوش (پہلی صدی قبل مسیح) اور موئن جو ڈرو کے تراشیدہ حیوانات کے نقوش میں نمایاں رابطہ پایا جاتا ہے۔ ہندی آرٹ کا سب سے نمایاں وصف فطرت نگاری ہے جو اپنی لچک اور پھیلائی کے لحاظ سے موئن جو ڈرو کے آرٹ کا فیضان ہے، اسی طرح موئن جو ڈرو میں سنگ جراحت کا ایک پتلا ملا ہے جس کا جسم کچھ مینڈھے کا ہے، کچھ بیل کا ہے اور کچھ ہاتھی کا ہے۔ ایک گلی بت بنذر کا ملا ہے۔ یہ سب ہندوستانی سنگ تراشی یعنی اشوک کے ستونوں سے لے کر موالی پورم تک کے مجسموں کی پیش قیاسی کرتے ہیں۔[1] اسی طرح ہندوستانی سنگ تراشی کی ایک اور خصوصیت یعنی ترکیبی ساخت جیسی

---

[1] GROUSSET, RENE.: CIVILAZATIONS OF THE EAST

اور کُتّے کے اُن نقوش میں دکھائی دیتی ہے جو موئن جو دڑو سے ملے ہیں۔ اِن نگینوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح ایک شکاری چیتے کی کھوہ میں بیٹھا ہے جو اپنا مُنہ پیچھے کی طرف موڑے ہوئے ہے یا کس طرح ایک گینڈا دو آدمیوں پر حملہ کر رہا ہے۔ مُجسّمہ سازی کے علاوہ نو وارد خانہ بدوش گھوڑے پالنے والے آریائی قبائل نے فنِ تعمیر، شہروں کے نظم و نسق، قوانین، نظمِ مملکت، آدابِ معاشرت، کاشتکاری، کپڑا بُننے، برتن بنانے کے طریقے متمدّن دراوڑوں سے سیکھے تھے۔ آریائی قبائل ۲۰۰۰، (ق م) اور ۱۵۰۰ء (ق م) کی درمیانی صدیوں میں ایران سے وادیٔ سندھ میں داخل ہونا شروع ہوئے اُن کی زبان میں دریا کو سندھو کہتے تھے۔ سندھ کا نام اُنہیں کا دیا ہوا ہے۔ اِسی دریا کی نسبت سے وہ مُلک کو سندھو یا سندھ کہنے لگے۔ کم و بیش پانچ سو سال تک وہ پنجاب میں مقیم رہے پھر وادیٔ گنگ و جمن کی طرف بڑھ گئے اور اُس کا نام آریہ ورت رکھا۔ پُرانوں میں اِسے بھارت ورش کہا گیا ہے۔ ایرانیوں نے اپنے لہجے میں سِندھو کو ہِندھو اور سِندھ کو ہند کہنا شروع کیا جو یونانیوں اور رُومیوں کا انڈیا بن گیا۔ سندھی اپنے مُلک کو سِندھ ہی کہتے رہے جب کہ غیر مُلکیوں نے اِس کے دو حصے کر ڈالے: سِندھ اور ہند۔ عربوں کی آمد تک یہی تقسیم قائم تھی[1]۔

ہندوؤں کو کسی زمانے میں بھی تاریخ نگاری سے دلچسپی نہیں رہی۔ تاریخی شعور کے اِس فقدان کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم زمانے کے حالات حملہ آوروں کے آثار کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ چینی سیاحوں کے بیانات، ہخامنشیوں، یونانیوں اور عربوں کے سیاحت ناموں نے اِن تاریک صدیوں کو منوّر کرنے میں مدد دی ہے۔

نو وارد آریائی قبائل مُلکی باشندوں کو شکست دے کر دریائے سندھ کے طاس

---

[1] تاریخ سندھ ابوظفر ندوی۔

میں آباد ہو گئے۔ رگ وید کے دوسرے منڈل سے دسویں منڈل تک اس عہد کے مذہبی عقائد اور معاشرتی زندگی کا ذکر آیا ہے۔ پہلے اور دسویں منڈل، سام وید اور یجر وید میں ان کے معاشرے کی زیادہ ترقی یافتہ صورت دکھائی دیتی ہے اتھر وید اور برہمنوں میں ویدوں کا زمانہ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا جب گنڈک تک کا ملک فتح کر لیا گیا اور ملکی باشندوں کو غلام بنا لیا گیا۔ ویدوں کے زمانے کا آریائی تمدّن کانسی کو زمانے کے اواخر کا تمدّن ہے۔ کانسی کا ذکر لوہے کی بہ نسبت زیادہ تواتر و تسلسل سے آتا ہے۔ آریاؤں کا نظام معاشرہ پدری تھا۔ سردار اپنے اپنے قبیلوں پر حکومت کرتے تھے۔ نو وارد آریانے ملکی تمدّن میں گھوڑے، رتھ، لوہے اور اگنی پوجا کا اضافہ کیا۔ جب تمدّن کا منظر گنگا کے میدان کو منتقل ہو گیا تو راجاؤں نے اپنی اپنی راجدھانیاں قائم کیں، پروہتوں نے مذہبی امور سنبھال لئے اور بڑے بڑے شہر تعمیر کئے گئے۔ ویدوں کے زمانے کے بعد عہد شجاعت کا آغاز ہوا جس میں مہا بھارت کی جنگ لڑی گئی، اُنپشد، آرنیک اور پران لکھے گئے۔ وشنو اور شیو کی پوجا کی ابتداء ہوئی، علم ہیئت، ریاضی، موسیقی اور مصوری کو ترقی ہوئی، گوتم بدھ اور مہاویر نے برہمنوں کی مذہبی اجارہ داری کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ اسی زمانے میں شمال مغربی علاقوں پر جنہیں آج کل افغانستان اور پنجاب کہا جاتا ہے ہخامنشی ایرانیوں کا تسلط ہو گیا۔ بیستوں کے حجری کتبے میں داریوش اوّل نے اس علاقے کو گندھارا کہا ہے ۳۲۷ء (ق م) میں سکندر فاتحانہ یلغار کرتا ہوا گندھارا میں داخل ہوا تو ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ سکندر کی واپسی پر چندر گپت موریا نے ایک وسیع اور طاقتور سلطنت قائم کی۔ اشوک نے بدھ مت کی اشاعت کی۔ اُس کی موت کے بعد گپتا خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔ ۲۰۰ء (ق م) کے لگ بھگ گندھارا پر باختر کے یونانی آبادکاروں نے قبضہ کر لیا۔ دیمتریس کے عہد میں اُن کی سلطنت مالوا، گجرات اور کشمیر تک پھیل گئی۔ دیمتریس

نے اپنے سکوں پر یونانی حروف کے ساتھ ساتھ خروشتی حروف بھی کندہ کرائے۔ باختریوں کا خاتمہ سیتھیوں کے ہاتھوں ہوا۔ پہلی صدی عیسوی میں کُشانوں نے کابل فتح کیا اور آگے بڑھ کر شمال مغربی ہند پر قبضہ کر لیا۔ ان کا بادشاہ کنشک علم دوست تھا۔ چرک نے طب کی تدوین کی، ناگ ارجن اور اشو گھوش نے مہایانا بدھ فرقے کی بنیاد رکھی۔ کنشک نے بدھ مت قبول کر لیا اور مہایانا فرقے کی اشاعت دور دراز کے ممالک میں ہوئی۔ موریا خاندان کے زوال پر وسطی ہند میں سُنگا خاندان کی حکومت قائم ہو گئی جو ۷۲ء ق م تک مگدھ کے تخت پر قابض رہے۔ ان کی سلطنت دریائے گنگا کے میدان ہی تک محدود رہی۔ دکن میں آندھرا راج قائم ہو گیا جو ۲۰۰ ق م سے ۲۰۰ء (ب م) تک قائم رہا۔ سُنگا اور آندھرا خاندانوں نے اشوک کی فنی روایات کو آگے بڑھایا۔ ان کے عہد میں بھرہوت، کارلی، سانچی اور امراؤتی کے مشہور بودھ ستوپے تعمیر کئے گئے۔ چوتھی صدی عیسوی میں گپتا خاندان کو عروج حاصل ہوا۔ گپتا عہد کو ہندوستانی تاریخ کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے۔ چندر گپت دوم یا وکرمادتیہ اس خاندان کا سب سے مشہور راجہ تھا۔ اس کے عہد کے حالات چینی سیاح فاہیان نے لکھے ہیں وکرمادتیہ ہی سے سن بکرمی کا آغاز بھی ہوا تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں اُجین کا شہر مشاہیر شعراء اور تمثیل نگاروں کا مرجع بن گیا جن میں کالی داس اور وراہمہر بہت مشہور ہیں۔ گنورامن، دلیشو بندو، آریہ بھٹ اور برہم گپت کا شمار بھی وکرمادتیہ کے نورتنوں میں ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں برہمن مت کا احیاء ہوا۔ برہمن جو بدھ مت کی اشاعت کے بعد بے دست و پا ہو چکے تھے۔ دوبارہ برسرِ اقتدار آ گئے۔ اسی عہد میں رامائن اور مہابھارت کی تکمیل کی گئی۔ اجنتا کے غاروں میں بودھوں کی مصوری بامِ کمال کو پہنچ گئی۔ گپتا خاندان کے زوال کے بعد ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا جس میں کھشتریوں کی ذات فنا ہو گئی۔ مسلمانوں کی آمد پر جب ملک پر سے تاریکی کے دبیز پردے ہٹ گئے

نو سر کہیں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ ہنوں، سیتھیوں، کشانوں اور باختریوں کی نسل سے جو سردار شمال مغربی ملک کے مختلف حصوں پر حکومت کر رہے تھے راجپوت کہلانے لگے اور برہمنوں نے اُن کا شجرۂ نسب سُورج اور چاند سے ملا کر اُنہیں کھشتریوں کا جانشین تسلیم کر لیا۔

تاریخی پہلو سے ہندو مت کے چار دَور ہیں!

۱- ویدوں کا زمانہ جس میں چار وید، برہمن اور آرنیک مُرتّب کئے گئے، ۲- اپنشدوں کا دَور جس میں ابتدائی اُپنشدوں کی تدوین کی گئی، درشنوں کو مُرتّب کیا گیا، رامائن، مہابھارت اور منوشاستر تالیف کی گئیں۔ بدھ مت، جین مت، شیومت ظاہر ہوئے ۳- سُوتروں کا زمانہ جس میں مذہبی عقاید اور فلسفیانہ نظریات کو ایجاز و اختصار کے ساتھ سُوتروں کی صورت میں ترتیب دیا گیا ۴- پرانوں کا دور۔ ۵۰۰ء (بعد مسیح) تک اٹھارہ پران لکھے جا چکے تھے۔ ان میں کم و بیش چار لاکھ اشعار ہیں۔ آج کل کے ہندوؤں کی اکثریت پرانوں ہی کو مانتی ہے۔

رگ وید کے دیوتا قدرتی مظاہر کی علامتیں ہیں اِندر گرج چمک کا دیوتا ہے جو بادلوں کو ہانک کر لاتا ہے اور اُنہیں برسنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگنی آگ کا دیوتا ہے۔ ہندی آریا بھی ایرانیوں کی طرح آگ کی تقدیس کرتے تھے، وایو ہوا کا دیوتا ہے جو اِندر کا رفیق ہے "خوشبوؤں کا حامل"، اور "دائم رواں دواں" اِس کے القاب ہیں، رُدر طوفان کا دیوتا ہے۔ یاما مُردوں کا خداوند ہے اور موت کے بعد اعمال کا حساب لیتا ہے۔ اِس کے کارندوں کو یم دُوت کہتے ہیں اِس کے پاس دو کُتّے ہیں۔ آسمان کو دیوس پتر (آسمانی باپ) کہتے تھے۔ سوم (ایرانیوں کا ہوم) شراب اور نشے کا دیوتا ہے۔ کُل تنتیس دیوتا ہیں جن میں صرف دو دیویوں کا ذکر آیا ہے: اُوشا، صبح کی دیوی اور پرتھوی دھرتی دیوی۔ اِن میں یاما، مترا (ایرانیوں کا مِتھرا) اور سوم ایرانی

اوز ہندی آریاؤں کے مشترک دیوتا ہیں۔ اوستا میں اندر کو عفریت کہا گیا ہے۔ اندر کے لئے دوسو
پنچاس منتر ہیں، اگنی کے لیئے دو سو کے لئے ایک سو کے قریب، بارش کے دیوتا پرجنیہ
کے لئے تین، یاما کے لئے تین، دیوس پتر اور پرتھوی کے لئے مشترک منتر ہیں جن کی تعداد چھ
ہے۔ ایک منتر دریائے سندھ کے لئے بھی ہے، رگ وید میں کل ایک ہزار اٹھائیس منتر
ہیں۔ سورج دیوتا کے کئی القاب ہیں: متر (دوست) سوریہ (خالق) سوتری (محرک) گایتری
کے مقدس ترین منتر ہیں جسے سوتری بھی کہتے ہیں سورج دیوتا ہی کی مناجات کی گئی ہے۔ ان
سب دیوتاؤں میں اندر کو قدیم ہندی آریاؤں کا قومی دیوتا یا خداوند خدا سمجھا جاتا ہے۔ ایک
چوتھائی رگ وید اسی کی تمجید کے لئے وقف ہے۔ وہ سوم رس پینے کا شیدائی ہے اور عیش
وعشرت میں غرق رہتا ہے۔ اپسرائیں اور یکشنیاں اسے رقص وسرود سے محظوظ کرتی رہتی
ہیں۔ اس کے بعد اگنی کا درجہ ہے، تیسرے درجے پر سوم ہے جسے امرت (غیر فانی اور وناس
پتی (جنگل کا آقا) بھی کہا گیا ہے۔ بعد میں چندر (چاند دیوتا) کا نام سوم رکھ دیا گیا۔ رگ وید
میں وجودِ مطلق کا مبہم سا تصور موجود ہے جسے پرجاپتی، ایکم پرش اور تد ایکم (وہ ایک)
کہا گیا ہے، یجروید میں وہ خداوند خدا بن گیا۔ آدت کی صورت میں سریانی خدا کی جھلک بھی
دکھائی دیتی ہے۔ رگ وید میں آیا ہے کہ "وہ جو ایک ہے سب کچھ ہو گیا ہے" رگ وید کی
رو سے پرجاپتی نے دنیا کو اس طرح بنایا جیسے کاریگر کسی چیز کو بناتا ہے۔ تخلیق سے پہلے محض
خلا تھا جس میں ایکم سانس لیتا تھا پھر اس کے دل میں تمنا پیدا ہوئی اور کائنات کی تخلیق
عمل میں آئی۔ رگ وید کے شاعروں نے جابجا طفلانہ قیاس آرائیوں سے بھی کام لیا ہے۔
ایک شاعر حیران ہوتا ہے کہ سورج آسمان سے گر کیوں نہیں پڑتا، دوسرا تعجب سے پوچھتا
ہے کہ دن کو تارے کہاں چلے جاتے ہیں، تیسرا حیرت سے کہتا ہے کہ سمندر میں ہر وقت دریا
گرتے رہتے ہیں۔ اور وہ نہیں بھرتا چوتھا کہتا ہے کہ بھوری گائے کے تھنوں سے سفید
رنگ کا دودھ کیسے نکلتا ہے۔

رگ وید کے پُرش منتر میں صرف ایک بار ذات پات کی تمیز کا ذکر آیا ہے۔ غیر آریاؤں کو دسیو کہا گیا ہے جو ملکی باشندے تھے۔ انہیں رگ وید میں کافر، گندے اور لنگ کے پجاری کہا گیا ہے۔ رگ وید کے زمانے میں ہون اور قربانی سے دیوتاؤں کی رضا کی خاطر مقصود تھی۔ کھلے میدان میں آگ جلا کر ہون کنڈ بناتے تھے اور آگ میں گھی، چاول وغیرہ ڈال کر منتر پڑھتے تھے۔ مُردوں کو دفن کرنے کا دستور بھی تھا۔ اِندر دیوتا پر بیل قربان کرتے تھے۔ اور اِس قربانی کا گوشت کھاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر گائے ذبح کی جاتی تھی اور اُس کا گوشت مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ سب سے اہم سفید گھوڑے کی قربانی تھی جسے اشومیدھ یگ کہتے تھے۔ قربانی کے گھوڑے سے پہلے ایک بکری ذبح کی جاتی تھی تاکہ وہ پہلے سے جاکر دیوتاؤں کو گھوڑے کی قربانی کی خوشخبری دے۔ قربانی کے گھوڑے کا گوشت کھاتے تھے۔ قربانی کے گھوڑے کو زمین پر لٹا کر اس کی ٹانگیں جکڑ دی جاتی تھیں۔ پروہت اُس کا سینہ چاک کرکے دھڑکتا ہوا دل کھینچ کر باہر نکال لیتا تھا۔ بعض حالات میں انسانی قربانی بھی دیتے تھے۔ رگ وید کے بعد کے تین وید اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب آریا پنجاب سے آگے بڑھ کر گنگا جمنا کی وادی میں آباد ہو چکے تھے اور ملکی باشندوں کی رسُوم و روایات اُن میں گھر کر چکی تھیں چنانچہ یجر وید میں گائے کو مارنا سنگین جرم بن گیا جس کی سزا موت تھی۔ رگ وید میں ناگ پُوجا کا ذکر نہیں ملتا لیکن یجر وید میں اِس پر زور دیا گیا ہے۔ یجر وید میں رسوم و عبادت کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ رگ وید میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے یگیہ کرتے تھے اب یہ عقیدہ اُبھرنے لگا کہ یگیہ کرکے دیوتاؤں کو حسب مرضی کام کرنے پر مجبور کیا سکتا ہے گویا پروہت دیوتاؤں پر متصرف ہو گئے۔ سام وید میں گانے بجانے کے اصول درج ہیں اور اتھروید میں سحر و طلسمات کے منتر دیئے گئے ہیں جن سے امراضِ جسمانی کا علاج بھی کیا جاتا تھا اور محبوبہ کے دل کو بھی رام کیا جا سکتا ہے۔ بعض برہمن اتھروید کو الہامی نہیں سمجھتے کیوں کہ یہ سراسر توہمات اور خرافیات کا دفتر

بے معنی ہے۔ ویدوں میں کہیں بھی مورتی پوجا کا ذکر نہیں ہے ان میں اسُروں کو دیوتاؤں کا اور راکششسوں کو انسانوں کا دشمن مانا گیا ہے لفظ اسُر وہی ہے جو اوستا کا اہورا ہے جسے ایرانی خداوند خدا مانتے تھے۔ ہندوستان میں آکر اہورا خبیث رُوح بن گیا۔ جیسے ہندوؤں کا دیوتا ایرانیوں کے ہاں دیو بن گیا۔

ہندوؤں کی مذہبی رسوم میں جن کا ذکر ویدوں میں آیا ہے دو رسمیں خاص طور سے اہم سمجھی جاتی تھیں۔ جنیو پہننا اور شرادھ کرنا۔ برہمن کو سولہ برس کی عمر سے پہلے کھشتری کو بائیس برس اور ویش کو چوبیس برس کی عمر سے پہلے جنیو پہنانے تھے۔ اس رسم کی ادائیگی کے وقت پنڈت منتر گائتری پڑھاتے تھے۔ ماں باپ کی وفات کے بعد شرادھ کی رسم نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ ہر ماہ چاول، گھی، شہد کا بڑا سالذیذ لڈو بنوا کر اور منتر پڑھوا کر مُردے کی رُوح کو بلوایا جاتا تھا۔ پھر برہمن بھوجن کرتے جسے پنڈ دان کہتے تھے۔ ویدوں میں کہیں بھی گُناہ اور اس کی پاداش کا ذکر نہیں آیا۔ لی بان ویدوں کے زمانے کے مذہب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"ویدک مذہبی خیالات کی کم وبیش یہ تقسیم معلوم ہوتی ہے ۱۔ قوائے فطری کی پرستش ۲۔ ان قوائے فطری کو دیوتا قرار دے کر ان کے نام رکھنا۔ ۳۔ رُوح کی بقا کا اعتقاد ۴۔ پترکھوں (بزرگوں) کی پرستش۔ ۵۔ کُل عالم یعنی انسان اور دیوتاؤں کو ایک بڑے اور زیادہ قوی دیوتا یعنی اندر کے تحت میں لانے کی طرف میلان ۶۔ مذہب کو بالکل مادی قرار دینا یعنی دیوتاؤں اور انسان میں ایک غرض کا تعلق قائم کرنا۔ انسان کا اپنی طرف سے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دیوتاؤں کا اس کے معاوضے میں انسان کو کثرت سے غلّہ اور مال وصحت عطا کرنا" (تمدنِ ہند)

ویدوں میں دیو مالا کا بیان ہے جب کہ برہمنوں میں پوجا کی رسوم کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ زمانے کے گذرنے کے ساتھ یہ رسمیں اس قدر پیچیدہ ہو گئیں کہ اِس

پہلو سے کوئی بھی مذہب ہندومت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروہت جو ان رسوم کی ادائیگی سے واقف تھے معاشرے پر پوری طرح مسلط ہو گئے۔ برہمنوں میں مذہب کا صرف رسمی و رواجی پہلو زیر بحث آیا ہے جسے کرم کانڈ کہتے ہیں۔ برہمنوں کے دور میں تارک الدنیا تپسویوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جو جنگلوں میں آشرم بنا کر رہتے اور گیان دھیان میں اپنی عمر بتا دیتے تھے۔ ان کے افکار آرنیک اور اپنشدوں میں ملتے ہیں یہ تپسوی اپنے طلبہ کو باطنی علوم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ چنانچہ اپنشد کا لغوی معنی قریب بیٹھنے ہی کا ہے۔ اہل تحقیق کے خیال میں اپنشد ۱۰۰۰ء (ق م) اور ۸۰۰ء (ق م) کے درمیان میں لکھے گئے تھے۔ اپنشدوں میں ایک نرگن (صفات سے عاری) غیر شخصی روح کائنات کا تصور رونما ہوا جسے برہم یا برہمن کا نام دیا گیا۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا "نیتی نیتی" (وہ یہ نہیں، وہ یہ نہیں) ویدوں میں اس برہمن کا کہیں بھی ذکر نہیں آیا۔ اپنشدوں میں وحدت الوجود کے نظریے کو شرح و بسط سے پیش کیا گیا۔ ان کی رو سے برہمن انتریامی (کائنات میں طاری و ساری) ہے۔ برہمن سے الگ کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے، گویا برہمن ہی کائنات ہے۔ اپنشد تعداد میں ایک سو آٹھ ہیں۔ ان کے مطالب بے ربط ہیں، ان میں اوہام و خرافات کی بھرمار ہے لیکن اس کے باوصف ان میں دقیق فلسفیانہ مباحث بھی ملتے ہیں۔ ان کے لکھنے والوں کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔ البتہ ایک ودوان یجنا ولکیہ اور ایک پڑھی لکھی خاتون گارگی اور ان کے مناظروں کا ذکر آیا ہے۔ اپنشد کے مولفین کا پہلا سبق یہ ہے کہ انسانی عقل برہم کے ادراک سے قاصر ہے، حواسِ انسانی ناقص اور محدود ہیں، علم کے وسیلے سے آتما کی حقیقت کا پتہ لگانا ناممکن ہے، جو یائے حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ کتابی علوم کو بالائے طاق رکھ دے، حواس کے دریچے بند کرنے ہی سے باطن روشن ہو سکتا ہے۔ یجنا ولکیہ کہتا ہے کہ آتما (انفرادی روح برہم میں جذب ہوگی تو انفرادی شعور مٹ جائے گا اور جزو (آتما) جو عارضی طور پہ کل (برہم) سے جدا ہوا تھا دوبارہ اس میں ضم ہو جائے گا جس طرح بہتا

ہوا دریا سمندر میں غرق ہو جاتا ہے۔ اُپنشدوں میں جنانا کانڈ (مفکرانہ مذہب) کی تلقین کی گئی ہے۔

ویدوں کے مولف شاعر تھے، بدھمن پروہتوں نے لکھے اُپنشد مفکرین کے تصورات و مراقبات پر مشتمل ہیں۔ ویدوں میں اتنا کہا گیا تھا کہ مرنے والوں کی رُوحیں پانیوں میں چلی جاتی ہیں۔ اِس ابتدائی تصور پر اُپنشدوں میں کرم کا پیوند لگایا گیا اور کہا گیا کہ انسانی رُوح اپنے اعمالِ نیک و بد کے لحاظ سے نیا جنم لیتی ہے یا چولا بدلتی ہے جس میں گذشتہ جنم کا کرم بھوگنی ہے۔ کرم سے کسی صورت میں بھی نجات ممکن نہیں ہے۔ سنسار چکر سے نجات پانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی آتما برہم میں جذب ہو کر فنا ہو جائے۔ ساتویں صدی عیسوی تک کرم کا یہ نظریہ ہندومت کا مرکزی تصور بن چکا تھا۔ اور ہندوؤں کے مزاجِ عقلی میں اِس حد تک نفوذ کر چکا تھا کہ مہاویر اور گوتم بدھ جیسے مصلحین نے بھی جو خدا کی ہستی ویدوں اور یگیہ کے منکر تھے۔ اسے قبول کر لیا۔

چھٹی صدی قبل مسیح تک برہمنوں کے بے پناہ تسلط کے خلاف ردِعمل کا آغاز ہو چکا تھا۔ دوسری ذاتوں کے لوگ بالخصوص کھشتری برہمنوں کے جارحانہ احساس برتری کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ اور برملا کہتے تھے کہ برہمن مذہب کے نام پر ذاتی اغراض کی پرورش کرتے ہیں۔ مہاویر اور گوتم بدھ کی بغاوت اِسی رجحان کا نشان دہی کرتی ہے۔ ان سے پہلے چارواک یا برہسپتی کے پیرو برہمنوں کے خلاف بغاوت کا عَلم بلند کر چکے تھے۔ برہمن انہیں ناستک یا ملاحدہ کہتے تھے۔ چارواک میں سنگایا، پورن کیشپ، گوسال اور کمبالین پیش پیش تھے۔ چارواک کے لغوی معنی، جو بولنے میں تیز طرار ہو، چارواک نام کا ایک شخص بھی ہو گزرا ہے۔ ویدوں اور خدا کے منکر تھے۔ اور کہتے تھے کہ یگیہ جیسی رسمیں برہمنوں نے اپنی شکم پروری کے لئے بنا رکھی ہیں۔ مادیت پسند ہونے کے باعث انہیں لوکایت (لوک بہ معنیٰ مادہ) بھی کہا جاتا ہے۔ اُن کی تعلیم یہ تھی کہ حقیقت کا ادراک صرف حواس خمسہ ہی

سے ممکن ہو سکتا ہے جو کچھ بھی حواس خمسہ سے ماوراء ہے اُس کے متعلق ہم کبھی کچھ نہیں جان سکیں گے۔ جیوا ور آتما کے تصورات محض واہمے ہیں۔ مافوق الفطرت کا وجود خیالی اور فرضی ہے۔ تمام مظاہر فطری ہیں، صرف مادہ حقیقی ہے۔ جسم ذرات سے مرکب ہے اور ذہن وہ مادہ ہے جو سوچتا ہو۔ جسم سے الگ رُوح کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان فانی ہے اور موت کے بعد مٹی میں مل جائے گا۔ بقا کا عقیدہ وہم ہے اور مذہب پروہتوں کا رچایا ہوا ڈھونگ ہے، برہمنوں کی لیلا ہے، کائنات کو سمجھنے کے لئے خُدا کا وجود ضروری نہیں ہے کہ وہ خدا کے بغیر ازل سے موجود ہے، انسان مذہب کو اس لئے ضروری سمجھتا ہے کہ وہ اُس سے مانوس ہو چکا ہے۔ جب علم کی ترقی اہلِ مذہب کے عقاید کو متزلزل کر دیتی ہے تو وہ اپنے ذہن میں خلا محسوس کرتے ہیں جو اُن کے لئے ذہنی اذیت کا باعث ہوتا ہے، اخلاق خدا کے احکام کا محتاج نہیں ہے، معاشرے کی رُسوم کا نام ہے، فطرت خیر و شر سے بے پرواہ ہے۔ سُورج رشیوں اور پاپیوں پر ایک جیسا چمکتا ہے، زندگی کا واحد مقصد مسرت کا حصول ہے۔

برہسپتی کہتا ہے " جب تک جیو سُکھ سے جیو، کوئی انسان موت کے اختیار سے باہر نہیں ہے جسم مٹی میں مل جائے تو آواگون یا سنسار چکر کیسے ممکن ہو سکتا ہے، جس طرح ہو سکے آنند سے رہو، دنیا سے حسب مرضی لطف اٹھاؤ، یہی حقیقی دُنیا ہے۔ پرلوک (دوسری دنیا) کچھ بھی نہیں ہے جو لوگ دُکھ سے ملے ہوئے سُکھ کو ترک کر دیتے ہیں وہ جاہل ہیں جس طرح غلّہ کا طالب دانہ نکال کر بھوسہ الگ پھینک دیتا ہے۔ اسی طرح داناؤں کو چاہیے کہ سُکھ کو لیں اور دُکھ کو چھوڑ دیں کیونکہ جو شخص اس جہان کے سُکھ کو چھوڑ کر فرضی سوَرگ (بہشت) کا خواب دیکھتا رہتا ہے وہ احمق ہے۔ پرلوک کے حصول کے لئے مکار برہمنوں کی بنائی ہوئی رُسوم ادا کرنے والے نادان ہیں۔ جب برہمن کہتے کہ دیوتا پر بھینٹ کیا ہوا جانور سیدھا بہشت کو جاتا ہے تو

وہ اپنے والدین کی قربانی کیوں نہیں دیتے کہ وہ سیدھے بہشت کو چلے جائیں۔"

چارواک نے کہا کہ کائنات خود سے موجود ہے۔ اِسے کسی نے نہیں بنایا۔ جیو (روح) جسم کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور جسم کی فنا کے ساتھ فنا ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عناصر اربعہ یا چار بھوت (ہوا، پانی، مٹی، آگ) جن کا ادراک حسیات سے ہوتا ہے تمام دنیا انہیں سے بنی ہے۔ دوزخ اِسی دنیا کی تکلیف ہے اور بہشت اِسی دُنیا کی راحت کا نام ہے تناسخِ ارواح یا آواگون واہمہ بے بنیاد ہے۔ وید مکار برہمنوں نے خود لکھ رکھے ہیں تاکہ عوام کو دھوکا دے کر عیش کریں۔ ویدوں میں جو کچھ لکھا ہے سب جھوٹ اور جعل ہے مہاویر اور گوتم بدھ کے زمانے تک یہ خیالات ہر کہیں پھیل گئے تھے اور درس گاہوں میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم تھا۔

وردھمن جسے مہاویر (بطلِ جلیل) اور جین (فاتح) بھی کہتے ہیں گوتم بدھ سے پہلے ہو گذرا ہے۔ وہ غالباً ۵۹۹ ق م میں مگدھ کے ایک راجہ کے گھر میں پیدا ہوا۔ اُس نے ویدوں کو غیر الہامی قرار دیا اور خدا کی ہستی سے انکار کیا۔ چارواک کی طرح اُس نے بھی کہا کہ وید مکار اور لالچی برہمنوں نے غرض پروری اور نفع اندوزی کے لئے لکھے ہیں۔ اُس کے پیرو ارہنت کو مثالی اِنسان سمجھتے ہیں اور اُس کی پوجا کرتے ہیں۔ مہاویر کو چوبیسواں ارہنت کہا جاتا ہے اُن کا عقیدہ ہے کہ نوعِ انسان کو سنسار چکر سے نجات دلانے کے لیے وقتاً فوقتاً ارہنت ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ جینیوں کے سوامیوں کو جتی کہتے ہیں جو تجرّد اور ریاضت کی زندگی گذارتے ہیں اور بھیک مانگ کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ جین خدا کے منکر ہیں لیکن کرم اور آواگون پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں دنیا کی ہر شے ذی رُوح ہے، وہ کہتے ہیں کہ اِنسانوں کی رُوحیں قالب بدل بدل کر جانوروں، پرندوں، کیڑے مکوڑے وغیرہ میں نمودار ہوتی رہتی ہیں اِس لئے کسی ذی حیات کو ایذا پہنچانا پاپ ہے۔ وہ ترکِ دُنیا اور ترکِ لذّات کی تبلیغ کرتے ہیں

اور کہتے ہیں کہ یہ دُنیا مصیبت کا گھر ہے۔ اِس سے چھٹکارا پانا ضروری ہے اس لئے بارہ برس کی ریاضت کے بعد خودکشی کو جائز سمجھتے ہیں۔ ہندو اہلِ علم کے خیال میں بت پرستی کا رواج جینیوں سے ہوا تھا جو اپنے ارہنتوں کے بُت بناکر پُوجتے تھے۔ ۷۹ء (ب۔م) میں جَین دو فرقوں میں بٹ گئے دِگمبر اور سویتمبر۔ دگمبر خود بھی ننگے رہتے ہیں اور اپنی مُورتیوں کو بھی ننگا رکھتے ہیں۔ سویتمبر (لغوی معنیٰ سفید کپڑے پہننے والا) سفید لباس پہنتے تھے۔ دِگمبروں کے خیال میں عورت کسی حالت میں بھی مُکتی حاصل نہیں کر سکتی۔

گوتم بُدھ کپل وستو کے راجہ کا بیٹا تھا۔ مہاویر کی طرح وہ بھی دنیوی آرام اور آسائش کو چھوڑ کر تلاشِ حق میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ ساکا قبیلے کا فرد تھا جو سیتھین نسل کی ایک شاخ تھی۔ اُس کا سنِ پیدائش غالباً ۵۶۳ (ق م) ہے۔ ہندو اُسے بھی جَین کی طرح ناستک یا مُلحد سمجھتے ہیں کیوں کہ اُس نے رُوح کے وجود، ویدوں، یگیہ وغیرہ سے انکار کیا اور خدا کی ہستی کے بارے میں سکوت اختیار کیا۔ گوتم نے بڑی کڑی ریاضتیں کیں۔ آخر چھ برس کے بعد گیا کے درخت کے نیچے سمادھی میں بیٹھے ہوئے اسے عرفان حاصل ہوگیا یعنی اُس پر اِس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دُنیا آلام و مصائب کا گھر ہے اور انسان آواگون یا سنسار چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ اِس چکر سے نجات پانے کے لئے نفس کُشی ضروری ہے۔ جب تک انسان کے دل میں خواہش (تنہا) باقی ہے اُسے مُکتی نصیب نہیں ہو سکتی۔ مُکتی یا نجات خدا پر ایمان لانے، ویدوں کے مطالعے یا رسُومِ عبادت کی ادائیگی سے میسّر نہیں آسکتی بلکہ خواہشات کو کچل دینے ہی سے ارزانی ہوتی ہے۔

بُدھ کی چار صداقتیں مشہور ہیں ۱۔ زندگی دُکھ ہے ۲۔ اِس دُکھ کے چند اسباب ہیں ۳۔ اِس دُکھ کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ ۴۔ اِس دُکھ سے نجات

پانے کا ایک راستہ موجود ہے۔ اصطلاح میں انہیں دکھ، دکھ سمودایا، دکھ نرودھ اور دکھ نرودھ مارگ کہتے ہیں۔ یہی گوتم بدھ کی اساسی تعلیم ہے۔ اس کے ساتھ اس نے اخلاق اور طرز عمل کے آٹھ اصول وضع کئے جو علم، عمل اور تفکر پر مبنی ہیں۔
اُس کے خیال میں پیدائش تمام شر کی جڑ ہے۔ اس کے باوجود لوگ بچے پیدا کر کے اپنے دکھ میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ بچے پیدا نہ ہوں تو سنسار چکر خود بخود ٹوٹ جائے گا لیکن انسان احمق ہے اور جنسی خواہش کے ہاتھوں میں بے بس کھلونا بنا ہوا ہے اور بچے پیدا کرتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر بدھ نے عورت سے بھی بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت اپنی کشش سے مردوں کو راہِ راست سے بھٹکا دیتی ہے۔ اس گہری یاسیت اور عورت دشمنی کی جھلک ہمیں گوتم بدھ کے ایک مداح جرمن فلسفی شوپنہائر میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ بدھ کی قدیم ترین تعلیمات پٹاکا میں (لغوی معنی ٹوکری) میں جو بودھوں کی کونسل (۲۴۱ ق م) کے لئے تیار کی گئی تھیں ملتی ہے یہ پالی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ پٹاکا تین حصوں پر مشتمل ہیں۔ سُتّا (کہانیاں) ونایا (تادیب) ابھی دمّا (نظریہ) سُتّا پٹاکا میں بدھ کے مشہور مکالمات ہیں۔
گوتم کو بدھ (دانش مند بہ سکونِ د تا بہ تشدید اس کا معنیٰ عقل کا ہے) ساکیا منی (ساکیا خاندان کا دانش مند) تتھا گتا (جو صداقت تک پہنچ جائے) بھی کہتے ہیں۔ وہ مابعدالطبیعیات اور الہیات کا مخالف تھا اور سنسار چکر سے چھٹکارا پا کر نروان حاصل کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ اُسے موت اور فنا کے تلخ احساس نے قنوطی بنا دیا تھا۔ دھماپد میں کہتا ہے "آسمان پر، سمندر کی تہ میں، پہاڑوں کی کھوہوں میں کہیں بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے۔ جہاں چھپ کر آدمی موت سے چھٹکارا پا سکے۔"
گوتم کو یاسیت پسندوں کا امامِ اعظم سمجھا جا سکتا ہے۔ شوپنہائر نے جسے اندھا ارادہ کہا ہے وہ گوتم کے ہاں کرم ہے جو انسان پر مسلّط ہے۔ گوتم شعور، انا، روح

اور بقا کا منکر ہے اور کہتا ہے کہ موت کے ساتھ سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود اُس کے خیال میں ایک جنم کا پاپ دوسرے جنم میں بھوگنا پڑتا ہے۔ اُس کے استدلال کی سب سے کمزور کڑی یہی ہے کیوں کہ انا، شعور اور رُوح کی فنا کے بعد گناہ کی پاداش کا احساس کیسے ممکن ہو سکتا ہے گوتم کہتا ہے انسان فطرۃً خُود غرض ہے اِس خُود غرضی پر قابو پانا ضروری ہے۔ اُس نے الہٰیات سے اِعتنا نہیں کیا۔ اُس کی دلچسپیاں تمام تر اخلاق تک محدود رہیں۔ اخلاق میں بھی اس کا نظریہ جین کے نقطۂ نظر کی طرح منفی اور سلبی ہے اُس کے ہاں نیک کام وہ ہے جس سے خواہشات کو کچلنے میں مدد ملے اور بُرا وہ ہے جس سے خواہشات کو تقویت ہو۔ بدھ مت میں دھیان (مراقبہ) نے عبادت اور پُوجا کی جگہ لے لی۔ بودھ ہمیشہ انفرادی نجات کی دعوت دیتے رہے، اجتماعی فلاح و بہبود کا خیال اُنہیں کبھی نہیں آیا۔ جین کے ارہنت کی طرح بودھوں کا مثالی اِنسان بودھی ستوا ہے جو نروان تک پہنچ کر دوسرے لوگوں کی ہدایت کے لیے دوبارہ اِس دُنیا میں جنم لیتا ہے بودھ ذات پات کے مخالف تھے۔ اُن کے ادب میں برہمنوں کو جا بجا کمینہ کہا گیا ہے۔ گوتم بدھ کا قول ہے کہ برہمن پیدائشی نہیں ہوتا ہر اچھے اخلاق و کردار کا مالک برہمن ہوتا ہے۔ بودھ نروان سے مکمل فنا مُراد لیتے رہے ہیں مشہور بودھ سوامی ناگ سین نے کہا ہے کہ نروان کا معنیٰ ہے ''بجھا دینا'' لہٰذا اِس سے مراد نیستی ہے۔

مرورِ زمانہ سے بودھ دو فرقوں میں بٹ گئے مہایانا اور ہنایانا۔ بدھ سے لے کر اشوک تک بودھوں کے عقاید ہنایانا فرقے سے ملتے جلتے تھے۔ کنشک کے زمانے میں بدھ مت پر برہمن مت کے اثرات غالب آ گئے اور ناگ ارجن نے مہایانا کی بُنیاد رکھی۔ مہایانا کی اِشاعت تبت اور منگولیا سے لے کر چین اور جاپان تک ہو گئی۔ ہنایانا مسلک سیلون، برما اور سیام میں پھیلا۔ مہایانا میں ہندو دیومالا

کے قصے اور توہمات شامل ہو گئے، بدھ کو وشنو دیوتا کا اوتار بنا دیا گیا۔ لفظ بت لفظ بدھ ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے اور اس کے بت بنا کر پوجنے لگے۔ امیدا بدھا (نجات دہندہ) کا تصور پیدا ہوا، اور بدھ مت مہایانا کی صورت میں ہندومت میں ضم ہو کر رہ گیا۔

مہایانا فرقے کے مکاتبِ فکر میں یوگاکار مثالیت پسند ہیں جو ذہن کو ہر شئے کا خالق سمجھتے ہیں۔ مدھیامیک کو نیستی پسند کہا جا سکتا ہے۔ ان کا نظریۂ حیات سراسر منفی ہے۔ شونیا واد مادی کائنات کو غیر حقیقی مانتے ہیں۔ ہنایانا کے مکاتبِ فکر میں دے بھاشکا اور سوترنتیکا قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی رو سے کائنات خود مکتفی ہے اور زمان و مکان حادث یا مخلوق نہیں بلکہ قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔

بدھ مت ظاہراً فرار کا مذہب ہے۔ اس کے سوامی بیابانوں اور پہاڑوں میں مسکن بنا کر رہتے تھے جنہیں دہارا کہتے تھے۔ ان سوامیوں کے تبرکات۔ ہڈیاں، دانت، بال وغیرہ۔ ڈبیہ میں بند کر کے دفن کر دیتے اور ان پر ایک عمارت بناتے تھے جسے چھتیہ (چھتری) کہتے تھے۔ افغانستان کی وادی بامیان میں بودھوں کے بے شمار غار موجود ہیں جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان میں سے بعض غار اتنی بلندی پر واقع ہیں کہ ٹوکری میں بیٹھ کر ان میں آنا جانا پڑتا تھا۔ بودھوں کی اس رہبانیت نے مانویہ کے واسطے سے عیسائی اور مسلمان صوفیہ کو بھی متاثر کیا تھا۔ مراقبہ، زاویہ نشینی، مردم بیزاری، نفس کشی، نفیٔ خودی، تسبیح گردانی کے شعائر بدھ مت ہی سے یادگار رہیں۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے گپتا خاندان کے عہد میں برہمن مت کا احیاء عمل میں آیا تھا لیکن اس احیاء میں رگ وید کی تعلیمات کا دخل بہت کم تھا۔ قدیم دیوتاؤں کی جگہ نئے نئے دیوتا نمودار ہونے لگے جن میں سے بعض دراوڑوں کی دیو مالا سے لئے گئے تھے۔ ان میں برہما۔ وشنو اور شیو کی تثلیث کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور سنگ

تراشی ہوئی ترمورتی کا علامتی مظہر ابھرنے لگا۔ وشنو اور شیو کا ذکر نہ ویدوں میں ملتا ہے اور نہ منو کے شاستر میں ہے، دھرم شاستر میں مورتی پوجا سے منع کیا گیا تھا مگر اب کھلم کھلا اس کا رواج ہو گیا۔ علمائے مغرب کے خیال میں شیو پوجا، کرشن پوجا اور لنگ پوجا دراوڑی مذہب سے یادگار ہے۔ ان دیوتاؤں میں جو مقبولیت شیو، وشنو، کرشن اور شکتی دیوی کو نصیب ہوئی وہ برہما کی پوجا کو میسر نہیں آسکی۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے مطابق برہما کنول کے پھول سے پیدا ہوا تھا۔ (برہ کا لغوی معنیٰ ہے پھیلنا) اس کے پانچ سر تھے۔ ایک سر شیو نے کاٹ لیا کیوں کہ برہما نے اس کی زوجہ پاروتی کی عصمت دری کی تھی۔ برہما راج ہنس پر سواری کرتا ہے سرسوتی اُس کی زوجہ بھی ہے اور بیٹی بھی ہے۔ برہما خالق ہے۔ اُس نے اپنے جسم کے دو حصے کئے، ایک حصے کا مرد بنا جس کا نام وزاج تھا، دوسرے حصے سے عورت بنی جس کا نام شت رُوپا رکھا گیا۔ وشنو پالنے والا ہے اور شیو فنا کرتا ہے۔ شیو پوجا کی اشاعت وکرمادتیہ کے عہد میں ہونے لگی تھی۔ شیو کو مہادیو اور مہایوگی بھی کہتے ہیں۔ اُس کے متعدد نام ہیں۔ مہاکال، لال جٹاؤں والا، بھوتیشور، وغیرہ۔ وہ بھوتوں کا آقا ہے اور مسانوں میں پھرتا رہتا ہے، سر پہ سانپوں کی جٹا، گلے میں کھوپڑیوں کی مالا، بھوتوں کی فوج جلو میں۔ بھوت اس کے آگے بدمست ہو کر تیزی سے ناچتے ہیں تو شیو بھی رقص کرنے لگتا ہے۔ ہاتھ میں ترسول (سہ شاخہ چھڑی)، پانچ منہ، تین آنکھیں، نندی بیل اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بھوتوں کا یہ آقا دراوڑوں کا ایک دیوتا تھا۔ ناچنے کی حالت میں اسے نٹ راج کہتے ہیں۔ اس کے گرد شعلوں کا چکر ہوتا ہے اور پاؤں کے نیچے ایک عفریت کے مردہ جسم کو کچلتا ہوا ناچتا ہے۔ شیو کی زوجہ کا نام پاروتی ہے جسے اُما، دُرگا، بھوانی اور دیوی بھی کہتے ہیں۔ اس کے چار ہاتھوں میں ایک میں تلوار ہے، ایک میں کٹا ہوا سر، دو ہاتھ برکت دینے کے لئے اُٹھے ہوئے، منہ کھلا ہوا، ہونٹ لہو میں تر، زبان باہر نکلی ہوئی، سانپ لپٹے ہوئے، گلے

گلے میں کھوپڑیوں کا ہار، چہرے اور سینے سے خون بہہ رہا ہے۔ مہربانی کی حالت میں اِس کا نام مادرِ دُنیا، درخشاں، شادماں، متوالی آنکھوں والی، حالتِ غضب میں دُرگا، خوفناک، لال دامنوں والی کہتے ہیں۔ اس کا رنگ گورا ہے اور حُسن و جمال کی پتلی ہے، غصے کی حالت میں اِس کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔ اِس کی مُورتی کے آگے خون کبھی خشک نہیں ہوتا۔ آج بھی کلکتہ (کالی گھاٹ) میں کالی دیوی کے بُت کے سامنے مذبوحہ بکریوں کا خون بہتا رہتا ہے جسے اولاد کی خواہشمند عورتیں عقیدت سے چاٹ لیتی ہیں۔ ابتدا میں دُرگا کو وندھیا کے وحشی قبائل پُوجتے تھے، بعد میں شیو کی زوجہ بن گئی اور شیو مت کے دوش بدوش اُس کا بھی ایک مت بن گیا جسے شکتی پوجا کہتے ہیں۔ کرشن لڑائی سے پہلے ارجن سے کہتا ہے کہ دُرگا کی پُوجا کرو۔ اسے کالی، کماری (دوشیزہ)، کپالی (کھوپڑیوں کا ہار پہننے والی)، مہا کالی (بڑی تباہ کرنے والی) کانڈی (خونخوار) بھی کہتے ہیں۔ بعض فرقے اُسے دھرتی ماتا کہتے ہیں۔ تنتر ادب اِسی کے متعلق ہے۔ اِس کے پُجاری ذات پات کی تمیز نہیں کرتے۔ سب ذاتوں کے لوگ مقررہ وقت میں کسی رات کو ایک جگہ خفیہ مجلس میں بیٹھتے ہیں، شراب کے مٹکے کے پاس ایک جوان لڑکی کو برہنگی کی حالت میں کھڑا کیا جاتا ہے اور اُس کی یونی کی پُوجا کرتے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ اِس میں شکتی یا شیو کی قوت حلول کر گئی ہے۔ پھر مرد عورتیں شراب پی کر اور گوشت کھا کر بدمست ہو جاتے ہیں اور بے محابا اختلاط کرتے ہیں۔

شیو مت کے ساتھ لنگ کی پُوجا بھی وابستہ ہے اور دراوڑوں سے یادگار ہے لنگا یت یا لنگ کے پُجاری شیو لنگ کو مقدس مانتے ہیں اور دیوتا سمجھ کر اسے پُوجتے ہیں۔ جنوب میں انہیں لنگ دھاری کہا جاتا ہے۔ نیپال سے لے کر بنارس اور مدراس تک ہر کہیں لنگ کے مرمریں مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مندروں کی وضع قطع بھی لنگ کے نمونے کی ہے۔ اِن کے درو دیوار پر جنسی اختلاط کے آسن واشگاف

صورت میں نقش کئے گئے ہیں۔ رامیشورم کے مندر کے لِنگ کو ہر روز گنگا جل سے غسل دیتے ہیں۔ اُس پانی کو جو لِنگ پر گرایا جاتا ہے خوش عقیدہ لوگ گراں قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ لِنگ پُوجا کے وقت لِنگ پر تیل گرا کر پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ شیو راتری کے تہوار پر خاص اہتمام سے لِنگ کی پُوجا کی جاتی ہے۔ سرجان مارشل کے بقول شیو پُوجا اور شکتی پُوجا کی طرح لِنگ پُوجا ہندوستان کا قدیم ترین مذہب ہے اور دراوڑی مذہب سے یادگار ہے۔ دام مارگیوں کا فرقہ بھی شیومت سے تعلق رکھتا ہے۔ شکتی پجاریوں کی طرح یہ لوگ بھی رات کو اکٹھے مل بیٹھتے ہیں۔ اِن میں برہمن، کھشتری، ویش، شودر اور چنڈال ہر ذات کے عورتیں مرد شامل ہوتے ہیں اور بھیروی چکر چلتا ہے یعنی سب مل کر شراب پیتے ہیں اور گوشت کے ٹکڑے دانتوں سے باری باری کاٹ کر کھاتے ہیں۔ پھر ماں بہن کی تمیز اٹھ جاتی ہے اور ساری رات انتہائی فسق و فجور میں گذارتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بھیروی چکر چل رہا ہو تو برہمن اور چنڈال سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ چکر کے خاتمے پر سب دوبارہ اپنے اپنے ورن میں واپس آجاتے ہیں۔ ان کا ایک فرقہ چولی مارگی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ بھیروی چکر کے موقع پر سب عورتوں کی چولیاں ایک جگہ اکٹھی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ پھر جس مرد کے ہاتھ جس عورت کی چولی آجاتی ہے وہ اس سے سنگم کرتا ہے۔ دام مارگی اور تنتر مت والے کہتے ہیں کہ سب مرد شیو کی مانند ہیں اور سب عورتیں پاروتی کی طرح ہیں اِس لئے ہر عورت سے ہر مرد کا اختلاط کرنا جائز ہے۔ شیو بھگتوں کا ایک فرقہ ویراسیوا ہے جو مساوات کا قائل ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ لِنگ سب انسانوں کو مساوات بخشتا ہے۔

وشنو دیوتا کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ شیش ناگ پر لیٹا پانی پر تیرتا رہتا ہے۔ اِس حالت میں اس کا نام نارائن ہے۔ یعنی پانی والا۔ برہما اِسی کی ناف سے اور شیو اِس کی پیشانی سے پیدا ہوا تھا۔ اِس کی زوجہ کا نام لکھشمی یا لچھمی ہے جو مال و دولت

کی دیوی ہے۔ دیوتاؤں اور اسروں نے سمندر کو بلویا تو دوسرے رتنوں کے ساتھ لچھمی بھی سمندر سے ہاتھ میں کنول کا پھول لئے ہوئے باہر نکلی تھی۔ لکھشمی رام چندر کے زمانے میں سیتا کے روپ میں ظاہر ہوئی اور کرشن کے وقت رکمنی کا قالب اختیار کیا۔ رام اور کرشن وشنو کے اوتار ہیں۔ وشنو کا آخری اوتار کلکی ہوگا جو کلجگ کا خاتمہ کرے گا۔ وشنو کے پجاری اپنے ماتھے پر عمودی تلک لگاتے ہیں جب کہ شیو بھگتوں کا تلک اُفقی ہوتا ہے۔ وشنو بھگتوں کو نام دھاری بھی کہتے ہیں۔ وشنو کا سوارگ (بہشت) بیکنٹھ ہے۔ شیو کا کیلاش اور برہما کا ستیہ لوکا ہے۔ وشنو مت برہمنوں میں زیادہ مقبول ہوا۔ جنوبی ہند میں وشنو کو پیرومل کہتے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ وشنو مت کا آغاز راجہ بھوج کے زمانے میں ہوا تھا۔ اور شٹھ کوپ نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کے بعد منی داہن، یادناچاریہ اور رامانج نے اس کی اشاعت کی۔ گجرات کاٹھیاواڑ میں اس فرقے کے پیرو کثرت سے ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوامی یا گرو کو بطوع و رغبت اپنی عورتیں پیش کرتے ہیں۔

مہابھارت کا سب سے اہم نظریہ واسو دیوا کرشن مت کا ہے جس کی ایک صورت گیتا میں دکھائی دیتی ہے۔ گیتا میں بھگتی کا درس دیا گیا ہے اور فرض برائے فرض کے اخلاقی اصول کی تشریح کی گئی ہے۔ اس نظم میں کرشن بحیثیت ایک شخصی خدا کے دکھائی دیتا ہے جس سے محبت کا اظہار نجات کا باعث ہو سکتا ہے۔ رامانج، چیتنیہ، تکا رام، کبیر وغیرہ بھگتی شاعروں نے اسی محبت کے گیت گائے ہیں۔ کرشن پوجا نے بہار اور بنگال میں ودیاپتی، چنڈی داس اور جے دیو جیسے بھگت شاعر پیدا کئے جن کے ہاں رادھا (روح) اور کرشن (برہم یا روح کل) کے ازلی پریم کا ذکر والہانہ جوش و خروش سے کیا گیا ہے۔

کسی مذہب کے احیاء کی کوشش اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مذہب، بحیثیت

ایک فعال قوت کے ختم ہو چکا ہے ۔ برہمن مت کا احیا بھی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ ویدوی اور گپتیا کا عملی مذہب اپنی ابتدائی تاثیر سے محروم ہو چکا تھا ۔ پرانوں میں تکوین و تخلیق کے عجیب و غریب قصّے بیان کئے گئے ہیں ۔ رگ وید میں ورن ، اگنی اور وایو کا شمار اکابر دیوتاؤں میں ہوتا تھا ۔ پرانوں میں ورن کو راون کا نوکر ، اگنی کو اُس کا باورچی اور وایو کو اُس کا خاکروب بنا دیا گیا ہے ۔ پرانوں میں لکھا ہے کہ وقتاً فوقتاً منو ظاہر ہوتے رہتے ہیں ۔ ہر منو کی عمر ۳۴ لاکھ ۲۰ ہزار برس کی ہوتی ہے ۔ منوسمرتی کے مولف کا نام منو سوائیم بھو بتایا گیا ہے ۔ پرانوں میں عقل کا دیوتا گنیش ہے جس کا پیٹ ہاتھی کے پیٹ جیسا ہے اور وہ چوہے پر سواری کرتا ہے بھمیا زمین کا دیوتا ہے جس کی پوجا کسان کرتے ہیں ۔ تلسی ، پیپل اور در بھا گھاس کی پوجا پر زور دیا گیا ہے ۔ اسی طرح سالگ رام اور جنپتا متی کے مقدس پتھروں کی پوجا کو ضروری قرار دیا گیا ۔ درختوں ، پہاڑوں ، دریاؤں کی پوجا کی تلقین کی گئی ۔ رگ وید میں ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر آیا ہے اب یہ تعداد ۳۳ کروڑ تک پہنچ گئی ۔ دیوتاؤں سے نہایت شرمناک قصّے منسوب کئے گئے ۔ مثلاً ایک رشی کی لڑکی نے سوریہ دیوتا کو بلانے کا منتر پڑھا ۔ دیوتا نے کہا تم نے مجھے کیوں بلایا ۔ لڑکی بولی میں نے آزمائش کے لئے یہ منتر پڑھا تھا ۔ دیوتا کہنے لگا اب تو میں آ ہی گیا ہوں ۔ اپنی یادگار چھوڑ جاؤں گا ۔ لڑکی جھجکی تو دیوتا نے کہا اے نازنین ! مت ڈر تیری دوشیزگی کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا ۔ اس اختلاط سے کرن پیدا ہوا جو مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا ۔ یہ لڑکی پانڈو بھائیوں کی ماں کنتی تھی ۔ مہابھارت اور پرانوں کے خرافیات مذہب کے اجزائے لازم بن گئے ۔ پرانوں کے عہد میں جو آج بھی حاوی ہے یہ عقیدہ رونما ہوا کہ دیوتاؤں کو پوجنا اور مذہبی رسوم کو ادا کرنا ہی اصل نیکی ہے ۔ اس طرح اخلاق کا رشتہ مذہب سے منقطع ہو گیا ۔ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لی بان لکھتا ہے ۔

"ہندوؤں میں مذہب اور اخلاق کے درمیان غارِ عظیم واقع ہے۔ ہندوؤں کی نسبت اگر کہا جائے کہ وہ تمام اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ مذہبی ہیں تو ہمارے یورپین خیالات کے مطابق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تمام اقوامِ عالم میں ہندو اخلاق کے لحاظ سے سب سے کم درجے میں ہیں۔ دیوتاؤں کو خوش رکھنا اور انہیں اپنے پر مہربان بنانا یہ وہ نتیجہ ہے جس کو ہندو اپنے ادنیٰ سے فعل میں ملحوظ رکھتا ہے اور کبھی اِس سے قطعِ نظر نہیں کرتا لیکن اُسے سخت تعجب ہوگا کہ اُس پر ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ ان دیوتاؤں کو اُس کے ذاتی افعال سے، اُس کی ایمانداری، اُس کی عفت یا راست بازی سے کچھ بھی دلچسپی ہے نہ اُسے یقین آئے گا کہ یہ زبردست دیوتا اُس سے ناراض ہو جائیں گے اگر وہ اپنے ہمسایہ کا مال لوٹ لے۔ یہ بات البتہ اُس کی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر وہ پوجا میں غفلت کرے تو وہ اُس سے ناراض ہو جائیں گے .... عبادت سے دیوتاؤں کو خوش رکھنا اور ذات کی پاکی کو قائم رکھنا یہی دو چیزیں ہیں جن کو ہندوؤں کا اخلاقی قانون کہا جا سکتا ہے اور منوشاستر کے احکام کم و بیش انہیں دونوں ضرورتوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسرے مشرقیوں میں جو اخلاقی فرائض مذہب پر مبنی ہیں ہندوؤں میں مطلق مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ منو کے دھرم شاستر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی مذہبی رسم کا توڑنا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے جس کی تلافی سخت جسمانی سزا اور بعض صورتوں میں موت ہو سکتی ہے۔ برخلاف اِس کے چوری قتل وغیرہ کی سزا نہایت خفیف ہے باستثناء زنا کے جس کا اثر خاندان اور قوم پر پڑتا ہے ... اگر کوئی گائے یا برہمن کو مارے تو اُس کا جُرم شدید ہے لیکن دوسری صورتوں میں وہ صرف گناہِ صغیرہ محسوس کرتا ہے۔ یہ ذلیل اخلاق جو ذات کے ساتھ بدلتا رہتا ہے اور جس میں گناہ کا شدید یا خفیف ہونا محض اُس شخص کے درجے پر ہے

جس کے خلاف کوئی فعل کیا گیا ہو ہر گز اُس مذہب کے اخلاق سے نہیں ملایا جا سکتا جو انسان کے رُوح پر قبضہ کئے ہوئے ہے اور اُس کی زندگانی پر حاوی ہے ...
...اصل یہ ہے کہ اخلاق اور نیک چلنی ہند میں ناپید ہے برخلاف اس کے مذہب یہاں ہر زمانے میں دوروں پر رہا ہے۔ فی الواقع ہندو نہایت درجے مذہبی ہیں لیکن اخلاق اُن کے ہاں مُطلق نہیں ہے ۔" (تمدنِ ہند ترجمہ علی بلگرامی)

ہندوؤں کے مذہب اور اخلاق کے درمیان خلیج پہلے ہی وسیع ہو چکی تھی ۔ اس پر شیومت، شکتی مت، تنتر مت کے پجاریوں نے عوام کے رہے سہے اخلاق کو تباہ کر دیا۔ نفس پرست گوسائیں اور مکار سادھو عوام کی دولت اور عزت کو بے محابا لوٹنے لگے ۔ دام مارگی، ولبھ سمپردا سوامی ، نارائن مت اور مادھو مت کے گرو سب پر بازی لے گئے اور مذہب کے پردے میں تسکینِ ہوس کا سامان کرنے لگے ۔ آج کل کے ہندوؤں کی اکثریت انہی مذہب فروشوں کی گرفت میں ہے۔

پنڈت رادھا کرشنن کے بقول ہندوؤں کے فلسفے کو ان کے مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ ہندوؤں کے ہاں مذہب اور فلسفہ دونوں کا اصل اصول آواگون، کرم یا سنسار چکّر کا مسئلہ ہے ۔ جو شخص اس پر عقیدہ رکھتا ہے وہ ہندو ہے خواہ وہ خدا کا منکر ہو یا ویدوں کو الہامی تسلیم نہ کرتا ہو ۔ اسی بنا پر آج کل جینیوں اور بودھوں کو بھی ہندو ثابت کیا جا رہا ہے ۔ ہندوؤں کے ہاں اگر کوئی ناستک یا عقلیت پسند فرقہ حقیقی معنوں میں ہے تو وہ برہسپتی کے پیروؤں یا چارواکوں کا ہے جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں کیوں کہ یہ لوگ ویدوں کے ساتھ آواگون کے بھی منکر تھے ۔

چھ درشنوں اور اپنشدوں میں گہرے فلسفیانہ مباحث بھی ملتے ہیں اگرچہ وہ خرافیات اور توہمات کے پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں ۔ ہندو فکر کا اصل اصول ادویتیم (دو نہ ہونا) کا ہے جو ویدانت کا اساسی تصوّر بھی ہے ۔ ہندو تین گُن مایا صفات کو

مانتے ہیں جو ازلی و ابدی ہیں اور جن سے دُنیا کی تمام ذی روح مخلوق اور غیر ذی رُوح اشیاء بنی ہیں۔ ا۔ ستوگن (روشنی یا صداقت کی صفت) رجوگن (جذبے کی شدت یا فعلیت) تموگن (سکون اور جمود کی صفت) انہیں ست، رج اور تم بھی کہتے ہیں۔

ویدانت کے علاوہ چھ مکاتبِ فکر (درشن) قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کا تعلق فلسفے کی بہ نسبت مذہب سے زیادہ قریبی ہے۔ یہ چھ درشن ہیں: گوتم کا نیائے، کناڈا کا ویشیشکا، کپلا کا سانکھیہ، پاتنجلی کا یوگا، جے منی کا پُروامیمانسا اور اُتر میمانسا جو آخرالذکر سے وابستہ ہے پروفیسر گاربے کے خیال میں سانکھیہ قدیم ترین درشن ہے اس کے بعد یوگا، پھر میمانسا اور ویدانت اور آخر میں ویشیشکا اور نیائے مرتب ہوئے تھے۔ سانکھیہ میں خدا کی ہستی سے انکار کیا گیا ہے۔ ویشیشکا اور یوگا والے خُدا کو کائنات کا خالق نہیں سمجھتے۔ جے منی کہتا ہے کہ خُدا کائنات کا پروردگار نہیں ہے نہ کائنات پر اُس کا کوئی اخلاقی تصرف ہے۔

سانکھیہ بُدھ مت اور بھارت سے پہلے موجود تھا کیوں کہ دونوں میں اِس کا ذکر آیا ہے۔ اِس کا معنٰی ہے 'عدد' کیوں کہ اِس میں ۲۵ حقیقتیں گِنائی گئی ہیں جن سے دُنیا مرکّب ہے اِن میں دو بنیادی ہیں پُرش (روح) اور پرکرتی (مادہ)، باقی سب انہی کی فروع ہیں پُرش اور پرکرتی ازلی و ابدی ہیں۔ کپلا مادیّت پسند نہیں ہے اگرچہ اُس کے مکتب پر مادیّت کا گمان ہوتا ہے اُس کے خیال میں حقیقت کا انحصار ادراک پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذہنِ انسانی فنا پذیر ہے لیکن رُوح امر ہے۔ وہ تناسخ کا قائل ہے اور اِس دُنیا کو دُکھوں کا گھر سمجھتا ہے۔ اِس دُکھ سے نجات پانا اُس کے یہاں نیکی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ۲۵ حقیقتوں (تتو) کو جان لینے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ "نہ میں ہوں نہ کچھ میرا ہے، نہ میرا کوئی وجود ہے" سانکھیہ کی حقیقت پسندی سے مہاویرا اور گوتم

دونوں متاثر ہوئے تھے۔ گوتم نے نروان کا تصور کپلا سے اخذ کیا تھا۔ ویدانت کی اشاعت سے سانکھیہ معدوم ہو گیا۔ یوگا سانکھیہ ہی کی عملی صورت ہے۔ پاتنجلی کی یوگا سوترا غالباً ۱۵۰ ء (ق م) میں لکھی گئی تھی۔ یوگا کے آٹھ مراحل ہیں ۱۔ یاما، خواہش کی موت۔ اِس میں اہنسا اور برہم چریہ کو قبول کر لیا جاتا ہے اور ترکِ دُنیا پر کمر باندھی جاتی ہے ۲۔ نیاما، یوگا کے اصولوں پر عمل کرنا مثلاً مطالعہ، بدن کی طہارت، دل کی صفائی ۳۔ آسن، حرکت پر قابو پا لینا ۴۔ پرانا یام، سانس پر قابو پانا ۵۔ پرتیاہارا، ذہن کا حواس پر قابو پا لینا اور محسوسات سے آزاد ہو جانا ۶۔ دھرنا، یکسوئی ۷۔ دھیان، اوم کے وِرد سے از خُود رفتگی کی کیفیت اپنے آپ پر طاری کر لینا ۸۔ سمادھی، آخری مرحلہ خُود فراموشی کا ہے جب ذہن اپنے آپ کو بھُول کر حقیقتِ کبریٰ میں غرق ہو جاتا ہے۔ یوگا کا مقصد وصل اور اتحاد نہیں ہے۔ مرورِ زمانہ سے یوگا جادو کا مترادف بن کر رہ گیا ہے۔

نیایا سوتر (نیائے یعنی استدلال) گوتم سے یادگار ہے۔ گوتم کہتا ہے کہ اُس کا مقصد نروان کا حصول ہے جو نفس کُشی سے حاصل ہوتا ہے۔ اُس کا استدلال منطقی ہے۔ نیائے میں خدا کی ہستی کا اثبات کیا گیا ہے۔ وشش کا مطلب ہے "خاص ہونا"۔ کناد کے خیال میں دنیا پرمانٹرو (ایٹم) کے اتصال سے بنی ہے۔ اشیاء کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں لیکن پرمانٹرو اپنی اصلی صورت برقرار رکھتے ہیں۔ دُنیا میں یا تو خلا ہے اور یا پرمانٹرو ہیں جن کی حرکت کسی ذی شعور ہستی سے نہیں ہے بلکہ ادرشت (غیر مرئی) قانون کے باعث ہے۔ دونوں میمانسا ویدوں پر مبنی ہیں۔ اِن چھ درشنوں میں کچھ قدریں مشترک ہیں یعنی وید الہامی کتابیں ہیں، حقیقت کا اِدراک وجدان سے ہوتا ہے نہ کہ عقل سے، عِلم کے حصول کا مقصد فطرت پر قابو پانا نہیں ہے بلکہ فطرت سے نجات پانا ہے تفکر و تعمق سے ترکِ خواہش ممکن ہو سکتی ہے، ترکِ خواہش ہی فطرت کے چنگل سے نجات دلا سکتی

ہے۔ اِس طرح جو نظریۂ حیات اِن درشنوں میں اُبھرتا ہے وہ منفی اور سلبی ہے۔ اِن درشنوں میں سانکھیہ اور ویشیشکا متروک ہو چکے ہیں۔ نیائے کے پیرو بنگال میں موجود ہیں، یوگا پر کچھ لوگ عامل ہیں۔ پُروامیمانسا ہندوؤں کے قوانین میں ضم ہو چکا ہے۔ ملک بھر میں ہر کہیں ویدانت کا نظریہ چھا گیا ہے۔ ہمارے زمانے کے بعض ہندو وِدوان جو تجدیدِ مذہب کی کوشش کرتے رہتے ہیں ان درشنوں کی الٰہیات سے اِستفادہ کر رہے ہیں۔ مثلاً آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند نے سانکھیہ کے دو اصولوں پُرش اور پرکرتی پر ایشور کا اضافہ کر لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا، رُوح اور مادہ تینوں ازلی و ابدی ہیں۔ خُدا رُوح اور مادے میں اتّصال کر کے مخلوق کو پیدا کرتا ہے لیکن اُن کا خالق نہیں ہے یعنی کوئی شئے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی۔ اِس طرح سانکھیہ پر وحدانیت کا پیوند لگا دیا گیا ہے۔

ویدانت (لغوی معنیٰ ہے وید کا آخر یا تتمّہ) سے مُراد آتما (انفرادی رُوح) اور برہمن (رُوحِ کل) کے مُتحدّ الاصل ہونے کا وہ نظریہ ہے جو اُپنشدوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ویدانت کو برہما میمانسا، آتما واد اور ادویت واد (دو نہ ہونے کا علم) بھی کہتے ہیں رِگ وید میں لفظ آتما 'سانس' کے معنی میں آیا ہے چنانچہ ہوا کو دیوتاؤں کی آتما کہا گیا ہے۔ برہمنوں میں اِس سے رُوح یا ذات مُراد لینے لگے۔ شت پتھ برہمن میں کہا گیا ہے کہ آتما کائنات میں طاری و ساری ہے۔ لفظ برہم کا مطلب وید میں دُعا یا عقیدت کا بھی ہے۔ برہمنوں میں اِس کا معنی 'تقدّس' ہو گیا جو فطرت میں حرکت کا باعث ہے۔ اُپنشدوں میں برہم یا برہمن عالمی عُنصر بن گیا جو کائنات میں سرایت کئے ہوئے ہے اور آتما نفسیاتی عُنصر ہے جو اِنسان میں ظاہر ہوا ہے۔ اواخرِ عہد کے اُپنشدوں میں دنیا کے مایا (فریبِ نظر) ہونے کا تصوّر اُبھرنے لگا اور کہا گیا کہ دُنیا کو برہمن نے مائن (مداری) کی طرح پیدا کیا۔ تناسخ کا نظریہ چھاندوگیہ اُپنشد میں واضح صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ رِگ وید میں برہمن، تناسخ یا کرم کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اِس میں

اتنا کہا گیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی رُوح پودوں اور پانیوں میں چلی جاتی ہے۔ کرم کی ابتدائی صورت شت پتھ برہمن میں دکھائی دیتی ہے۔ برہاد ارنیک اُپنشد میں البتہ کہا گیا ہے کہ کرم باقی رہتا ہے۔ بعض اہلِ تحقیق کے خیال میں آریاؤں نے آواگون یا تناسخ ارواح کا ابتدائی تصوّر دراوڑوں سے لیا تھا بعد میں اِس پر جزا سزا کا اضافہ کر لیا۔ اب اِس کی صورت یہ ہوئی کہ مرنے کے بعد نیک رُوح اچھے قالب میں جاتی ہے اور بد رُوح کو بُرا چولا ملتا ہے۔ اِس طرح تناسخ ارواح پر کرم کا اِضافہ کر کے دنیا والوں کے مصائب و آلام اور خوشیوں کی توجیہہ کی گئی ہے۔ خیال یہ ہے کہ کرم سے مفر کی کوئی بھی صورت ممکن نہیں ہے۔ اِس کے ساتھ ظاہراً جبر کا تصوّر بھی وابستہ ہے کیوں کہ کرم کو کوئی ہستی یا طاقت تبدیل نہیں کر سکتی۔ سنسار چکر سے نجات پانا ہی ویدانت کا مقصود بالذات ہے۔

اُپنشدوں کا اندازِ بیان گنجلک ہے۔ اگر ہم فلسفہ سے مراد عقلی استدلال لیں جو انسانی تجربات میں ربط و تعلق پیدا کرتا ہے تو اُپنشدوں کی تعلیمات کو فلسفہ نہیں کہا جا سکتا۔ اُپنشدوں کے نیم مذہبی نیم فلسفیانہ منتشر افکار کو بعدازاں ویدانت کی صُورت میں مرتّب و مدوّن کیا گیا۔ ویدانت سُوتر کو برہم سُوتر اور سار ویرک سُوتر بھی کہا جاتا ہے جو بادراین سے منسوب ہے۔ بعض لوگ بادراین اور ویاس کو ایک ہی شخص خیال کرتے ہیں۔ ویدانت سُوتر کے چار باب ہیں۔ پہلے باب میں برہمن کا ذکر بحیثیت ایک حقیقتِ ازلی کے کیا گیا ہے، دوسرے میں ان اعتراضات کو ردّ کیا گیا ہے جو اِس پر وارد ہوتے ہیں، تیسرے میں برہمن ودیا کے حصول کا طریقہ بتایا گیا ہے، چوتھے میں برہمن ودّیا کے برکات و ثمرات کا ذکر آیا ہے۔ بادراین کہتا ہے کہ وید ازلی و ابدی ہیں اور شاستر کے اصول مُسلّم ہیں۔ اُس کے خیال میں عقلیاتی تفکّر اور استدلال سے حقیقت کا کھوج لگانا ممکن نہیں ہے۔ علم کے ماخذ دو ہیں شرتی اور سمرتی۔ شرتی الہامی ہے۔ بادراین وید کے ساتھ اُپنشدوں کو بھی شرتی میں شمار کرتا ہے اور

گیتا، مہابھارت اور منوشاستر کو سمرتی قرار دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں جو عقل ویدکی تائید نہ کرے وہ یکسر گمراہ ہے گوداپد نے ویدانت سوتر کی شرح لکھی جس سے شنکراچاریہ نے اپنے گرو گووند کے واسطے سے اِستفادہ کیا۔

شنکراچاریہ مالابار کا نبودری برہمن تھا۔ وہ نویں صدی بعد از مسیح پیدا ہوا۔ میکس ملر اور میک ڈونل ۷۸۸ء کو اُس کی پیدائش کا سال مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ ۸۲۰ء میں فوت ہوا۔ شنکر نے قدیم نظریات کی ترجمانی نئے سرے سے کی اور اپنا نقطۂ نظر اَدویت ویدانت کی صورت میں پیش کیا۔ شنکر مفکر بھی تھا اور شعر بھی کہتا تھا، مُصلح بھی تھا اور بھگتی کا دَم بھی بھرتا تھا۔ اُس نے خواص کے لئے فلسفیانہ بحثیں کیں اور عوام کے لیے شیو، وشنو اور شکتی کی مناجات میں بھجن تصنیف کئے۔ اُس کے فلسفیانہ افکار اُپنشدوں، گیتا اور ویدانت سوتر پر مبنی ہیں اِس کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اُپنشدوں کے مُنتشر اور مُتضاد افکار کو مربوط و مُنظّم شکل و صورت عطا کی۔

ادویت ویدانت کا اصل اصول ہے تَت توَم اَسی (تو وہ ہے) یعنی آتما (غیر فانی رُوح جو انسان کے بطون میں ہے) اور برہمن (رُوحِ کُل) اصلاً ایک ہیں۔ کائنات میں جو کثرت دکھائی دیتی ہے وہ اودیا (جہالت) اور مایا (فریبِ نگاہ) کا نتیجہ ہے۔ آتما اور برہمن کے واحدالاصل ہونے کا علم کثرت کے طلسم کو چاک کر دیتا ہے اور موکش (نجات) کے حصول کا باعث ہوتا ہے۔ موکش کا مطلب ہے آتما کا برہمن میں جذب ہو کر فنا ہو جانا۔ مایا اور اودیا کا تصوّر بدھ مت سے لیا گیا ہے گوداپد بودھوں کے ایک مکتبِ فکر مدھیامیک اور بودھ سوامی ناگ ارجن سے متاثر ہوا تھا۔ شنکر نے اُپنشدوں کے برہمن کے تصور اور بودھوں کے مایا کے نظریے میں مطابقت پیدا کی۔ مایا کے ساتھ شنکر نے بودھوں کی رہبانیت کو بھی ویدانت کا عنصرِ ترکیبی بنا دیا۔

اسی طرح اُس کا موکش بودھوں کے نروان کی صدائے بازگشت ہے۔ اسی بنا پر راسخ العقیدہ ہندو شنکر کو "نقاب پوش بودھ" کہتے ہیں۔ شنکر کا نظریہ بدھ مت کی طرح ترکِ دنیا اور ترکِ خواہش کی دعوت دیتا ہے۔ وہ بدھ ہی کی طرح جبری اور قنوطی ہے۔ اُس کے خیال میں آتما اودّیا (جہالت) کے باعث سنسار چکر میں گرفتار ہو جاتی ہے اور دُکھ بھوگتی ہے۔ اس دُکھ سے نجات اُسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی اصلیّت کو پہچان کر دوبارہ برہمن میں جذب ہو جائے یا اپنے آپ کو برہمن مان لے۔ ادویت ویدانت کو فلسفے کی اصطلاح میں احدیّت کہیں گے یعنی کائنات کی تشریح ایک ہی اصول سے کی گئی ہے۔ اس میں برہمن ہی واحد حقیقتِ مطلق ہے، ازلی و ابدی ہے، غیر مخلوق ہے، کائنات کی اساس ہے، وہی عناصرِ اربعہ میں موجود ہے، وہی کائنات کا مادی سبب بھی ہے، علّتِ حرکی بھی وہی ہے، برہمن خود کائنات ہے، ہر شے میں نفوذ کئے ہوئے ہے جیسے سونا سونے کے زیور میں ہوتا ہے۔ اُس کی ذات میں سبب و مسبّب، معروض و موضوع جمع ہو گئے ہیں، مادی دُنیا برہمن کی لیلا (تماشا) ہے۔ اَدوَیتم (دو نہ ہونا) ویدانت کا کلیدی لفظ ہے۔

شنکر اچاریہ نے بدھوں سے بحث و مناظرے کا بازار گرم کیا۔ نویں صدی عیسوی میں بدھ مت ویسے بھی زوال پذیر ہو چکا تھا۔ سنگھ کی تنظیم و تادیب ختم ہو چکی تھی۔ بودھ بھکشوؤں اور مکار سنیاسیوں کا فرق مِٹ چکا تھا۔ ہندو مت کے اوہام و خرافات بدھ مت میں نفوذ کر چکے تھے۔ شنکر اچاریہ کی پُرجوش تبلیغ نے تابوت میں آخری کیل جڑ دی۔ شنکر عین جوانی کے عالم میں فوت ہو گیا۔ اُس کے چار مٹھ سرنگری (میسور) بدری ناتھ (ہمالیہ) پوری (مشرقی ساحل) اور دوارکا میں قائم کئے گئے جہاں اُس کے افکار کی تدریس جاری رہی اور ویدانت مُلک کے کونے کونے میں شائع ہو گیا۔

ویدانت کا دوسرا مشہور شارح رامانج ہے۔ اُس نے کہا کہ آتما اور برہمن کی اصل ایک نہیں ہے، خدا تک رسائی علم سے نہیں بلکہ بھگتی (عشقِ حقیقی) سے ہوتی ہے۔ بعض

ارباب علم کے خیال میں رامانج نے ویدانت سُوتر کی جو ترجمانی کی ہے وہ شنکر اچاریہ کی تشریح کی بہ نسبت زیادہ قریبِ صحت ہے۔ رامانج شخصی خدا کا قائل تھا۔ اور شنکر اچاریہ کے نظریے کے برعکس موضوع اور معروض میں تفریق کرتا تھا۔ رامانج کہتا ہے کہ موضوع (خدا) اور معروض (کائنات) ایک دوسرے الگ ہیں۔ خدا نے کائنات کی تخلیق کی، ارواح کو پیدا کیا اور انہیں الگ الگ کرم دیا۔ اُس کے خیال میں نجات کا مطلب جذب و فنا نہیں ہے۔ انسانی رُوح خدا کی ہستی میں فنا نہیں ہو جاتی البتہ سنسار چکر سے نجات ضرور پا لیتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ انسان پر خدا کی عبادت کرنا واجب ہے کیوں کہ انسان اور خدا میں عبد اور معبود کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کے تصوّف کے حوالے سے اِس مسئلے کا بیان یوں ہوگا کہ جو فرق شنکر اور رامانج کے نظریات میں ہے وہی ابن العربی کی وحدت الوجود یا ہمہ اوست اور شیخ احمد سرہندی کی وحدت شہود یا ہمہ از وست میں پایا جاتا ہے۔

ہمارے زمانے میں سوامی وویکانند، سدانند یوگندر، رام تیرتھ اور آروِندو گھوش نے ویدانت پر جدید فلسفے اور سائنس کا رنگ چڑھانے کی کوششیں کی ہیں۔

آریائی قبائل ہندوستان میں وارد ہوئے تو وہ قدیم آریائی زبان بولتے تھے جسے ویدک بولی نمبر ایک کہا جاتا ہے۔ یہ بولی ترقی کرتے کرتے سنسکرت (لغوی معنیٰ، شستہ، پاک) کہلائی۔ پروفیسر بوہلر کے خیال میں قدیم ہند کے دو رسم الخط تھے، ایک خروشتی جو پانچویں صدی قبل از مسیح میں گندھارا یعنی مشرقی افغانستان اور شمالی پنجاب میں مستعمل تھا اور سامی الاصل آرامی سے ماخوذ تھا جو دوسری سامی زبانوں کی طرح دائیں سے بائیں لکھی جاتی تھی، دوسرا براہمی لپی جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ دراوڑی رسم الخط سے ماخوذ تھا جو بائیں سے دائیں کو لکھا جاتا تھا۔ چوتھی صدی عیسوی (ق م) کے ایک سکّے سے ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ بھی دائیں سے بائیں لکھا جاتا تھا۔ بوہلر کہتا ہے کہ یہ رسم تحریر ۸۰۰ (ق م) کے لگ بھگ فنیقی تاجر عراق کے راستے سے لائے تھے۔

یہ سامی حروف تعداد میں بائیس تھے۔ براہمی لپی کے چھیالیس حروف بعد میں بنے تھے۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ سنسکرت میں صوتی تغیرات ہوئے اور اس نے اوّلین پراکرت یعنی پالی کا روپ اختیار کیا۔ آج کل کی تحقیق کے متعلق پالی اور پراکرتیں قدیم دراوڑی بولیوں سے یادگار تھیں۔ اشوک کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں اس کا رواج عام تھا۔ پالی کے لغوی معنی ہیں "کتاب کی اصل عبارت" اس میں بودھوں کی ابتدائی کتابیں لکھی گئیں۔ اس دوران میں عوام دراوڑی زبانیں بولتے رہے چنانچہ بعد کی زبانیں لب و لہجہ اور لغت کے لحاظ سے دراوڑی اثر کی بہت کچھ رہین منت ہیں۔ جنوب ہند میں آج بھی تلگو، تامل، ملیالم اور کنڑی دراوڑی زبانیں موجود ہیں۔ سر ولیم جونز نے پہلے پہل اہل علم کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ سنسکرت یورپی زبانوں یونانی، لاطینی اور ایران کی اوستائی زبان کی بہن ہے۔ ہندوستان قدیم میں تاڑ کے پتوں پر لکھتے تھے۔ ان پتوں میں سوراخ کر کے ڈوری میں پرو لیتے تھے بعد میں بھوج پتر پر لکھنے لگے۔ اڑیسہ اور بنگال میں تاڑ کے پتوں پر قلم سے کھود کھود کر لکھتے تھے۔ لبعض اوقات لکڑی کی تختیوں کو سیاہ رنگ لیتے اور ان پر کھڑیا سے لکھتے تھے۔ بھوج پتر کو لکڑی کی تختیوں سے مجلّد کر کے کتاب بنا لیتے اور اسے پوتھی کہتے تھے۔ بھوج پتر کو دھاگے سے سی کر گرہ بھی لگا دیتے تھے۔ سنسکرت کے لفظ گرنتھ کا معنی گرہ ہی ہے، بعد میں پوتھی کتاب کو بھی کہنے لگے۔ تحریر کا سامان بودا ہونے کے باعث قدیم تحریریں بہت کچھ ضائع ہو گئیں چنانچہ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے کے مسوّدات کم یاب ہیں۔ کاغذ مسلمان ہندوستان لائے تھے۔

ہندوؤں نے جن علوم کو ترقی دی اُن میں طب، جوتش (علم نجوم) ہیئت اور ریاضی ہیں۔ جوتش اور ہیئت میں وہ بابلی روایات سے متاثر ہوئے اور انہی کی پیروی میں برجوں کی تقسیم کر کے تقویم مرتّب کی گئی۔ برہم گپت نے سال کے ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۶ سیکنڈ قرار دیے تھے۔ جدید تحقیق سے ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ اور ۹ ۳۲/۱۰۰ سیکنڈ ہیں۔

لفظ اوج جو ہیئت کی اصطلاح میں سب سے اونچے نقطہ بلندی کا نام ہے لفظ اُوچ کی صورت ہے۔ آریا بھٹ بڑا ماہر ریاضیات اور عالم ہیئت تھا۔ اُس کے پیرو زمین کو گول مانتے تھے اور اس کی گردش کے قائل تھے۔ اُس نے دن رات کی تبدیلی کو کرۂ ارض کی گردشِ محوری کا نتیجہ قرار دیا۔ البیرونی نے آریہ بھٹ کا یہ معقولہ پسندیدگی سے نقل کیا ہے " جو کچھ سورج کی روشنی سے منور ہے ہمارے لئے اس کی حقیقت کا جان لینا کافی ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے وہ چاہے بیرون از قیاس حد تک وسیع کیوں نہ ہو ہمارے واسطے لاحاصل محض ہے اس لئے کہ جہاں شعاعِ آفتاب نہیں پہنچتی وہ ہمارے حواس کی رسائی سے ماورا ہے اور جہاں حواس کو یارائی نہیں اس کی بابت ہم کچھ نہیں جان سکتے۔" یاد رہے کہ البیرونی کا اپنا فلسفہ بھی یہ تھا کہ صرف حسّی مدرکات سے جن میں عقلِ ناطق نظم و ترتیب پیدا کرتی ہے علم کا حصول ممکن ہے۔

آریہ بھٹ اور برہم گپت کسور اعشاریہ جانتے تھے۔ یہ اُن سے عربوں نے مستعار لئے۔ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے انھیں بغداد میں رواج دیا۔ ہندی ارقام اور کسور اعشاریہ اشوک کے حجری کتبوں میں موجود ہیں۔ اہلِ عرب کا اپنا بیان ہے کہ انہوں نے نوشک حسابی رقم لکھنے کا طریقہ اہلِ ہند سے سیکھا تھا۔ سب سے پہلے یونانیوں نے ہیئت کو علم نجوم سے جدا کیا تھا۔ ہندوؤں کی سدھانت یونانی ہیئت کے اصولوں ہی پر مبنی تھی۔ ورامہر نے یونانیوں سے خوشہ چینی کا اعتراف کیا ہے اس میں گردشِ زمین کے علاوہ کششِ ثقل کا نظریہ بھی اپنی ابتدائی صورت میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ زمین کششِ ثقل کے باعث اشیاء کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ خلیفہ المنصور کے عہد میں ایک پنڈت سدھانت کا نسخہ لے کر بغداد پہنچا اور ابراہیم فزاری کی مدد سے اس کا ترجمہ عربی میں کیا۔ ہندوؤں کے جوتش میں چاند، تیر، مشتری اور زہرہ سعد ہیں۔ سورج، مریخ اور زحل منحوس ہیں۔ دنوں میں اتوار، منگل اور سنیچر کو نحس سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں ایورویدک کو بڑی ترقی ہوئی۔ سشرت اور چرک بڑے پائے کے طبیب

تھے۔ سشرت بنا بس میں پڑھانا تھا۔ اُس نے اپنے استاد دھنونتری کے دستورِ علاج کو مرتب کیا۔ چرک کی سمہیتا (قرابادین) آج بھی مستعمل ہے۔ واگ بھٹ (ساتویں صدی ب م) اور بھاو مشر (سولھویں صدی ب م) نے ہاروے سے پہلے گردشِ خون کا ذکر کیا۔ وہ چیچک کا علاج ٹیکے سے کرنا جانتے تھے اور آتشک کا علاج پارے سے کرتے تھے۔ ہندوستان سے بیسیوں اطباء بغداد پہنچے جہاں انہوں نے بعض معرکے کے علاج کئے۔ عربی کتابوں میں اُن کے نام قدرے بدلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً بہلہ، منکا، فلبرفل، سندباد، وغیرہ۔ منکہ دارالترجمہ میں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کا کام کرتا تھا۔ سشرت اور چرک کی کتابیں عربی میں منتقل کی گئیں۔ عربوں نے فراخدلی سے ہندوؤں کی علمیت اور ذہانت کا اعتراف کیا ہے جاحظ لکھتا ہے۔

"لیکن ہندوستان کے باشندے، تو ہم نے اُن کو پالیا ہے کہ وہ جوتش اور حساب میں بڑھے ہوئے ہیں اور اُن کا ایک خاص ہندی خط ہے اور طب میں بھی وہ آگے ہیں اور طب کے بعض عجیب بھید اُن کو معلوم ہیں اور سخت بیماریوں کی دوائیں خاص طور پر اُن کے پاس ہیں، پھر مجسمے بنانا، رنگوں سے تصویر کھینچنا اور تعمیر میں اُن کو کمال حاصل ہے، پھر شطرنج کے وہ موجد ہیں جو ذہانت اور سوچ کا بہترین کھیل ہے"

آیور ویدک کی بہت سی اصطلاحات اور مفردات کے نام عربی زبان میں رواج پا گئے مثلاً اطریفل (تری پھل یعنی ہلیلہ، بلیلہ، آملہ) ہندی طب میں علم کیمیا سے ملتا جلتا ایک علم تھا جسے وہ رسائن (رس کا معنی ہے سونا) کہتے تھے، اور اس سے اعادۂ شباب کرتے تھے۔ کشتہ سازی اور جڑی بوٹیوں کی تحقیق میں انہیں کمال حاصل تھا۔ تانبہ، پارہ، شنگرف، سونا وغیرہ دھاتوں کو جڑی بوٹیوں کے رس میں اس طرح کشتہ کرنا کہ اُن کی راکھ میں تاثیر پیدا ہو جائے اُن کا نمایاں کارنامہ ہے۔ شطرنج ہندوؤں کی عظیم ایجاد ہے۔ روایت ہے کہ ششہ برہمن نے پانچویں صدی (ب م) میں اسے ایک راجہ کے لئے ایجاد کیا تھا۔ اس کا

اصل نام چترنگ یا چتر نگم (چار انگ یعنی ہندی فوج کے چار حصے: پیدل، سوار، ہاتھی رتھ)۔ شطرنج اور چوسر میں ہندوؤں نے جبر اور قدر کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ شطرنج قدر واختیار کا کھیل ہے یعنی انسان جتنی قابلیت رکھے گا اور جتنی کوشش کرے گا اُسی کے مطابق اُسے ثمرہ ملے گا۔ چوسر سراسر جبر پر مبنی ہے یعنی انسان مجبور محض ہے کیا پتہ پو بارہ پڑیں یا چار کانے آجائیں۔

ہندوؤں میں مجسمہ سازی اُن کے فنِ تعمیر سے وابستہ رہی ہے۔ موریا خاندان کے عہد میں ایرانیوں اور یونانیوں کی پیروی میں پتھر کے استعمال کا آغاز ہوا۔ اِس سے پہلے مکان اور مندر مٹی اور لکڑی کے بنانے تھے جس کے باعث وہ دستبردِ زمانہ کے شکار ہو گئے۔ سنگ تراشی کو اشوک کے زمانے میں ترقی ہوئی۔ اشوک کے عہد کا فن اُن لاٹوں یا صیقل شدہ پتھر کے ستونوں میں دکھائی دیتا ہے جن کے سروں پر مجسّمے بنائے گئے ہیں۔ سب سے خوبصورت ستون سارناتھ میں نصب ہے جہاں گوتم بدھ نے پہلا وعظ کہا تھا۔ اِس دور کی فنی روایات کو شنگا اور آندھرا راجاؤں نے نہ صرف بحال رکھا بلکہ انہیں ترقی بھی دی۔ اِس زمانے میں بھڑھوت، سانچی اور امراوتی میں بودھ آرٹ بامِ کمال تک پہنچ گیا اور فنِ تعمیر کے جو اسالیب صورت پذیر ہوئے اُن میں ستوپا، وہارا اور چھیتیہ قابلِ ذکر ہیں۔ ستوپا کو چٹان سے تراش کر یا تراشیدہ پتھروں کو چن کر نصف کروی گنبد کی صورت میں بنایا جاتا تھا۔ سنسکرت میں اِسے انڈا کہتے تھے۔ یہ گنبد ایک چبوترے پر بناتے تھے اور اس کی چوٹی پر کوشک یا کھلا خیمہ بناتے تھے۔ ستوپا کے گرداگرد کٹہرا بنایا جاتا تھا اور دروازوں پر سنگ تراشی سے نقوش اور برجستہ مجسّمے بناتے تھے۔ ستوپا بزرگوں کے تبرکات دفن کرنے کے لئے تعمیر کئے جاتے تھے۔ وہارا بودھ سوامیوں کی خانقاہ یا جائے رہائش تھی۔ زمین دوز وہارا کو چھیتیہ کہا جاتا تھا۔ بھڑہوت کے ستوپا میں جاتک کہانیوں کے مناظر نقش کئے جاتے تھے۔ پرندوں اور جانوروں کے

نقوش نہایت خوبصورت تراشے گئے ہیں اور فطرت نگاری کے شگفتہ نمونے ہیں ۔ بھرہوت کے انسانی مجسمے چنداں خوش وضع نہیں ہیں البتہ بعض چھوٹے مجسموں میں بشرے کی نفسیاتی خصوصیات اُجاگر ہوگئی ہیں ۔ سُنگا عہد کا یادگار سانچی ستوپا ہے جس کے دروازوں پر پروں والے شیر ببر، شیر کا جسم، عقاب کا سر اور بازو رکھنے والے خیالی جانور تراشے گئے ہیں یہاں کے ستون ایرانی وضع کے ہیں ۔ سرِ ستون گھنٹی کی شکل کے ہیں جو بیل والے نمونوں سمیت اصطخر سے ماخوذ ہیں ۔ جنوبی دروازے کے شیر ببر ہخا منشی فنِ تعمیر سے مُستعار ہیں ۔ اِن غیر مُلکی اثرات کے باوجود مُلکی فن پورے عروج پر دکھائی دیتا ہے گُل کاری نہایت عمدہ ہے ۔ راج ہنس، مور، ہاتھی کنول وغیرہ کے نقوش دلآویز ہیں ۔ سانچی کے در و دیوار پر جاتک کہانیوں کو جس طریقے سے مُنقّش کیا گیا ہے وہ خالص مُلکی اسلوبِ فن کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اِن میں سانپ ہرن، ہاتھی، شیر وغیرہ کے نقوش بڑے جاذبِ نظر ہیں ۔ سانچی کی یکشنیاں خاص طور سے بڑی حسین ہیں اُن کے جسم کے زاویوں کی نفس پرور رعنائی اور خطوط اور دائروں کی شگفتگی اور گداختگی کا ہندی سنگ تراشی میں کوئی جواب نہیں ہے ۔

گپتا خاندان کے برسرِ اقتدار آنے سے ہندو مذہب اور روایاتِ فن کا احیاء عمل میں آیا ۔ اِس زمانے میں ہندوستان کے فنِ تعمیر اور سنگ تراشی میں تِنسر مورتی (برہما شِبو، وشنو کا بُت جس کے دھڑ پر تین سر دکھائی دیتے ہیں) نٹ راج (ناچتا ہوا شیو، تانڈو ناچ کی علامت) شیکھر (مینارہ نما مندر) اور گوپورم (مندروں کے مُنقّش دروازے) کے اسالیبِ فن کا اضافہ ہوا ۔ شیکھر شمالی ہند میں اور گوپورم جنوبی ہند میں مقبول ہُوا ۔

مُجسمہ تراشی میں دو مکاتبِ فن مشہور ہوئے گندھارا اور گپتا ۔ کنشک نے مہایانا فرقہ اختیار کیا تو گندھارا میں بدھ کے مُجسمے تراشنے کا رواج ہوا ۔ اِن بُتوں کے چہرے کے نقوش میں یونانی باختری روایات کی جھلک موجود ہے اور بدھ کی شبیہ پر دیوتا اپالو یا دیونا زوس کے مُجسموں کا شبہ ہوتا ہے ۔ چہرے مُہرے کی تراش خراش یونانی ہے

البتہ شبیہ نگاری بہت کمزور ہے۔ گندھارا فن کو ہلینی آرٹ کی ایک شاخ سمجھا جاسکتا ہے۔ لاہور کے عجائب گھر میں گندھارا آرٹ کے خوبصورت نمونے موجود ہیں۔

گپتا فنِ سنگ تراشی میں متھرا، کارلی اور سانچی کی روایات کا امتزاج ہوا اور اِس طرح ہندوستان کے کلاسیکی آرٹ نے جنم لیا۔ امراؤتی میں فنی اِرتقاء کے تسلسل کا احساس ہوتا ہے۔ امراؤتی میں برہنہ نسوانی مجسّمے نہایت دلکش ہیں۔ ان میں سانچی کی یکشنیوں کا واضح اثر دکھائی دیتا ہے۔ سینے اور سرین کا اُبھار وہی ہے جو یکشنیوں کے مجسموں میں توجّہ کو جذب کرلیتا ہے۔ اعضاء کی نگارش میں فطری لچک اور تناسب کا احساس ہوتا ہے۔ ان مجسّموں میں ہندوؤں کا جمالیاتی نصب العین پوری طرح منعکس ہوا ہے۔ گپتا فن کے بُدھ کے مجسّمے خاص طور پر خوش وضع ہیں۔ مراقبے میں بیٹھے ہوئے بُدھ کے چہرے پر شانتی کی لطیف کیفیت کو اُستادانہ چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے۔

قدیم زمانے کے ہندو مصوروں کی تصویریں سنگویا کے ایک غار میں دریافت کی گئی ہیں۔ اُن کی چترودیا کے صرف دیواری نقوش ہی ہم تک پہنچے ہیں۔ اجنتا کے غاروں میں بودھ مصوری کے شاہکار محفوظ ہیں جن کی تصویر کشی گپتا عہد کے اوائل میں کی گئی تھی۔ دسویں غار کی تصویریں اِسی زمانے میں یادگار ہیں۔ اجنتا کی تصویر کشی کا سلسلہ چالوکیہ عہد تک جاری رہا۔ اجنتا کے مصوّر بودھ سوامی تھے۔ اُن کا طریقہ نقش گری یہ تھا کہ پہلے دیوار پر دوبار لیپ کیا جاتا تھا۔ نچلا پرت مٹی اور گائے کے گوبر کے آمیزے سے بناتے تھے جس سے دیوار کی سطح ہموار ہوجاتی تھی۔ اس پر ایک سفید پرت پوت کو اُس پر تصاویر کھینچی جاتی تھیں۔ تصویر بنانے کے ایک رات پہلے لیپ کی سطح کو پانی سے تر کر لیتے تھے دوسرے دن اِس کی نم دار سطح پر معدنی اور نباتی رنگوں سے نقش گری کرتے تھے۔ اجنتا کی تصویریں حظ کشی کے دلآویز نمونے ہیں جوان عورت کا نازک اور گداز جسم، بادامی قطع کی لمبی متوالی آنکھیں، ہاتھوں کی بلیغ حرکات اور مخروطی شمعی انگلیوں کے ذومعنی

اشارے، گھنیری زلفوں میں گوندھے ہوئے کومل پھول دیکھنے والوں کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ نیم برہنہ نسوانی نقوش نہایت حسین اور نفیس پیرورہیں۔ ان میں ہندو عورت کی سُندرتا اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جانوروں میں ہاتھی، شیر، بیل، گھوڑے، ہرن اور بندر کی تصویریں بڑی دلکش ہیں۔

یونانیوں کی طرح ہندیوں نے بھی موسیقی یا ناد ودیا کو ریاضیاتی اصولوں پر مرتّب کیا۔ سنگیت کے اصول سام وید میں مختصراً بیان ہوئے ہیں۔ مندروں میں صبح و شام دیوتاؤں کی مناجات میں بھجن گانے[1] کا رواج تھا۔ زمانہ گذرنے کے ساتھ گانے بجانے کے قواعد وضع کئے گئے۔ ہند میں فلسفہ، تعمیر، مجسّمہ تراشی اور مصوّری کی طرح سنگیت نے بھی مذہب ہی کے دامن میں پرورش پائی تھی۔ سنگیت میں ناچ اور نرت بھی مشمول تھے۔ دیوداسیاں دن میں دو مرتبہ دیوتاؤں کو رجھانے کے لیے ناچتی گاتی تھیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت پنڈت کیا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے ہاں موسیقی کے دو شعبے تھے۔ سُور (لغوی معنی ایشور) اور بے۔ لے یا تال[2] کو گورو سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جو آدمی گورو کے سامنے زانوئے عقیدت طے نہ کرے وہ سُور یا ایشور تک نہیں پہنچ سکتا۔ گانے والوں کے کئی طبقے تھے۔ سنگیت کے عالم کو پنڈت کہتے تھے۔ اِس کے بعد گُنی کا درجہ تھا۔ اُس سے جو بڑھ جائے وہ گندھرو کہلاتا تھا۔ اس کے اوپر گائن کا اور سب سے اعلیٰ مقام نائک کا تھا جو بذاتِ خود راگ ایجاد کرنے پر قادر تھا۔

انسان کی آواز کو سات سُوروں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تقسیم سات سیاروں کی تعداد کی رعایت سے کی گئی تھی۔ شڑج (کھرج) رِشب (رِکھب)، گندھار، مدھیم، پنچم اور نشاد

---

[1] لفظ 'گانا' کا لغوی معنیٰ ہے "گیتوں کی کتاب" گیتا کا معنی ہے نغمہ۔

[2] تالی سے نکلا ہے

(نکھاد) ۔ ان میں کھرج اور پنچم اچل سُور ہیں ۔ دوسرے سُور اتی کومل، کومل، مدھ تیور،
تیور اور تر تیور کہلاتے ہیں۔ شترج کا معنیٰ ہے "جو چھٹے سے پیدا ہوا" مدھیم (درمیانہ)
پنچم (پانچواں) ہے ۔ دھیوت، رشب اور گندھار کے معنوں میں اختلاف ہے ۔ سات
سُور بائیس شروتیوں میں منقسم تھے ۔ قدماء کے خیال میں تمام شُدھ اور وکرت سُور اپنی
اپنی شروتیاں رکھتے تھے موافق اور ناموافق ہونے کے اعتبار سے سُوروں کو وادی، سموادی
انووادی اور ودادی کہتے تھے ۔ وادی سموادی سُوروں سے راگ کا روپ سروپ نکھرتا ہے
جب کہ ودادی ناموافق ہیں ۔ سُوروں کی تعداد کے لحاظ سے راگ راگنیاں تین حصوں میں تقسیم
کی گئیں۔ سمپورن (سات سُوروں والا) کھاڈو (چھ سُوروں والا) اور آڈو (پانچ سُوروں والا)
مثلاً بھیروں سمپورن ہے اور مالکوس آڈو ہے ۔ سات سُوروں کی قدرتی ترتیب کو مورچھن
کہتے تھے[1] ہر گرام کے سات مورچھن قرار دیتے تھے۔ مورچھن کے بعد جاتی اور جاتی کے بعد گرام
راگ کا رواج ہوا ۔ موجودہ راگ گرام راگ ہیں ۔ دو گرام مشہور ہیں کھرج گرام اور مدھ گرام،
گندھار گرام متروک ہو چکا ہے۔ سپتک یا استھان تین ہیں مندر سپتک (سب سے
دھیمی آواز کا سپتک) مدھ سپتک (درمیانی آواز والا) اور تار سپتک (سب سے
اونچے سُوروں والا)۔ مرورِ زمانہ سے راگ دو گروہوں میں بٹ گئے مارگ اور دیشی یعنی
کلاسیکی اور جدید ۔ سنگیت ودیا میں دو کتابیں مستند سمجھی جاتی ہیں سارنگ دیو
کی سنگیت رتناکر اور بھرت کی نٹ شاستر۔ شمال مغرب میں ہندوستانی موسیقی کا
رواج تھا ۔ کرناٹکی سنگیت جنوب مغرب میں مروّج تھا ۔ راگ راگنیوں کو موسموں اور اوقات
سے مخصوص کر دیا گیا تھا ۔ چھ موسموں کے لحاظ سے چھ بڑے بڑے راگ تھے: بھیروں، ہری
بلاول، مالکوس، دیپک اور میگھ ۔ راگنیوں کا کوئی شمار نہیں تھا ۔ شروع شروع

---

[1] کلمنٹ ۔ ہندی موسیقی

میں دھورو، چھند، پد اور دوہا گاتے تھے۔ بعد میں دھورد اور پد کو ملا کر دھرو پد گانے کا رواج ہوا۔ مسلمانوں نے خیال کی گائیکی کا اضافہ کیا۔ قدیم ہند کے سازوں میں بنسری، وین اور مردنگ مقبول تھے۔ پکھاوج مردنگ ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے مسلمانوں نے اس کے دو حصے کر کے ان کا نام دایاں بایاں رکھا اور طبلہ معرضِ وجود میں آیا۔ راجپوت مصوری میں راگ راگنیوں کو تصاویر میں پیش کرنے لگے۔ موسیقی کے ساتھ ناچ اور نرت کو بھی ترقی ہوئی اور وہ مستقل فن بن گئے۔ بھرت نیٹم کی صورت میں تٹ وِدیا کی روایت باقی ہے۔

قدیم زمانے کے ہندو شاعری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انہوں نے مذہب، فلسفہ فقہ اور دیومالا سے لے کر الجبرا، ہیئت، صرف و نحو، جوتش اور طب جیسے خشک موضوعات بھی شاعری ہی کے روپ میں پیش کئے ہیں۔ نثر لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ ہندی شاعری کی تین اصناف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: رزمیہ، فلسفیانہ شاعری اور بھگتی شاعری۔ رامائن اور مہابھارت رزمیہ کے شاہکار ہیں۔ اِن طویل نظموں میں قدیم معاشرے کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ مہابھارت ہی میں گیتا کی مشہور نظم ہے جس نے بھگت شاعروں کو تحریک و تشویق کا سامان بہم پہنچایا۔ بھگت شاعروں نے رام چندر اور کرشن کو محبوبِ ازلی تصور کر کے اُن سے والہانہ عشق کا اظہار کیا ہے۔ جے دیو کی گیتا گووندا پر مجاز کا رنگ غالب ہے۔ اِس میں کرشن اور رادھا کا معاشقہ ہوس پرور صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ انقلابِ زمانہ کا کرشمہ تھا کہ گیتا کا مفکر گیتا گووندا میں ہوا و ہوس کا پتلا بن گیا ہے۔ دورِ وسطیٰ کے ہندو شاعروں میں فطرت نگاری کے شگفتہ نمونے ملتے ہیں۔ برکھا رُت کے مناظر، پہاڑوں، وادیوں اور بنوں کی تصویر کشی، کوئل کی آرزو پرور کوکو، پپیہے کی حسرت آمیز پی، پی اور مور کی جھنکار نے خالص ملکی فضا پیدا کر دی ہے۔ ابراہام روجیر نے سنسکرت کے مشہور شاعر بھرتری ہری کا ترجمہ ۱۶۵۱ء میں ولندیزی زبان میں کیا تو اہلِ مغرب ہندوؤں کی شاعری کی لطافتوں

سے آشنا ہوئے۔ ہندی شاعری کی یہ روایت کہ زوجہ اپنے پردیسی شوہر کو مخاطب کر کے شوقِ ملاقات اور آشوبِ فراق کا اظہار کرتی ہے دراوڑوں کے مادری نظامِ معاشرہ سے یادگار ہے۔ ہندو عورت کا اپنے شوہر سے اظہارِ محبت کرنا ہندوؤں کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جس کی پاکیزگی، خلوص اور خود سپردگی کی مثالیں بہت کم اقوام کی شاعری میں دکھائی دیں گی۔ دوسری اقوام میں شادی پر رُومانی محبت کا خاتمہ ہو جاتا ہے ہندوستان میں شادی کے بعد رُومانی محبت کا آغاز ہوتا تھا۔

قدیم زمانے کے ہندوؤں کے ہاں شاعری کی دو قسمیں تھیں ایک درشے (جو دیکھا جا سکے) دوسرے سرشے (جو سُنی جا سکے) ناٹک پہلی قسم میں داخل ہے۔ ناٹک یا رُوپک کی تین قسمیں ہیں ناٹئے، نرتئے، ونرت۔ یہ تماشے دیوتاؤں کے سامنے اپسرائیں اور گندھرو دکھایا کرتے تھے۔ ان میں صرف ناٹئے ہی پر ڈرامہ کی تعریف صادق آسکتی ہے نرتئے نام ہے بھاؤ بتانے کا، نرت کا اطلاق صرف ناچنے پر ہوتا ہے رُوپک کی دس قسمیں ہیں جن میں ناٹک سب سے پہلی قسم ہے اور ڈرامے کا کامل نمونہ ہے۔ اس میں دیو بانی یا تاریخ کا کوئی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم پرکرن میں قصہ فرضی ہوتا ہے اور مضامین بھی اعلیٰ نہیں ہوتے۔ بھن، صرف ایک ایکٹ کا ہوتا ہے۔ عزیز مرزا بجا فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کا ڈرامہ یونان سے متاثر ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈرامے کی نشو و نما پہلے پہل اُجین اور مالوہ کے درباروں میں ہوئی جن کے تعلقات شاہانِ باختر کے ساتھ بڑے دوستانہ تھے۔ سنسکرت میں پردے کو "یوَن" کہتے ہیں یعنی منسوب بہ یونان۔ یوَن سنسکرت میں یونانیوں کو کہا جاتا تھا۔ ہندوؤں کے دل و دماغ پر مذہب اس طرح چھایا ہوا تھا کہ ان کے فنونِ لطیفہ پر بھی اس کی گہری چھاپ ہے۔ برخلاف اس کے ڈرامے کے بہت سے پہلوؤں کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کا مبدء غیر ملکی ہے۔ اور

؎ مقدمہ وکرم اُروسی : عزیز مرزا

وہ ملک یونان ہی ہو سکتا ہے۔

زبان کے اعتبار سے ہندوؤں کے ناٹک میں ایک بات ایسی ہے جو کسی قوم کے ڈرامے میں دکھائی نہیں دے گی اور وہ یہ ہے کہ اشخاصِ ڈرامہ میں ہر شخص اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق ایک خاص زبان میں بات کرتا ہے۔ عوام پراکرت بولتے ہیں سنسکرت شرفاء کے لئے مخصوص ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس ہندو ناٹک میں المیہ مطلق نہیں ہے۔ ناٹک کا انجام لازماً فرحناک ہوتا ہے۔ اس میں برہمن کے کردار کا ہمیشہ مذاق اڑایا جاتا ہے اور برہمنوں کے لالچ اور شکم پروری پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ یہ بات نفسیاتی پہلو سے بڑی فکر انگیز ہے کہ وہ قوم جس کی سوچ پر یاسیت کے گھنے سائے چھائے رہے کیوں المیہ کی طرف متوجہ نہ ہو سکی۔ ہندوؤں کا ڈرامہ کالی داس اور بھوبھوتی میں بام کمال تک پہنچ گیا۔ سر ولیم جونز نے ۱۷۸۹ء میں شکنتلا کا ترجمہ کیا۔ اس کا ترجمہ ۱۷۹۱ء میں جرمن زبان میں کیا گیا جس سے گوئٹے اور ہرڈر بڑے متاثر ہوئے اور جس کے اثرات جرمنوں کی رومانیت کی تحریک پر بھی خاصے گہرے ہوئے۔ گوئٹے کو کالی داس کا ناٹک میگھ دوت (بادل کا ایلچی) بہت پسند تھا۔ ہندوؤں کے سیاسی اور اخلاقی تنزل کے ساتھ ناٹک بھی رہس میں تبدیل ہو کر رہ گیا جو متھرا اور برج میں صدیوں تک مقبول رہی۔

قدیم ہندو ادبیات کی ایک صنف جو ادبِ عالم میں ہر کہیں نفوذ کر گئی جاتک کہانیاں ہیں۔ جاتک[1] کا لغوی معنیٰ ہے 'جنم'۔ ان کہانیوں میں گوتم بدھ نے اپنے گزشتہ جنموں کے حالات بیان کئے ہیں یعنی جب وہ ہرن، ہاتھی، مور، بیل وغیرہ کے قالب میں تھا۔ جاتک کی قدامت چوتھی صدی قبل مسیح تک کی ثابت کی جا سکتی ہے۔ پٹنے کے بودھوں کی کونسل

---

[1] پنجابی میں بچے کو جاتک کہتے ہیں۔

میں جاتک کہانیوں کو مُرتّب کرکے پیش کیا گیا۔ ۴۳۰ء (ق م) میں ایک بودھ سوامی انہیں شمالی ہند میں لائے۔ یہی موجودہ جاتک کہانیاں ہیں۔ جاتک کہانیوں کا معروف مجموعہ کرتک دمنک (کلیلہ دمنہ) کا ہے جسے انوشروان کا وزیر برزویہ ایران لے گیا تھا۔ منصور عباسی کے عہد میں ابن المقفع نے اسے پہلوی سے عربی میں منتقل کیا۔ اس میں پنچ تنتر کے پانچ باب شامل ہیں۔ مرور زمانہ سے یہ کہانیاں مغرب کے ادبیات میں رواج پا گئیں اور کئی ایک الف لیلہ ولیلہ میں بھی شامل ہوگئیں۔ انوار سہیلی، عیار دانش خرد افروز، لبستانِ حکمت وغیرہ کلیلہ دمنہ ہی کے ترجمے ہیں۔ سُوک سپ تتی کا بنیادی حصہ بھی رادھا جاتک سے ماخوذ ہے۔ اس کی منتخب کہانیوں کا ترجمہ نخشبی نے طوطی نامہ کے نام سے کیا۔ ان میں یوگا کی طاقت سے جنس اور قالب بدلنے کے قصّے ہیں اور عورتوں کی نزاکت اور بے وفائی کا مبالغہ آمیز بیان ہے مثلاً بکرم کی رانی کے پیر پر گلاب کا پھول گر پڑتا ہے جس سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ایک نازنین کے بدن میں چاندنی سے چھالے پڑ جاتے ہیں۔ سُوک سپ تتی کی بعض کہانیاں خاصی فحش ہیں جن سے اخلاقی اور معاشرتی تنزّل کا کھوج ملتا ہے۔ ایک کہانی میں ایک جوگی ہاتھی بن کر اپنی بیوی کو اُٹھائے اُٹھائے پھرتا ہے اس کے باوجود وہ بدکاری سے باز نہیں آتی۔ یہ کہانی الف لیلہ ولیلہ میں بھی ملتی ہے جس میں ایک جنّ اپنی محبوبہ کو صندوق میں بند کرکے لئے لئے پھرتا ہے اور وہ جھک مارنے سے باز نہیں آتی۔ کئی عورتیں شوہروں کو سوتا چھوڑ کر اپنے آشناؤں کے پاس چلی جاتی ہیں۔ ایک عورت رات کو کسی مرد کا گانا سُنتی ہے۔ اُس پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اُس کے پاس جاکر اپنے آپ کو اُس کے سپرد کر دیتی ہے۔ کتھا سرت ساگر، بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی بھی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔

آریائی قبائل ابتدا میں اپنے اپنے سرداروں کے ماتحت زندگی بسر کرتے

تھے۔ قبیلے کا سردار پنچوں کے مشورے سے جھگڑے چکاتا تھا۔ جب وہ سندھ، گنگا اور جمنا کے میدانوں میں شہر بنا کر رہنے لگے تو زمامِ اختیار راجاؤں کے ہاتھوں میں آگئی جو ذات کے کھشتری ہوتے تھے۔ راجہ مطلق العنان تھا لیکن اسے راج آریا سبھا کے اراکین سے مشورہ کرنا پڑتا تھا۔ راجہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ اعلیٰ اخلاق اور بے داغ کردار کا مالک ہو، عاقل و دانا ہو اور عدل و انصاف کو قائم کرنے کا اہل ہو۔ اراکین مجلس شاستروں کے عالم ہوتے تھے۔ انہیں اس بات کا اختیار تھا کہ وہ ظالم، بدکردار اور مردم آزار راجہ کو معزول کر دیں۔ راجہ کا منتری عموماً برہمن ہوتا تھا۔ منوسمرتی کی رُو سے راجہ کو ایک سے زیادہ بیاہ کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن راجہ اس ہدایت کو نظر انداز کر دیتے تھے اور کئی رانیوں اور لونڈیوں سے دل بہلاتے تھے۔ راجہ کے لئے راست باز اور راست رَو ہونا ضروری تھا لیکن حالتِ جنگ میں مکر و فریب کو جائز سمجھتے تھے۔ منوجی نے بوقتِ ضرورت دغا اور فریب کو مستحسن قرار دیا ہے۔ منوجی کہتے ہیں۔

"جب اپنی فوج کو مسرور و محفوظ اور طاقت ور سمجھے اور دشمن کی فوج کمزور نظر آئے تو دشمن پر چڑھائی کر دے جب فوج میں سپاہیوں اور سواروں کی کمی ہو تب سکون اختیار کر کے آہستہ آہستہ دشمن سے صلح کرتا جائے۔ جب یہ صاف نظر آ رہا ہو کہ دشمن کی افواج فوراً ملک پر غالب ہو جائیں گی تب کسی احکامِ الٰہی کے پابند زبردست راجہ کی پناہ میں چلا جائے اور اگر پناہ دینے والے راجہ کے رویّہ میں بھی کوئی خدشہ کی بات نظر آئے تو اس سے بھی بے تامّل پوری طاقت سے مصروفِ کار ہو۔"

گویا اپنی اغراض کے لئے ناشکری اور محسن کُشی بھی جائز ہے۔ جاسوسی کے محکمہ کو بڑا اہم سمجھتے تھے۔ چندر گپت موریا سادھوؤں اور کسبیوں سے جاسوسی کا کام

لینا تھا۔

تاجروں، کسانوں اور کاریگروں پر لگان اور محصول لگائے جاتے تھے۔ تجارت کے نفع سے پچاسواں حصہ اور چاول وغیرہ اناج کا چھٹا حصہ سرکار وصول کرتی تھی۔ محصول کی وصولی جنس اور نقدی دونوں صورتوں میں کی جاتی تھی۔ برہمنوں سے محصول لینا ممنوع تھا۔ منوجی کہتے ہیں کہ اگر راجہ نے کسی برہمن سے محصول لیا تو برہمن اُسے بددُعا دے کر فنا کر دے گا۔ عدل وانصاف کو قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور حق گو گواہوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سزائیں سخت تھیں جس جس عضو سے کسی کو ضرر پہنچتا اُسے قطع کر دینے کا حکم تھا۔ تعزیر میں اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ راجہ کسی جُرم کا ارتکاب کرتا تو اُسے دوسرے مجرموں سے زیادہ سخت سزا دی جاتی تھی۔ سزاؤں میں انسانی کمزوریوں کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ منوجی کہتے ہیں۔

"جو حرص سے جھوٹی شہادت دے اُسے پندرہ روپے دس آنے، جو محبت کے بس میں آکر جھوٹی شہادت دے اُسے تین روپے ساڑھے چودہ آنے، جو خوف سے جھوٹی شہادت دے اُسے سات روپے تیرہ آنے جرمانہ کیا جائے"

بغاوت، غداری اور زنا کی سزا موت تھی۔ زانی کو برسرِعام لوہے کے تپائے ہوئے پلنگ پر لٹا کر جان سے مار دیتے تھے۔ زانیہ کو سب لوگوں کے سامنے جیتے جی کتوں سے پھڑوا دینے کا حکم تھا۔

ہندو معاشرے کا سنگِ بنیاد ذات پات کی تمیز ہے۔ ذات کے لئے رگ وید میں ورن (بہ معنیٰ رنگ) کا لفظ آیا ہے اور مُلکی سیاہ فام باشندوں کو دسیو (العبد کا داس بہ معنیٰ غلام) اور اُسُر کہا گیا ہے۔ ابتدا میں صرف آریا اور دسیو میں تمیز کی جاتی تھی۔ مرورِ زمانہ سے آریا بھی پیشوں کے لحاظ سے تین ذاتوں میں بٹ گئے۔ سب سے افضل ذات برہمنوں کی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کے مثیل بن گئے۔ کھشتری

جنگ جُو اور حکمران تھے، ویش کاروبار اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ شُودر ملکی باشندے تھے۔ جن سے عام طور سے خاکروب کا کام لیا جاتا تھا۔ منوجی نے اپنے شاستر میں ذات پات کی تمیز کو مذہبی اور قانونی حیثیت دی۔ یہ شاستر برہمنوں کے خصوصی حقوق کی پاسبانی کے لئے لکھا گیا تھا۔ منوجی کہتے ہیں "دنیا میں جو کچھ بھی ہے سب برہمن کی املاک ہے کیوں کہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے، کُل چیزیں اُسی کی ہیں۔" گا تیری کا منتر صرف برہمن ہی پڑھ سکتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "کائنات دیوتاؤں کے قبضے میں ہے، دیوتا منتروں کے قبضے میں ہیں اور منتر برہمن کے قبضے میں ہیں لہٰذا برہمن دیوتا ہے۔" برہمن کو جو کچھ دیا جائے وہ خیرات نہیں ہے بلکہ اُس کا حق ہے۔ جو برہمن کو جان سے مارے گا وہ ایک ہزار برس دوزخ میں جلے گا۔ منوجی کہتے ہیں "اگر برہمن کو کسی شے کی ضرورت ہو تو وہ جبراً شودر کا مال لے سکتا ہے۔" لوگوں کا فرض ہے کہ وہ برہمن کو دکشنا دیں۔ پنج دان یعنی سونا، اراضی، کپڑا، اناج اور گائے اُن کی نذر کرے۔ نیا مکان بنوائے تو سب سے پہلے وہاں برہمن سے پُوجا کروائی جائے اور انہیں بھوجن کروائے۔ اِسے جٹ کرنا کہتے ہیں۔ منوجی کا قانون یہ ہے کہ اگر شودر کسی برہمن عورت سے بدکاری کرے تو اس کا آلۂ تناسل قطع کر دیا جائے، برہمن کسی شُودر عورت سے جی بہلائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ شُودر کے لئے ضروری ہے کہ وہ دُور کھڑے ہو کر برہمن سے بات کرے۔ پُرانوں میں ہے کہ برہمن برہماجی کے مُنہ سے کھشتری اُن کے بازوؤں سے، ویش اُن کے رانوں سے اور شُودر اُن کے پاؤں سے نکلے ہیں۔ ذات پات کے تحفّظ کے لئے یہ قانون بنایا گیا کہ بچہ ماں کی گوت پر جائے گا باپ کی گوت نہیں لے گا۔ مثلاً برہمن کی عورت شُودر ہو گئی تو اُن کا بیٹا بھی شُودر ہی ہو گا۔

اس نامنصفانہ اور غیر فطری تفریق نے برہمنوں کا دماغ خراب کر دیا اور وہ خبرِ خُود غلط ہو گئے۔ مذہبی علوم پر اُن کی اجارہ داری تھی اور رُسومِ مذہب کی

ادائیگی اُن کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں تھی اس لئے معاشرے پر اُن کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ دینی علوم اور قوانین پر دسترس رکھنے کے باعث راجہ انہیں اپنا منتری (وزیر) یا مشیر مقرر کرتے تھے اس لئے عملاً ریاست پر اُن کا تصرف قائم ہوگیا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے اپنے حقوقِ خصوصی کی پاسبانی کرتے تھے۔ بعض علاقوں میں شادی کے بعد دُلہن کو پہلی رات پنڈت جی کے ساتھ خلوت میں بسر کرنا پڑتی تھی۔ یہ رسم ۱۹ ویں صدی تک باقی رہی۔ برہمن ہمیشہ کھشتری راجاؤں کے درباروں سے وابستہ رہے۔ جب صدیوں کی مُسلسل خانہ جنگی میں کھشتری مِٹ مِٹا گئے تو برہمنوں نے راجپوتوں کو سُورج بنسی چندر بنسی کے القاب دے کر اُن کی حکومتوں میں دخل پیدا کرلیا۔ راجپوتوں کے زوال پر تقسیم ہند کے بعد برہمنوں نے بنیوں سے ایکا کرلیا ہے اور ہندوستان پر بدستور حکومت کر رہے ہیں۔

ہزار ہا برس کے مُعاشرتی تفوق نے برہمنوں کو حد درجہ مُتکبر اور فابُوچی بنا دیا ہے۔ مذہب اُن کے لئے ایک نہ ختم ہونے والی سونے کی کان بنا رہا ہے۔ ایک فرانسیسی اہل قلم اباد بوا[1] نے کہا ہے کہ برہمن مُسلمانوں کا یہ قصور کبھی بھی معاف نہیں کریں گے کہ مُسلمانوں نے انہیں دیوتا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اباد بوا کے الفاظ میں "برہمن فطرۃً مکار، دغاباز، جھوٹے اور عہد شکن ہوتے ہیں اور غرض برآری کے لئے کسی قسم کی غداری اور مُحسن کشی سے دریغ نہیں کرتے۔"

ویش کاروبار کرتے رہے ہیں اس لئے ان کا نُقطۂ نظر شروع سے نفع اندوزی کا رہا ہے اور وہ ہمیشہ ایسی قوتوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں جو اُن کے کاروبار کے فروغ کا باعث ہوں۔ قدیم آریاؤں کی وسعتِ نظر، بلند نگہی اور شجاعت کھشتریوں کے ساتھ

---

[1] DUBOIS, ABBE, :HINDU CUSTOMS, MANNERS AND CEREMONIES.

مخصوص تھی لیکن جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے وہ فنا کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ مرہٹے تورانی الاصل ہیں راجپوت ، جاٹ اور گوجر ہنوں ، سیتھوں اور باختریوں کی اولاد سے ہیں۔ کھشتریوں کے مٹ جانے سے ہندو قوم اعلیٰ اخلاق سے محروم ہو چکی ہے۔ ذات پات کی صدیوں کی ظالمانہ تفریق نے ہندو معاشرے کو وسعتِ نظر اور ہمدردیٔ انسانی سے محروم کر دیا ہے۔

قدیم ہندو معاشرے میں منازلِ حیات کا تعین کیا گیا تھا ، برہمچریہ۔ تعلیم و تربیت کے حصول کے لیے ۲۵ برس کی عمر تک مجرد رہنا۔ ۲۔ گرہست۔ شادی کے بعد کی زندگی۔ ۳۔ سنیاس۔ تمام دنیوی فرائض ادا کرنے کے بعد بڑھاپے میں ترکِ علایق کر کے زاویہ نشینی کی زندگی گذارنا۔ بچوں کی جنیو پہنانے کی رسم (یگیہ پویت) گھر میں ادا کی جاتی تھی جس میں پنڈت یا گرو اسے منتر گایتری سکھاتا تھا۔ اچاریہ اسے پرانا یام (حبسِ دم) اور ضبطِ نفس کی تلقین کرتا تھا۔ طالب علم کے لئے لازم تھا کہ وہ اپنا کردار بے داغ رکھے۔ برہم چاری کے لئے پان کھانا ، پھولوں کا ہار پہننا اور آئینہ دیکھنا ممنوع تھا۔ جو برہم چاری بدکاری کا مرتکب ہوتا اسے گدھے کی کھال دُم سمیت اوڑھ کر ایک برس تک در بدر بھیک مانگنا پڑتی تھی۔ تعلیم کے دوران میں گرو کی خدمت ہر چیز پر مقدم تھی۔ ونکٹیشور کا قول ہے "استاد تعلیم کا ایک چوتھائی حصہ دیتا ہے ، ایک چوتھائی ذاتی مطالعہ سے علم حاصل کیا جاتا ہے ، ایک چوتھائی دوسرے لوگوں سے اور ایک چوتھائی زندگی سے"۔ لڑکیوں کی تعلیم امورِ خانہ داری پر مشتمل تھی۔ تعلیم کا آغاز شکشا (تلفظ) سے کرتے تھے ، پھر دیاکرن (صرف و نحو) اور چھند شاستر (علمِ عروض کی کتاب) پڑھائی جاتی تھی۔ زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد ویدوں اور شاستروں کو پڑھاتے تھے۔ ان کے ساتھ چھ درشنوں اور ویدانت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ایور وید (طب) میں چرک کی کتاب

پڑھاتے تھے گندھرووید (علم موسیقی) کا درس بھی دیا جاتا تھا۔ علم نجوم اور ریاضیات بھی نصاب میں شامل تھے۔ اعلیٰ تعلیم صرف برہمنوں کے لئے مخصوص تھی کیوں کہ کھشتری اور ویش اوائل عمر ہی میں اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔

ہند قدیم میں بیاہ کے آٹھ طریقے رائج تھے۔ براہم وواہ، جب دولہا اور دلہن دونوں باقاعدہ مجرّد رہ کر، تعلیم یافتہ مذہبی احکام کے پابند اور نیک سیرت ہوتے اور اُن کی باہمی رضامندی سے بیاہ کیا جاتا، ۲۔ لڑکی کو زیورات پہنا کر کسی بڑے یگیہ میں داماد کے سپرد کردینا دیو وواہ کہلاتا تھا ۳۔ دُلہا سے کچھ لے کر شادی کرنا آرش وواہ تھا ۴۔ دلہا اور دلہن کو کچھ دے کر شادی کرنا اُسُر وواہ تھا۔ ۵۔ بغیر کسی قاعدہ یا موقعہ کے کسی لڑکے یا لڑکی ہم صحبت ہوجانا گندھرو وواہ کہلاتا تھا۔ ۶۔ جنگ کے ذریعے یا فریب سے لڑکی حاصل کرنے کا نام راکھشس وواہ تھا۔ ۷۔ سوئی ہوئی یا شراب میں بدمست لڑکی سے اختلاط کرنا پیشاچ وواہ کہلاتا تھا۔ ۸۔ لڑکی کا باپ کسی لڑکے سے سات برس تک خدمت لے کر اُسے اپنی لڑکی بیاہ دیتا تھا۔

سٹرابو نے ارسٹو بولس کے حوالے سے لکھا ہے کہ ٹیکسلا میں یہ رسم تھی کہ نوجوان لڑکیوں کو ایک مقررہ دن کو باجوں گاجوں کے ساتھ منڈی میں لے آتے تھے جہاں شادی کے خواہش مند نوجوان اُن کا بدن کھول کر دیکھتے جب کسی کو کوئی لڑکی پسند آجاتی اور لڑکی بھی رضامند ہوتی تو دونوں بیاہ کر لیتے تھے۔ جیسا کہ پانڈؤں کے احوال میں لکھا ہے پانچوں پانڈو بھائیوں نے دروپدی سے بیاہ کیا تھا اور وہ باری باری ایک ایک ماہ سب کے ساتھ بسر کرتی تھی۔ اسی قسم کی شادیاں تبت اور پنجپیر (سوات، لداخ وغیرہ) کے علاقے میں عام طور سے رائج تھیں۔ لی بان تمدن ہند میں لکھتا ہے کہ نائروں میں ایک عورت کے متعدد خاوند ہوتے ہیں۔ اس شادی

سے جو بچے پیدا ہوں وہ اپنی ماں کے نام سے جانے جاتے ہیں کیوں کہ اُن کا باپ نامعلوم ہوتا ہے۔ اُس کے بقول یہ رسم مدورا میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ رسم ظاہراً ما قبل آریائی دور سے یادگار ہے جن کا نظامِ معاشرہ مادری تھا اور جس میں بچے ماں کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

شادی کا پہلا دن مہورت کہلاتا تھا یعنی خوشی کا دن۔ بیاہ پنڈال کے نیچے رچاتے۔ یہ شامیانہ بارہ چوبوں پر کھڑا کیا جاتا تھا۔ اس کے نیچے ہون کنڈ میں مسلسل آگ جلتی رہتی تھی۔ دلہا اور دلہن کے کپڑوں کی گرہ لگاتے۔ پنڈت وید کے منتر پڑھتا جاتا اور ہوم جاری رہتا۔ اِس کے بعد انہیں کھڑا کر کے آگ کے گرد چار چکر دلواتے۔ تین چکروں میں لڑکی آگے چلتی اور چوتھے چکر میں لڑکا آگے ہوتا تھا۔ یہ چکر ختم ہو جاتے تو لڑکی کا بھائی اُس کے ہاتھ میں کھیلیں دیتا جاتا جنھیں وہ آگ میں ڈالتی جاتی تھی۔ ایک رسم یہ تھی کہ لڑکے کو لڑکی کی دائیں جانب بٹھاتے اور دھرو (قطبی ستارہ) کا درشن کراتے تھے۔ عورتیں لڑکے سے دُلہن کے جوتے کی پوجا کراتی تھیں پھر دُلہا کا کنگن دُلہن سے اور دُلہن کا کنگن دُلہا سے کھلوایا جاتا تھا۔ دُلہا مٹی کے برتن بھی توڑتا تھا خیال یہ تھا کہ برتن ایک خبیث رُوح راہو نامی کی موجودگی سے ناپاک ہو جاتے تھے۔ دُلہا کے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی دیتے تھے تاکہ بھوت پریت قریب نہ پھٹک سکیں۔ سب سے اہم رسم کنیا دان تھی جس میں لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کو دُلہا کے سپرد کرتا تھا۔ ان رسوم کے خاتمے پر دُلہا دلہن پر مٹھیاں بھر بھر کر چاول نچھاور کرتے تھے مطلب یہ تھا کہ دونوں پھُولیں پھلیں۔ قدیم زمانے میں نابالغ لڑکیوں کا نکاح بھی کر دیتے تھے۔ یہ رواج آج بھی باقی و برقرار ہے اگرچہ حکومت نے قدغن لگا دی ہے۔ شادی کے بارے میں سنسکرت کا ایک مقولہ ہے "لڑکی ہونے والے شوہر کے حُسن کی تمنائی ہوتی ہے، اُس کی ماں اپنے ہونے والے داماد کی دولت

کو دیکھتی ہے، باپ علم کو دیکھتا ہے؛ رشتے دار حسب نسب کو دیکھتے ہیں اور عوام یہ دیکھتے ہیں کہ شادی پر کھانے پینے کو کیا ملے گا۔" رنڈوے اور بیوہ کو نکاح ثانی کی اجازت نہیں تھی۔ ویدوں کے زمانے میں بیوہ کو دیور سے بیاہ دیتے تھے۔ بعد میں بیوہ کا نکاح سخت ممنوع ہو گیا البتہ نیوگ کا رواج تھا۔ مہا بھارت میں آیا ہے کہ جب بھیشم کے سوتیلے بھائی مر گئے تو اس نے اپنی سوتیلی ماں ستیہ وتی سے کہا تم ویاس جی کے پاس جاؤ اور اپنے آخری بیٹے کی بیواؤں سے اولاد پیدا کراؤ۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ نیوگ عارضی تعلق تھا جس میں بیوی اپنے پہلے خاوند کے گھر رہتی تھی جس سے نیوگ کرتی اُس کے پاس نہیں رہتی تھی۔ نیوگ کرنے والی عورت کے لڑکے اُس کے نیوگ کے خاوند کے لڑکے نہ کہلاتے تھے اور نہ اُس کی گوت قبول کرتے تھے۔ وہ اپنی ماں کے متوفی خاوند کے بیٹے کہلاتے تھے۔ اس کی گوت سے تعلق رکھتے تھے اور اُس کی جائداد کے وارث ہوتے تھے۔ نیوگ کا تعلق مقررہ مدت تک ہوتا تھا۔ نیوگ عام طور سے بیوہ عورت اور رنڈوے مرد کا ہوتا تھا، کنواروں کا نہیں۔ نیوگ اعلانیہ ہوتا تھا جس میں بزرگوں اور طرفین کی رضامندی ضروری ہوتی تھی۔ برہمن عورت برہمن مرد ہی سے نیوگ کر سکتی تھی۔ نیوگ خاوند کے جیتے جی بھی ہو سکتا تھا۔ رگ وید میں آیا ہے کہ جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تو اپنی زوجہ کو ہدایت کرے کہ " اے سہاگ کی خواہش مند عورت تو میرے سوا کسی اور خاوند کی خواہش کر ایسی حالت میں عورت دوسرے مرد سے اولاد پیدا کرتی تھی مگر اپنے " عالی حوصلہ " شادی کئے ہوئے خاوند کی خدمت پر کمر بستہ رہتی تھی۔ اسی طرح عورت بیمار ہو جاتی تو مرد اُس کی مرضی سے کسی بیوہ سے نیوگ کر کے اولاد پیدا کر سکتا تھا[۱]"

زمانے کے گذرنے کے ساتھ نیوگ بھی ممنوع قرار پایا۔ اب بیوہ کے سامنے دو ہی راستے

---

[۱] ستیارتھ پرکاش

تھے۔ یا تو وہ اپنے شوہر کی چتا پر جل مرتی اور ستی کہلاتی یا ساری عُمر دکھ بھوگتی۔ بیوہ کا سر مُنڈوا دیتے تھے۔ وہ صرف صبح کے وقت رُوکھی سُوکھی کھا سکتی تھی اور ہر وقت میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتی۔ لوگ اس کے سائے کو بھی نحس سمجھتے تھے۔ انہی مصائب سے نجات پانے کے لئے اور موت کو زندگی سے بہتر سمجھ کر بعض عورتیں ستی ہو جاتی تھی۔ ستی کی اِس ظالمانہ رسم کے بارے میں تیور نیئر نے کہا ہے کہ برہمن گائے کی دُم کا بال بھی بیکا نہیں کرتے لیکن ایک جیتے جاگتے اِنسان کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیتے ہیں۔ برہمن بیوہ کو ستی کی ترغیب اِس لئے دیتے تھے کہ اُس کے جل مرنے کے بعد اُس کے زیورات اُنہی کو ملتے تھے۔ بعض اوقات نوجوان بیواؤں کو اُن کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر چتا پر لے جاتے تھے جہاں اُنہیں رسیوں میں جکڑ دیا جاتا تھا مبادا آگ سے گبھرا کر بھاگ جائیں۔ جو عورت کسی حیلے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی اُسے ذات سے خارج کر کے چوہڑے چماروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ پنجابی کی کہاوت ہے "چھٹی تو لگی چوہڑیاں جوگی ہوئی"۔ جلال الدین اکبر نے ستی کو روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا قطعی خاتمہ ولیم بنٹنگ کے ہاتھوں ہوا تھا

ویدوں کے زمانے میں مُردوں کو دفن کرنے کا رواج بھی تھا جو بعد میں متروک ہو گیا اور مُردوں کو جلانے لگے۔ مرتے وقت مُنہ میں گنگا جل یا تھوڑا سا سونا ڈال دیتے تھے تاکہ مُردہ سیدھا سورگ میں چلا جائے۔ بعض اوقات مرتے وقت گائے کے درشن بھی کرواتے تھے۔ کشمیر کے ایک راجہ کے متعلق مشہور ہے اُسے عالمِ نزع میں محل کی تیسری منزل سے نیچے لایا گیا تاکہ وہ گائے کو چھُو کر جان دے سکے۔ بعض ہندو اپنے دانتوں پر سونا چڑھوا لیتے ہیں تاکہ سورگ کا راستہ کھل جائے۔ مرنے کے بعد بِمان بنا لیتے اور اس کے ساتھ ساتھ عزیز اور دوست "راجہ رام ست ہے" کے نعرے لگاتے ہوئے مسان کو لے جاتے آگ لگانے سے پہلے نعش کا مُنہ کھول کر سُورج دیوتا کے درشن کرانے کا رواج تھا۔

شعلے بھڑک اٹھتے تو مُردے کی کھوپڑی پر ایک آبخورہ گھی کا انڈیل دیتے۔ بعد میں راکھ اور ہڈیاں چُن کر گنگا میں بہا دیتے تھے۔ بیوہ کے لئے حکم تھا کہ وہ اپنے رنڈاپے کے کپڑے دریائے گنگا میں ڈبائے تاکہ پوتر ہو جائے۔ جن کے ماں باپ مر جاتے وہ گنگا جا کر بھوّر کراتے تھے اور پنڈ دان کرتے تھے۔ گنگا کو اس قدر مقدس سمجھتے تھے کہ بعض لوگ پریاگ کے مقام پر دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتے۔ موت کے بعد تیسرے دن (سوئم) برہمنوں کو قیمتی کپڑے وغیرہ دیتے تھے۔ ایک برس تک شرادھ کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ براہمنوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ شرادھ نہ کیا جائے تو مُردے کی رُوح پریت بن کر اُس کے عزیزوں کو پریشان کرتی رہتی ہے۔ شرادھ پر ہزاروں روپے اُٹھ جاتے اور برہمنوں کی بن آتی، مُرغن غذائیں کھا کر خوب تن تازہ ہوتے تھے۔

ہندوؤں کے معاشرے میں عورت کا مقام کبھی بھی بلند نہیں رہا۔ لڑکی کی پیدائش کا ذکر یجروید اور اتھروید میں نہایت حقارت سے کیا گیا ہے اور ادب و شعر میں اُس کی بے وفائی، متلوّن مزاجی اور ہرجائی پن کا ذکر عام ملتا ہے۔ سوک سپ تتی میں لکھا ہے۔

"عورتوں کے حربے یہ ہیں، دھوکا دینے والی باتیں، مکر، قسمیں کھانا، بناوٹی جذبات کا اظہار کرنا، جھوٹ موٹ کے آنسو بہانا، بناوٹی مسکراہٹ، لغو دکھ درد کا اظہار اور بے معنی خوشی، بے اعتنائی، بے معنی سوالات پوچھنا، خوشحالی اور ادبار سے بے نیازی، نیک و بد میں تمیز نہ کر سکنا، عشاق کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھنا۔"

نیتی اشوک میں ہے۔

"عورت خواہ کتنی ہی محبت کا اظہار کرے ہمیشہ چوکس رہو"

سنسکرت کی ایک تمثیل 'مٹی کا چھکڑا' میں لکھا ہے۔

"عورتیں سمندر کی موجوں کی طرح گریزاں ہوتی ہیں۔ اُن کی محبت شفق کی اُن دھاریوں کی طرح بے ثبات ہوتی ہے جو غروبِ آفتاب کے وقت اُفق پر نمودار ہوتی ہیں۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے اُس شخص سے لپٹی رہتی ہیں جس کے پاس دھن دولت ہو۔ جب وہ اُسے چوس لیتی ہیں جیسے کہ گنے کا رس چوس لیا جاتا ہے تو اُسے دھتا بتا دیتی ہیں۔"

گوتم بدھ اور منوجی نے بھی عورت سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندو عورت ہمیشہ اپنے شوہر پر جان چھڑکتی رہی ہے اور اُسے پتی دیو سمجھ کر اس کی پُوجا کرتی رہی ہے لیکن ہندو مرد نے عورت کی ناقدری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور تو اَور رام چندر جیسے دیوتا بھی لنکا سے واپسی پر سیتا کی عصمت پر شک کرتے رہے اور اُسے خود کشی کرنے پر مجبور کر دیا۔

دوسری معاصر اقوام کی طرح قدیم ہندوؤں میں بھی مذہبی عصمت فروشی کو فروغ حاصل ہوا۔ مندروں میں سینکڑوں نوجوان دیو داسیاں پروہتوں اور یاتریوں کی تسکینِ ہوس کیا کرتی تھیں۔ پروہتوں نے لوگوں کو اس بات کا یقین دلا رکھا تھا کہ جو شخص اپنی بیٹی دیوتا کی بھینٹ کرے گا، سورگ میں جائے گا چنانچہ راجے اور اُمرا اپنی بیٹیاں مندروں سے وقف کر دیتے تھے۔ ان لڑکیوں کو رقص و سرود کی تعلیم دلائی جاتی تھی۔ دیو داسیاں صبح و شام دیوتاؤں کی آرتیاں اُتارتی تھیں اور گاتی بجاتی تھیں۔ یاتری معاوضہ دے کر اُن سے مستفید ہوتے تھے۔ عصمت فروشی کی یہ کمائی پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی۔ سومنات کے مندر میں ہزاروں دیو داسیاں یہ شرمناک کاروبار کرتی تھیں۔ مندروں کا ماحول نہایت ہوس پرور تھا۔ پروہت دیوتاؤں کی جنسی بے راہ روی کے افسانے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ لنگ اور یونی کے مجسّمے دیوتاؤں کی طرح پُجتے تھے۔ در و دیوار پر جنسی ملاپ کے مختلف آسن پوری تفصیل سے دکھاتے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر لوگوں

کی ہوا وہوس کو اشتعال کی ہوتی تھی۔ اُن کے بھڑکے ہوئے جذبات کی تسکین کا وافر سامان دیوداسیوں کی صورت میں موجود ہوتا تھا۔ یہ مقدس کسبیاں ناچتے وقت نہایت ترغیب انگیز طریقوں سے بھاؤ بتاتی تھیں۔ دیوداسیوں کے علاوہ راجاؤں کے ذوقِ جمال کی پرورش کے لئے راج نرتکیاں تھیں جو گانے بجانے کے علاوہ علوم وفنون میں بھی دست گاہ رکھتی تھیں۔ اِن نرتکیوں کی تربیت کرنے والی کو نائکہ کہتے تھے۔ نائکہ انہیں فنِ کشش وجذب کے دقیق نکات کی تعلیم دیتی تھیں۔ کام جوئی اور ہوس رانی کے متعلق اچھا خاصا ادب پیدا ہو گیا تھا۔ کام شاستر کے موٴلف وتسایَن نے نفسیاتِ جنسی کے ایسے ایسے رموز بیان کیے ہیں کہ آج بھی اُن پہ قابلِ قدر اضافہ نہیں ہو سکا۔

قدیم ہندوستان میں دو قسم کے تہوار منائے جاتے تھے فصلی اور مذہبی۔ بعض اوقات دونوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ بسنت، بیساکھی اور لوہڑی فصلی تہوار تھے جو فصل بونے اور کاٹنے پر منائے جاتے تھے۔ ان تہواروں پہ خوب کھل کھیلتے تھے۔ جی بھر کر شراب پی جاتی اور جوا کھیلنے کی مجلسیں جمتی تھیں۔ ساون کی پانچویں کو ناگ پنچمی کا تہوار مناتے تھے۔ جو قدیم ناگ پوجا سے یادگار تھا۔ ہولی کا تہوار وسنتی دیوی کے اعزاز میں منایا جاتا تھا۔ شیوراتری ماگھ کی چاند کی چودھویں رات کو منایا جاتا تھا اور اس پہ چوبیس گھنٹے کا برت رکھا جاتا تھا۔ چیت کی نویں کو برہمنوں کا تہوار ہوتا تھا کہ اس دن وشنو رام کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔ اس دن صرف ایک دن کا کھانا کھاتے تھے۔ درگا دیوی کے اعزاز میں درگا پوجا کا تہوار منایا جاتا تھا۔ دسہرے کے تہوار پہ رام کے بن باس، اُس کے مصائب اور راون کی شکست کے واقعات کو ناٹک کی صورت میں دکھاتے تھے۔ اور راون کا بہت بڑا پتلا بنا کر اُسے آگ لگائی جاتی تھی۔ دیوالی کی رات کو چراغاں کیا جاتا تھا اور مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی۔ یہ تہوار اُس دن سے یادگار ہے جب رام بن باس کاٹ کر فاتحانہ ایودھیا واپس لوٹے تھے۔

قدیم آریا ورزشی کھیلوں کے بڑے شوقین تھے۔ کُشتی اُن کا خاص فن تھا۔ اس کے علاوہ رتھوں کے مقابلے بڑے جوش و خروش سے کئے جاتے تھے۔ گھوڑ دوڑ کا کا رواج بھی تھا۔ راتوں کو مویشیوں کی چوری کرنا جزوِ مردانگی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے دیہات میں کُشتی، پنجہ کشی اور مویشیوں کی چوری کی روایات آج بھی باقی ہیں۔ جوا کھیلنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات اپنی تمام املاک، گھوڑے بیل، اراضی بلکہ عورتیں تک داؤ پر لگا دیتے تھے۔ جوا کوڑیوں سے کھیلتے تھے اور چوسر کی بازی لگاتے تھے۔

ہندو معاشرے میں جادو کا بڑا رواج تھا۔ اتھرو وید میں سحر و طلسمات کے طریقے اور ٹونے ٹوٹکے درج کئے گئے ہیں۔ جادو کی رسوم میں بعض اوقات انسانی قربانی بھی دیتے تھے اور جانوروں کی ہڈیاں اکٹھی کر کے منتر پڑھتے تھے۔ کئی منتر مسانوں میں جاکر آدھی رات کے وقت کسی مُردے کی کھوپڑی کو ہڈی سے بجا بجا کر پڑھے جاتے تھے۔ چوری کا پتہ لگانے، خفیہ خزانوں کا کھوج نکالنے، دشمنوں کو تباہ کرنے اور محبوبہ کے دل میں گھر کرنے کے منتر موجود تھے۔ گائے کا دودھ زیادہ کرنے، نظرِ بد سے بچانے، میاں بیوی میں پھوٹ ڈالنے، کاروبار میں ترقی کرنے اور مختلف امراض کا علاج کرنے کے ٹوٹکے تھے۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ شیلو نے ایک لڑکے کو ایک جادو کا فقرہ سکھا دیا: ہراہ، ہرام، ہریم، ہروم۔ ایک دعوت پر اس لڑکے کو مدعو نہ کیا گیا تو اُس نے یہ منتر پڑھ دیا۔ پھر کیا تھا جتنے کھانے تھے سب مینڈک بن بن کر مہمانوں کے آگے سے پھدک گئے، اور لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ جادوگروں کے طور طریقے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جادوگر جب لچھمی دیوی کی عبادت کرتا ہے تو مادر زاد برہنہ ہوتا ہے۔ لیکن رام کی پوجا کرتے وقت سارے کپڑے پہن لیتا ہے۔ سحر و طلسمات کی رسوم اُس زمانے سے یادگار ہیں جب مذہب جادو سے الگ نہیں ہوا تھا۔ آج بھی

ہندوستان میں مذہب کے پہلو بہ پہلو جادو کا بے پناہ اثر باقی ہے۔ بعض اوقات تو مذہبی رسوم اور جادو کی رسوم میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ایلورا اور اجنٹا کے غاروں سے معلوم ہوتا ہے قدیم ہندو بے سیئے کپڑوں سے اپنا تن ڈھانپ لیتے تھے۔ دھوتی اور ساری اسی دور سے یادگار ہیں۔ سر پر پگڑی، پاؤں میں جوتے اور بدن پر سیئے ہوئے کپڑے پہننے کا رواج مسلمانوں کی آمد کے بعد عام ہوا۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں پہنتے تھے کیوں کہ وہ جانوروں کے چمڑے کی دباغت کو ناپسند کرتے تھے۔ عوام سر پاؤں سے ننگے پھرتے تھے۔ چولی مغل شہزادیوں کی ایجاد ہے۔ اُن کی دیکھا دیکھی ہندو عورتیں اس کا استعمال کرنے لگیں۔ کھانا چوکے میں پکایا جاتا تھا جسے عورتیں گائے کے گوبر سے لیپ پوت لیتی تھیں۔ گائے کا پیشاب اور گوبر طہارت کے لئے استعمال میں آتا تھا۔ کھانا پیتل کی کٹوریوں یا پیپل کے پتوں پر رکھ کر کھاتے تھے۔ کھانا کھاتے وقت ایک دوسرے کو چھونا منع تھا۔

قدیم زمانے کے ہندو سمندر یاترا سے گریز کرتے تھے۔ انہیں اپنے ملک سے باہر جانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں تھی کیوں کہ برصغیر ہند نہایت وسیع، زرخیز اور نباتی و معدنی دولت سے مالا مال تھا۔ بابل، کنعان، عرب اور سکندریہ کے تاجر خشکی اور سمندر کے راستے ہندوستان آتے تھے اور یہاں سے نارنگی، لیموں، کیلا، ریوند چینی، دارچینی، بھلاتوان، سونٹھ، چھالیہ، ہلیلہ بلیلہ، کافور، نیل توتیا، ململ، ساگوان کی لکڑی، ہیرے اور گینڈے کی کھال لے جاتے تھے۔ بودھ سوامی البتہ تبلیغ کے لئے دُور دراز کے ملکوں میں پہنچے اور منگولیا، تبت، چین، جاپان برما، سیلون اور سیام میں اپنے مذہب کی اشاعت کی۔ انہوں نے سکندریہ میں بھی ایک بارونق بستی بسائی تھی۔ وہاں کے تو اشراقی فلسفی فلاطینوس اور ایران کے نبی

مانی کے مذہب پر بُدھ مت کے اثرات مثبت ہوتے۔ بُدھ کا نظریۂ حیات منفی اور سلبی تھا اس لئے جہاں کہیں بُدھ مت کی اشاعت ہوئی لوگ جبریّت اور یاسیت کے شکار ہو گئے اور مَردم بیزاری اور رہبانیت کا دَور دورہ ہو گیا۔ اپنے معاشرے کی فلاح و بہبود کی کوشش کرنے کی بجائے اِن اقوام کے بہترین دل و دماغ "ستسار چکّر" سے نجات پانے کے خبط میں مبتلا ہو گئے جس سے شرقِ بعید اور جنوب مشرقی ایشیا کی اقوام ولولۂ حیات سے یکسر محروم ہو گئیں۔ بودھوں کی رہبانیت مانویّت کے واسطے سے مسلمان صوفیہ کے افکار میں بھی نفوذ کر گئی چنانچہ مشرقِ وسطیٰ کی مِلّتِ اسلامیّہ کے ذہنی و فکری جمود کی ذمّے داری ایک حد تک بُدھ مت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ بُدھ مت اور ویدانت نے مغرب کے بعض اہلِ علم کو بھی متاثّر کیا ہے۔ شوپنہاؤر، ہارٹمان، آلڈس ہکسلے، جیرارڈ ہرڈ وغیرہ کے جبریّت اور یاسیت میں اِن اثرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں کے اصل کارنامے تحقیقی ہیں۔ انہوں نے ایرانیوں اور عربوں کی وساطت سے دنیا کو ہندسوں کسورِ اعشاریہ، شطرنج اور چانک کہانیوں سے رُوشناس کرایا تھا۔ اُن کی یہ قابلِ فخر دین تمدّنِ عالم کا قیمتی حصہ بن چکی ہے۔
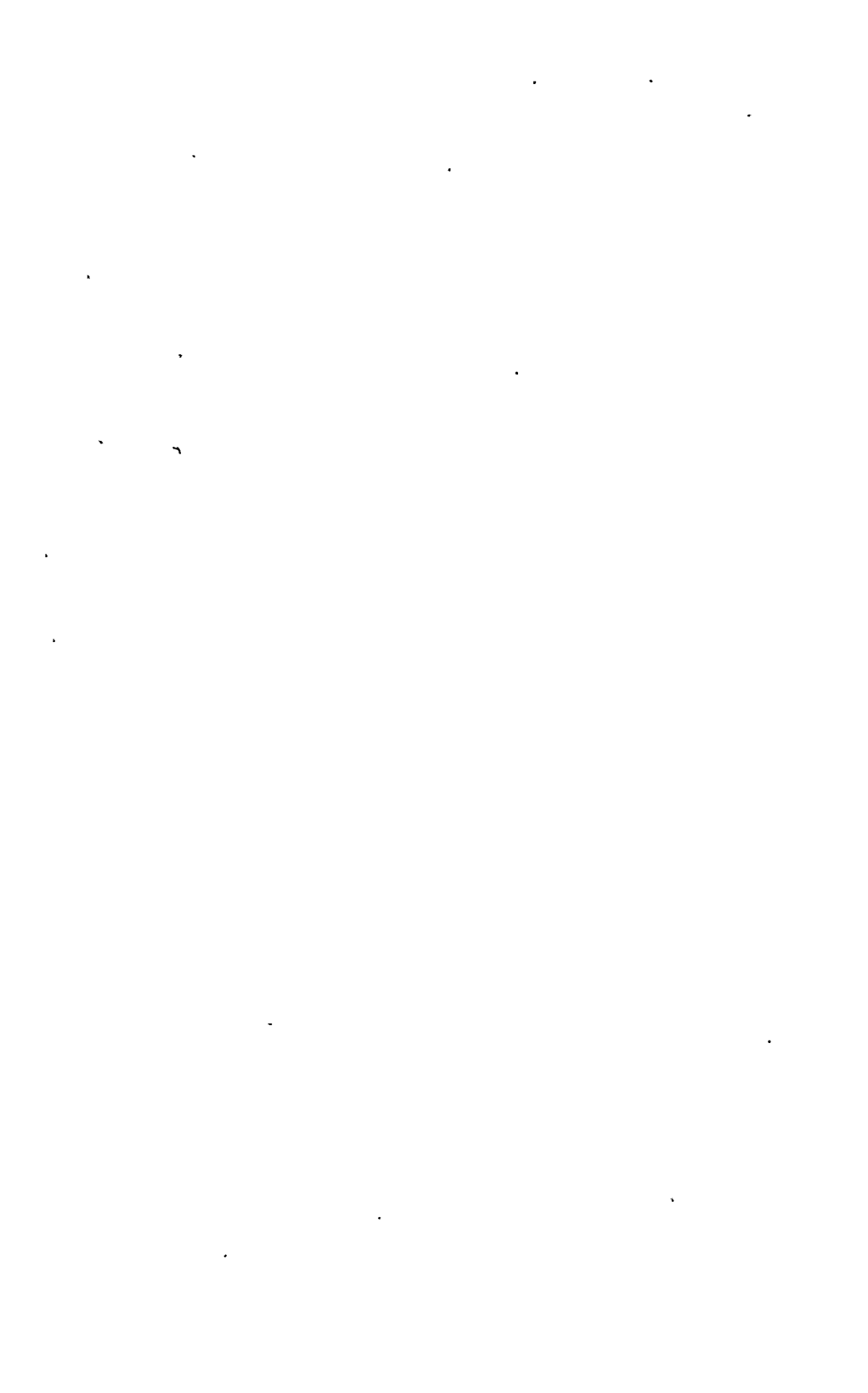
چین

چین ایشیا کا عظیم ترین ملک ہے۔ اصل چین اٹھارہ صوبوں پر مشتمل ہے۔ اِس کا رقبہ پندرہ لاکھ مربع میل اور آبادی ۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق اڑتیس کروڑ تھی۔ چین کبیر جس میں اندرونی منگولیا، تبّت، مانچوریا اور فارموسا شامل ہیں چالیس لاکھ مُربّع میل میں پھیلا ہوا ہے اور آبادی کا آج کل کا تخمینہ پچھتّر کروڑ ہے۔ مُلک کو مندرجہ ذیل قُدرتی خطوّں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ شمالی چین: اِس کی سطح مرتفع پر زرد رنگ کی زرخیز مٹی کی تہ بچھی ہوئی ہے۔ اِس میں شمالی چین میدان اور شان ٹنگ کا سلسلۂ کوہ واقع ہے، اور ہوانگ ہوُ (زرد دریا) اِس کا سب سے بڑا دریا ہے۔

۲۔ مرکزی چین: شمالی ینگ سی، سطح مرتفع اور ینگ کے نشیبی میدان پر مشتمل ہے۔ اِسے دریائے ینگ سی کیانگ سیراب کرتا ہے۔

۳۔ جنوبی چین میں جنوبی ینگ سی، سطح مرتفع اور دریائے سی کیانگ کا طاس واقع ہے۔

۴۔ جنوب مغربی ساحلی میدان۔

چین کا بیشتر حصہ سطح مرتفع ہے اگرچہ اِس میں بڑے بڑے دریاؤں کے میدان بھی ہیں۔ پہاڑ مغرب سے مشرق کو پھیلے ہوئے ہیں مرکز میں کوُن لون کا سلسلۂ

کوہ ہے۔ سب سے بڑا کوہستان سن لنگ کا ہے جو ساحلِ سمندر تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑ جو بعض مقامات پر دس ہزار فٹ تک بلند ہیں چین کو دو واضح حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جو آب و ہوا، سطحِ زمین، زرعی پیداوار اور باشندوں کے طرزِ بود و ماند کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ شمالی چین کے مغربی حصّے میں زرد مٹی کی تہ سطحِ مرتفع اور میدانوں پر یکساں پھیلتی چلی گئی ہے۔ زرد مٹی کو ہوائیں اڑا کر لاتی ہیں۔ انتہائے مشرق میں شان تنگ کا علاقہ ہے جس میں تائی شان کا مقدّس پہاڑ واقع ہے۔ جنوبی چین کا بیشتر حصہ پہاڑیوں اور وادیوں پر مشتمل ہے۔ جنوب مغرب کی سطحِ مرتفع تبت کی رفعتوں تک بلند ہوتی چلی گئی ہے۔

چین میں بڑے بڑے دریا بہتے ہیں جن پر لوگوں کی معاش کا دارومدار ہے۔ تین بڑے دریا مغرب کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور مشرق کی طرف بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ شمالی چین میں ہوانگ ہو بہتا ہے۔ اس کا طاس جسے شمالی چین کہتے ہیں بڑا زرخیز ہے۔ ینگ سی جو ملک کے درمیانی حصّے میں بہتا ہے۔ ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے اور سُرخ میدان کو سیراب کرتا ہے۔ اس کا طاس چین کا سب سے زیادہ گنجان آباد علاقہ ہے۔ جنوبی ملک کا دریا سی کیانگ ہے جس کا دہانہ نہایت زرخیز اور وسیع ہے۔ انھی دریاؤں کے کناروں پر اور میدانوں میں چین کے اکثر باشندے آباد ہیں۔

شمالی چین میں سخت گرمی پڑتی ہے اگرچہ اس کی معیاد قلیل ہے، سرما شدید اور طویل ہوتا ہے اور بارش کم ہوتی ہے۔ جنوب میں گرما خاصا طویل ہوتا ہے سرما میں خوب بارش ہوتی ہے اور موسم معتدل ہوتا ہے۔ سرما کی شمالی ہوائیں اکتوبر اور اپریل میں چلتی ہیں اور شمالی چین میں سخت جاڑا ہوتا ہے۔ گرما کی موسمی ہوائیں مئی اور اگست کے درمیان جنوبی سمندروں کی طرف سے چلتی ہیں اور بارش برساتی ہیں جس سے جنوبی میدان سرسبز و شاداب ہو جاتے ہیں۔ شمال تک پہنچتے پہنچتے ان

کی نمی کم ہو جاتی ہے ۔ جولائی اور اگست میں پندرہ بیس انچ بارش ہو جاتی ہے۔ جس سال شمالی میدان میں بارش نہ ہو سخت قحط پڑ جاتا ہے بعض سالوں میں زیادہ بارش ہو جانے سے بے پناہ سیلاب آتے ہیں جو ہر طرف تباہی پھیلا دیتے ہیں ۔

چین کی زرعی پیداوار چاول ، گندم ، جوار ، مکی ، ریشم ، کپاس ، مٹر ، گنا ، سویا بین ، تمباکو ، آلو اور دوسری سبزیاں ہیں ۔ پھلوں میں سیب ، تربوز ، نارنگی ، کیلا ، ناشپاتی ، آڑو ، شفتالو اور لیچی بافراط ہوتے ہیں ، جنگل کی پیداوار میں بانس اور کافور قابلِ ذکر ہیں ۔ چین معدنیات سے مالا مال ہے ۔ کوئلہ ، لوہا ، منگانیز ، ٹنگ سٹن قلعی ، سیسہ ، نمک ، پھٹکڑی ، چاندی اور تانبے کی بڑی بڑی کانیں ہیں ۔

شمالی چین کے باشندے قدآور اور تنومند ہیں ۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھیں ترچھی ہیں ۔ وہ نہایت جفاکش اور کم سخن ہیں ۔ جنوبی چین کے لوگ انہیں سادہ لوح اور کودن کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں ۔ شمالی چین کا سب سے بڑا شہر پیکن ہے جس میں بڑے بڑے کشادہ باغات ، محلات اور معبد ہیں ۔ یہ شہر صدیوں سے ملک کا دارالسلطنت رہا ہے ۔ چین کی تاریخ بڑی حد تک اسی کے گرد گھومتی رہی ہے ۔ اس علاقے کی بڑی بندرگاہ ٹین سٹین ہے ۔ اس کے علاوہ چی خو اور سنگ تاؤ بڑے شہر ہیں ۔

جنوبی چین ایک وسیع و شاداب سبزہ زار ہے ، آب و ہوا گرم مرطوب ہے ، دھان کی کاشت وسیع پیمانے پر کی جاتی ہے جس کی میلوں تک پھیلی ہوئی ہریالی بڑا دلکش منظر پیش کرتی ہے ۔ ہر طرف ہرے بھرے بانسوں اور دوسرے پیڑوں کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں ۔ بے شمار تالاب ، جھیلیں اور ندیاں قدرتی مناظر کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں ۔ شہر گنجان آباد ہیں ، باشندے چاق و چوبند ، ہنس مکھ اور پستہ قد ہیں ۔ ینگ سی کے سبزہ زاروں میں اوسطاً ایک مربع میل میں چھ سو ستر

انسان آباد ہیں ۔ بعض مقامات پر آبادی دو ہزار فی مربّع میل تک پہنچ گئی ہے ۔ دُنیا کے کسی حصے میں یہاں سے زیادہ آبی شاہراہیں نہ ہوں گی ۔ دریاؤں اور اُن کے معاونوں کے علاوہ ایک لاکھ لمبی نہریں ہیں جن میں سینکڑوں میلوں تک اندرونِ مُلک میں جہازرانی ہو سکتی ہے ۔ یہی نہریں سڑکوں کا کام بھی دیتی ہیں کہ اکثر قصبے انہی کے کنارے آباد ہیں ۔

دُنیا کی سب سے بڑی کھودی ہوئی نہر کو نہرِ کبیر کہتے ہیں ۔ اِسے پانچویں صدی (ق م) میں کھودا گیا تھا ۔ ۱۲۸۰ء میں اسے مزید گہرا کیا گیا ۔ یہ نہر ہانگ چو سے ٹین سٹین تک چلی گئی ہے جو آٹھ سو پچاس میل کی مسافت ہوتی ہے ۔ بڑے بڑے شہر دریاؤں کے کناروں پر آباد ہیں ۔ ان میں نین کنگ سب سے بڑا ہے اور کئی دفعہ پایۂ تخت رہ چکا ہے ۔ شنگھائی چین کی بیرونی تجارت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور اِس کا شمار دُنیا بھر کی چوٹی کی بندرگاہوں میں ہوتا ہے ۔ ہانگ چو کا تاریخی شہر آثارِ قدیمہ سے مالا مال ہے ۔ ہانکو ، ہن یانگ اور دو چانگ کے شہر سمندر سے چھ سو میل دور ہیں لیکن اِن تک بحری جہاز آسانی سے پہنچ جاتے ہیں ۔

جنوبی علاقوں میں کسان زیادہ تر چاول اُگاتے ہیں ۔ اِس کے علاوہ مکئی اور تمباکو کی کاشت بھی کی جاتی ہے ۔ شہتوت کے بے شمار درختوں پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں ۔ چین کا ریشم بیشتر دریائے سی کیانگ کے دہانہ سے آتا ہے ۔ اِسی دہانے میں کینٹن کا شہر آباد ہے جس کے حوصلہ مند تاجر دُنیا کے ہر گوشے دکھائی دیتے ہیں ۔ جزیرہ ہانگ کانگ برائے نام انگریزوں کی ملکیت ہے ۔

آب و ہوا اور جغرافیائی ماحول کی گُوناگُونی کے باوجود اہلِ چین چند مُشترک صفات اور خصوصیات رکھتے ہیں ۔ وہ نہایت محنتی ، جفاکش ، شائستہ اور ذہانت دار ہیں ۔ کسان اراضی کے چپّے چپّے کی کاشت کرتے ہیں ۔ آبادی کا اسّی فی صد حصہ دیہات میں آباد ہے ۔ مرد ، عورتیں ، بوڑھے ، بچے صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کرتے ہیں ۔ آب پاشی کے

لئے نہریں کھودی گئی ہیں۔ ندی نالوں کا پانی بھی مصنوعی آبشاروں کی صورت میں کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے رہٹ بھی لگائے گئے ہیں۔ اہلِ چین مرغیاں اور سور کثرت سے پالتے ہیں۔ مویشیوں سے صرف کھیتی باڑی کا کام لیا جاتا ہے۔ چینی بھینس کا دودھ نہیں پیتے، اسے ہل میں جوتتے ہیں۔ اسی طرح گدھے پر بوجھ لادنے کے بجائے اس سے ہل کھینچنے کا کام لیتے ہیں۔ چین کا سب سے بڑا مسئلہ صدیوں سے خوراک کا رہا ہے۔ پرانے زمانے میں دوست راستے میں ملتے تو سلام اِن الفاظ میں کرتے تھے "کیا تم نے کھانا کھا لیا ہے" کسی زمانے میں چین میں بڑے بڑے گھنے جنگل تھے لیکن انہیں کاٹ کاٹ کر ختم کر دیا گیا۔ درختوں کے گھٹ جانے سے سیلاب تباہی پھیلانے لگے۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چیل، شاہ بلوط، کافور اور سفیدے کے درختوں کی جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔ یتگسی کے کوہستان میں بانس کے گھنے جنگل پائے جاتے ہیں۔

اہلِ چین کہتے ہیں کہ اُن کی قوم میں پانچ مختلف نسلوں کا اختلاط ہوا ہے چنانچہ ۱۹۱۱ء کے انقلاب کے بعد کے چینی پھریرے میں پانچ دھاریاں تھیں؛ سرخ چینیوں کے لئے، زرد مانچوؤں کے لئے، نیلی مغلوں کے لئے، سفید ترکوں کے لئے اور سیاہ تبتیوں کے لئے۔ چین کے اکثر باشندے مغولی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو رنگ کی زردی، رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں، سر کے سیدھے سیاہ بالوں اور ترچھی آنکھوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ چین کے تمدن میں سات ہزار برسوں کا تسلسل ہے اور اِس کا شمار دنیا بھر کے قدیم ترین تمدنوں میں ہوتا ہے۔ علمائے آثارِ قدیمہ کے خیال میں یہ تمدن ۳۵۰۰ء (ق م) سے بھی پہلے کا ہے۔ پیکن کی نیم انسانی کھوپڑی سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں تاریخی زمانے سے صدیوں پہلے انسان آباد تھا۔

اہلِ چین کو قدیم زمانے سے تاریخ نگاری سے گہرا شغف رہا ہے اور اُن کے سرکاری مورخین احتیاط اور صحت سے اپنے حکمرانوں کے احوال قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اِس بات کے دستاویزی ثبوت ملتے ہیں کہ چین میں کم و بیش دو ہزار برس قبل مسیح

چین میں ایک ترقی پذیر اور جاندار تمدن پنپ رہا تھا جس کی تشکیل و ارتقاء میں کئی صدیاں لگی ہوں گی۔ بہر حال جب چین صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوا تو اُسے ہم کانسی کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ اِس زمانے میں مُلک پر ہسیا اور شانگ خانوادوں کی حکومت تھی۔ یہ زمانہ ۲۲۰۵ء تا ۱۱۲۳ء (ق م) کا ہے۔ تحریر کی ایجاد ہو چُکی تھی۔ گندم اور چاول کی کاشت ہوتی تھی۔ سَن اور ریشم سے کپڑے بنانے اور سینے کے ہُنر موجود تھے۔ کُتّا، مرغی، سؤر، بھیڑ اور گھوڑا پالے جاتے تھے۔ دیوتاؤں پر انسانوں اور جانوروں کی سوختنی قُربانی دی جاتی تھی، جنگی قیدیوں کو مندروں کی قربان گاہوں میں ذبح کرتے تھے۔ جنگی ہتھیار کُلہاڑا، تلوار، خنجر، برچھا اور خُود کانسی کے بناتے تھے۔ لڑائی کے میدان میں جنگی رتھوں میں بیٹھ کر لڑتے تھے۔ سنگِ یشب اور کوڑی کو مقدّس مانتے تھے۔

چَو خاندان کے عہد (۱۱۲۲ء — ۲۵۵ء (ق م) کو لوہے کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح میں لوہے کی تلواریں بنانے لگے جنھیں اِبتداء میں جادُو کے ہتھیار کہا جاتا تھا۔ تاریخ عالم میں سب سے پہلے اہلِ چین نے معدنی کوئلے کو دہکا کر لوہے کو ڈھالنے کا ہُنر ایجاد کیا اِس دَور کا نظامِ سلطنت جاگیر دارانہ تھا۔ مُلک مختلف بڑی بڑی جاگیروں میں مُنقسم تھا جن پر سردار حکومت کرتے تھے اور بوقت ضرورت اپنی اپنی فوج لے کر شہنشاہ کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے تھے۔ جنگی غلاموں کو قتل کرنے کی بجائے اب اُن سے گھروں اور کھیتوں میں کام لینے کا رواج ہو گیا تھا۔

تسین[ؔ۱] خاندان نے ۲۵۵ء (ق م) میں چَو خانوادے کا خاتمہ کر دیا اور

[ؔ۱] لفظ چین اِسی تسین کی بدلی ہوئی صورت ہے چین کو عرب صاحین اور ایران ماچین کہتے تھے۔ روسیوں نے اُسے خطا کا نام دیا جو مُغلوں کے ایک خاندان کِتائی سے یادگار ہے۔

شاہ شی ہوانگ تی نے سارے چین کو متحد کیا اِس لئے بجا طور پر اُسے چین کا سب سے پہلا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ شی ہوانگ تی نہایت حوصلہ مند اور بیدار مغز تھا اُس نے عظیم چین کے تصور کی بنیاد رکھی اور تاتاریوں اور مغلوں کے حملوں سے بچاؤ کے لئے شہرۂ آفاق دیوارِ چین تعمیر کرائی۔ اُس کی موت پر تسین خاندان پر زوال آگیا اور ہین خاندان نے تخت و تاج پر قبضہ کرلیا۔ ہین سلاطین زبردست منتظم اور فاتح تھے۔ انہوں نے مُلک کی سرحدوں کو وسیع کیا اور نظم و نسق کو از سرِ نو محکم کیا جس سے مُلک میں ہر کہیں خوشحالی کا دَور دَورہ ہوگیا اور چین کی سرحدیں ترکستان سے مِل گئیں۔ چھٹی صدی (ق م) میں شہنشاہت نقطۂ عروج کو پہنچ گئی۔ تانگ بادشاہوں نے مزید فتوحات کیں اور چین کی سرحدیں آج کل کے چین کبیر کی سرحدیں بن گئیں۔ تانگ کے بعد پانچ مختلف خاندان حکومت کرتے رہے جن کے خاتمے پر سُونگ برسرِ اقتدار آگئے۔

۱۲۷۶ء میں چنگیزی مغلوں نے تاخت و تاراج کا آغاز کیا اور شاہ چین کو شکست دے کر مُلک پر قبضہ کرلیا۔ چنگیز کا پوتا قبلائی خان پہلا مغل شہنشاہ تھا۔ ۱۳۶۷ء منگ خاندان کے ایک شہزادے نے مغلوں کے تسلّط کا خاتمہ کردیا اور مملکت کی باگ ڈور دوبارہ چینیوں نے سنبھالی۔ ۱۶۴۳ء میں چنگ یا مانچو کے بیرونی خاندان کا تسلّط ہوگیا جو جمہوریہ کے ۱۹۱۱ء کے انقلاب تک حکمران رہا۔ ۱۹۴۹ء میں چیرمین ماوزے تنگ کی سرکردگی میں اشتمالی انقلاب برپا ہوا اور مُلک بھر میں اشتمالی معاشرہ قائم کردیا گیا۔

نظریاتی لحاظ سے شہنشاہ کو آسمانی حقوق حاصل تھے۔ وہ زمین پر آسمان کا نمائندہ تھا۔ اور اپنے آپ کو تسی ان تسی (فرزندِ آسمان) کہتا تھا۔ رعایا اُس کے سامنے سربسجود ہونا مذہبی فرض سمجھتی تھی۔ اِس سجدے کو "کوٹو" کہتے تھے۔

بادشاہ فراعینِ مصر کی طرح ملک کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بھی تھا۔ اُس کے احکام قطعی اور ناقابلِ تغیر تھے لیکن اِس مطلق العنانی کو صدیوں کی رسوم و روایات نے بڑی حد تک محدود کر دیا تھا۔ چنانچہ بعض حالات میں بادشاہ کو معزول بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایک چینی مورّخ لکھتا ہے۔

"سلطنت بادشاہ کے پاس آسمان کی طرف سے بطور امانت کے ہے۔ بادشاہ صحیح طریقے سے حکومت نہ کرے تو عوام کو اِس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اُس کے خلاف بغاوت کر دیں "

اُنیسویں صدی میں انگریز چین میں افیم لائے اور چینیوں کو بزورِ شمشیر اسے کھانے پر مجبور کیا۔ ۱۸۳۸ء میں افیم کی درآمد پر پابندی لگائی گئی تو انگریزوں نے چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اِسے "افیم کی پہلی جنگ" کہتے ہیں اِس کشمکش میں چین میں جمہوریت کو تقویت بہم پہنچی۔ جب جمہوری تحریک زور پکڑ گئی تو شہنشاہِ چین نے تخت و تاج سے دست برداری کا اعلان کر دیا۔ متولّی شہزادے نے جو فرمان جاری کیا وہ حقیقت پسندی اور جمہور نوازی کا ایک عمدہ نمونہ ہے فرمان میں کہا گیا۔

"آج شہنشاہتِ چین کے سب لوگ جمہوریہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ خُدا کی مشیت ظاہر ہوگئی اور لوگوں کی خواہشات عیاں ہوگئیں۔ میں اپنی اور اپنے خاندان کی عزت کو بحال رکھنے کے لئے کس طرح کروروں عوام کی خواہش کی مخالفت کر سکتا ہوں لہٰذا میں نے اور شہنشاہ نے فیصلہ کیا ہے کہ چین کی آئندہ حکومت آئینی جمہوری ہوگی تاکہ اِس سے عوام کے جذبات آسودہ ہوں۔ یہ فیصلہ قدیم زمانے کے اُن دانشمندوں کے خیال کے مطابق ہوگا جو تاج و تخت کو عوام کی میراث سمجھتے تھے۔"

چینی شہنشاہوں کی روشن خیالی کی ایک اور مثال تائی تسونگ (۶۲۷-۶۵۰ء

بام) کی ہے جس کا شمار دنیا کے عظیم ترین سلاطین میں ہوتا ہے۔ جب اسے وزیروں نے کہا کہ جرائم کے انسداد کیلئے سخت عبرت ناک سزائیں دی جائیں تو اُس نے جواب دیا۔

"سخت سزاؤں کی بجائے اگر میں حکومت کے اخراجات کم کردوں، محصولات گھٹا دوں، صرف دیانت دار حکام کا تقرر کروں تاکہ عوام کو تن ڈھانپنے کے لیئے کپڑا بستر آسکے تو جرائم کے کم ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔"

قدیم چینی نظامِ مملکت پر تبصرہ کرتے ہوئے مرد وخ لکھتا ہے۔

"اُس زمانے میں چین کا شمار دُنیا کے مہذب ترین ممالک میں ہوتا تھا۔ فوجی طاقت علوم وفنون کی ترقی اور نظم ونسق کے لحاظ سے وہ دُنیا کا بہترین مُلک تھا۔ تاریخِ عالم میں اِس سے زیادہ درخشاں دَور اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

آرتھر والی کہتا ہے "تانگ خاندان کے دورِ حکومت میں چین بلا شبہ دُنیا کا عظیم ترین اور متمدن ترین مُلک تھا" اہلِ مغرب نے اٹھارھویں صدی میں چین کی تاریخ و تمدن سے دلچسپی لینا شروع کی جب فرانس میں تحریک خرد افروزی برپا ہوئی۔ فرانس کا مشہور قاموسی دیدرو لکھتا ہے۔

"چین کے باشندے قدامت، آرٹ، عقلیت اور دانش وحکمت میں تمام ایشیائیوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ بعض اہلِ قلم کے خیال میں ان پہلوؤں سے وہ یورپ کی مہذب ترین اقوام پر بھی برتری رکھتے ہیں۔"

والٹیر نے بھی شہنشاہیت چین کے نظم ونسق کو تمام اقوامِ عالم میں "بہترین" کہا ہے۔

شاہی رنگ زرد تھا۔ اور اژدھا شہنشاہیت کی علامت تھا۔ شہنشاہ اژدھے کی شکل کے تخت پر بیٹھتا تھا اور زرد رنگ کا ریشمی لباس پہنتا تھا۔ سلطنت کا انتظام وزراء اور اہل کاروں کے ہاتھوں میں تھا جنہیں مقابلے کے امتحانوں میں منتخب

کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ عہدوں پر وہی لوگ فائز ہوتے تھے جن کی دیانت داری اور قابلیت مسلّم ہوتی تھی۔ رشوت خوری اور بددیانتی کی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ بددیانتی ثابت ہو جانے پر مجرم کو بال بچے سمیت موت کی سزا دی جاتی تھی اور املاک ضبط کرلی جاتی تھی۔ دوسری قدیم اقوام کی طرح حکومت کے عہدے روساء اور نجباء تک محدود نہیں تھے۔ معاشرے میں ہر لحاظ سے مکمل مساوات تھی اور تعلیم کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے تھے۔ مقابلے کے امتحان میں ہر ہنر اور پیشہ کا شخص شریک ہو سکتا تھا۔ یہ امتحان ایک کڑی آزمائش کا درجہ رکھتا تھا کیوں کہ علمی قابلیت کے ساتھ ساتھ ذاتی اوصاف، قوتِ فیصلہ، حاضر دماغی اور پیش رفت کی صلاحیت کو بھی جانچا جاتا تھا۔ اِس طرح ان امتحانوں میں صرف ممتاز اوصاف اور نمایاں قابلیت کے لوگ ہی منتخب ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خانہ جنگیوں اور سیاسی انقلابات کے باوجود مملکت کے نظم و نسق میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ پرچہ نویس شہنشاہ کی ذاتی خامیوں اور لغزشوں کا ذکر بھی بلا کم و کاست کر دیا کرتے تھے جس کے لئے بعض اوقات انہیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ محتسب بے باک اور معتمد تھے اور اہل کاروں کے بارے میں براہِ راست شہنشاہ کو پرچے بھیجتے تھے۔ وہ بتاتے کہ عوام کی مشکلات کیا ہیں اور انہیں دُور کرنے کا کوئی سامان کیا گیا ہے کہ نہیں۔ یہ لوگ فرض ناشناس اور بددیانت اہل کاروں کے لئے بلائے بے درماں سے کم نہ تھے۔ یہی حال سرکاری مورخین کا تھا جو تمام واقعات کو مِن و عَن قلم بند کر لیتے تھے اور کسی خطرے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اِسی سبب اعلیٰ کردار و شخصیت کو ہر کہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آخری سونگ بادشاہ کے زمانے میں تاتاریوں نے یلغار کی اور مار دھاڑ کرتے ہوئے پایۂ تخت کے قریب پہنچ گئے۔ چینی سپہ سالار یوفی تھیے نے مردانہ وار ان کا ڈٹ کر مقابلہ

گیا۔ بد قسمتی سے بادشاہ ایک کوتاہ ہمت وزیر چِن کوای کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بن کر رہ گیا تھا۔ یہ شخص درپردہ تاتاریوں سے ساز باز کر رہا تھا چنانچہ اس نے یوفی اے کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے اور اُسے میدانِ جنگ سے دربار میں طلب کر لیا۔ جب بہادر یوفی اے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوا تو پابندِ سلاسل کر کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ جہاں چِن کوای نے چُپکے سے اسے مروا ڈالا۔ عوام یوفی اے کی دردناک موت سے بے حد متاثر ہوئے اور اُس کی وطن دوستی کی دادیوں دی کہ اُس کے بُت بنا کر گھر گھر پُوجنے لگے۔ چِن کوای کو بزدلی اور غداری کی سزا یوں ملی کہ لوگوں نے اگال دان کا نام چِن کوای رکھ دیا جس میں حقارت سے تھوکتے تھے۔

چین قدیم کا ابتدائی مذہب آبا پرستی پر مبنی تھا۔ ۱۹۰۰ (ق م) تک کے آبا کی فہرستیں اور شجرے دستیاب ہوئے ہیں جنہیں لوگ سینت سینت کر رکھتے تھے۔ بعد میں تین بڑے بڑے مذاہب صُورت پذیر ہوئے۔

۱۔ تاؤمت ("تاؤ" کا صحیح تلفظ "داؤ" ہے) جس کا بانی لاؤتسے تھا۔

۲۔ کنفیوشس کا مسلک جسے مذہب کی بجائے دستورِ عمل کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ خاندان، احباب اور حکومت کی طرف صحیح طرزِ عمل کی تلقین کرتا تھا۔

۳۔ بُدھ مت جو ہندوستان سے آیا۔ یہ مہایانا بُدھ فرقہ تھا جس میں بے شمار دیوتاؤں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ اور جس میں ہندومت کے عقاید و توہمات تناسخِ ارواح وغیرہ نفوذ کر گئے تھے۔ بعد میں کہیں کہیں اسلام کی اشاعت بھی ہوئی۔

چین کے مذاہب کا ذکر کرتے ہوئے اِس بات کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے کہ چینی حشر و نشر یا حیات بعد ممات کے کسی زمانے میں بھی قائل نہیں تھے۔ نہ اُن کے مذہب کا کوئی نظامِ عبادت تھا۔ وہ دُنیوی زندگی سے حظ اندوز ہونے ہی کو اپنا

مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔ اُن کے لئے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ انسان موت کے بعد کی زندگی کی خاطر اِس زندگی کی مسرتوں سے دست کش ہو جائے۔ مُروّجہ مفہوم میں حیات بعد ممات کا تصوّر مذہب کا سنگِ بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ ہندو مت، یہودیت، مزدائیت عیسائیت اور اِسلام میں رُوح کی بقا اور حیات بعد ممات کا عقیدہ بُنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن چین میں اِسے کبھی بھی درخورِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔ اِس لئے تاؤمت اور کنفیوشس کے مسلک کو مذہب کی بجائے دستورِ حیات یا دستورِ عمل کہنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا۔ مروّجہ مذاہب کے برعکس اہلِ چین اخلاق کو مذہب کا جزوِ لازم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اِس بات پر حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ کسی خُدا یا دیوتا کے حُکم کے بغیر کیوں انسان ایک دوسرے سے حُسنِ سلوک روا نہیں رکھ سکتے۔ اُن کے خیال میں انسان کو دُوسروں کی بھلائی اِس لئے کرنی چاہیئے کہ وہ بھی اُسی طرح کے انسان ہیں نہ اِس لئے کہ اِس کا معاوضہ مرنے کے بعد بہشت کی صورت میں مِلے گا۔ اِس طرح وہ اخلاق کو مذہب سے علیحدہ ایک مُستقل بالذات طریقۂ عمل سمجھتے تھے۔ یہ باتیں لاؤتسے اور کنفیوشس کی تعلیمات کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں۔ بُدھ مت کی اشاعت کے بعد اِن مذاہب میں بھی رواجی مذہب کا رنگ پیدا ہوگیا۔ بُدھ مت کی اشاعت کے بعد بُتوں کی پُوجا بھی ہونے لگی لیکن اہلِ چین بُتوں کے ساتھ اندھی عقیدت نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً قحط پڑنے پر وہ بُتوں کے گلوں میں رسیاں باندھ کر انہیں کُوچہ و بازار میں گھسیٹتے پھرتے کہ وقت پر بارش کیوں نہیں برسائی، اُنہیں گالیاں دیتے اور گھُورے پر پھینک دیتے۔

تاؤمت کی اشاعت سے پہلے دوسری اقوام کی طرح اہلِ چین کی بھی دیو مالا تھی۔ تکوین و تخلیق کی چینی کہانی یہ تھی کہ ابتدا میں ہر کہیں انتشار اور فساد تھا جس سے دو قوتیں نمودار ہوئیں: یانگ اور ین جو مِل کر محیطِ کُل بناتی ہیں۔ یانگ

آسمان، روشنی، گرمی، حرکت اور تذکیر کا اُصول ہے جب کہ ین ارض، تاریکی، سکون، خنکی اور تانیث کا اُصول ہے۔ ان کے باہمی ربط کو ایک دائرے کی صورت میں دکھاتے تھے جس میں سفیدی اور سیاہی باہم پیوستہ ہیں اور جس کی شکل تھی ۔ اِس علامتی دائرے کو چین قدیم میں وہی مقام حاصل تھا جو بودھوں کے چکر، آریاؤں کے سواستکا اور عیسائیوں کی صلیب کو میسّر تھا۔ بعد میں یہ علامت فنی تزئین و آرائش کا نشان بن گئی۔ بہرحال عرصہ دراز کے بعد یانگ اور ین سے ایک انسان نے جنم لیا جس کا نام پان کُو تھا۔ وہ کرۂ ارض بنا اُس نے سُورج، چاند اور ستاروں کو بنایا، وہ بڑھتا گیا اور بدلتا گیا حتّٰی کہ اُس کا سر پہاڑوں کی صُورت اختیار کر گیا۔ اُس کا سانس بادل بنا، اُس کی آواز رعد بنی، اُس کی نسیں دریا بن گئیں، اُس کی جلد اور بال جنگل بنے، اُس کے دانت اور ہڈیاں وہ معدنیات بنیں جو زیرِ زمین دفن ہیں، اُس کا پسینہ بارش بنا اور جو کیڑے اُس کے جسم پر رینگتے تھے وہ اِنسان بن گئے۔ تخلیق کے اِس کام میں ایک اژدہے، ایک عنقا اور ایک کچھوے نے اُس کی مدد کی۔ چنانچہ اژدہا شہنشاہیت کی علامت بن گیا۔ ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے پہلے چینی پھریرے پر زرد زمین میں سیاہ اژدہے کی شبیہہ ہوتی تھی۔ چینیوں کا خداوند خُدا شانگ تی تھا جو آسمان کا خدا تھا اور چینی الہیات کا شخصی خُدا تھا۔ تاؤ کو وہ سریانی قوّت کی صورت میں مانتے تھے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ تاؤ ہر شے میں سمایا ہوا ہے اور اُسے گھیرے ہوئے ہے تاؤ تنہا ہے، غیر متغیّر ہے۔ نہ اُسے دیکھا جا سکتا ہے نہ اُس کی آواز کو سنا جا سکتا ہے۔ تاؤ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے لیکن وہ خود کوئی چیز نہیں ہے، نہ وہ عرض ہے نہ جوہر ہے۔ تاؤ غیر محدود ہے۔ نظامِ سماوی اور نوعِ انسان کا اخلاقی عمل ایک ہی نوع کے افعال ہیں۔ اِسی وحدت کو تاؤ سے لغوی معنیٰ ہے شاہراہ۔ یا آسمانی راستہ کہتے تھے۔ لاؤ تسے (پیدائش ۶۰۷ ق م) نے اِسی تصوّر پر اپنے مسلک کی بُنیاد رکھی تھی۔ اُس نے کہا کہ تفکّر و تدبّر بے سُود ہے اور فائدے سے زیادہ نقصان

کا باعث ہوتا ہے۔ تاؤ اُس وقت ملتا ہے جب غور و فکر کو خیر باد کہہ کر زاویہ نشینی کی زندگی گذاری جائے۔ علم سے خرد و دانش نہیں آتی، دانش امن و سکون اور عافیت کی زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ اِس پہلو سے تاؤ عرفان و تصوّف کا مسلک ہے۔ نظریاتی اور عملی لحاظ سے تاؤ مت ایک قسم کا لا اُبالیانہ پن ہے۔ جس کی رُو سے اِنسانی ادارے، قوانین، حکومت، شادی بیاہ وغیرہ سب بے مصرف اور لاحاصل ہیں۔ تاؤ مت میں مثابت کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ نظریہ منفی ہے اور فرار کی ترغیب دیتا ہے۔ اِس کے پیرو پہاڑوں کی کھوہوں میں دنیوی ہنگاموں سے دُور خلوت اور عزلت کی زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتے تھے اور ترکِ علائق کی تلقین کرتے تھے۔ لاؤتسے کا قول ہے "وہ جو جانتا ہے وہ بولتا نہیں اور جو بولتا ہے وہ جانتا نہیں"۔ اس منفی نظریے نے بُدھ مت کے ساتھ مل کر چینی معاشرے کو تنزّل پذیر کر دیا۔ بُدھ کی طرح دوسری صدی بعد از مسیح میں لاؤتسے کو بھی خدا تسلیم کر لیا گیا اور اس کے ساتھ متعدّد دیوتاؤں اور شیطانوں کا اضافہ کر دیا گیا۔

جس طرح قدیم چینی مذہب میں حشر نشر اور حیات بعد ممات کے عقائد کو درخورِ توجہ نہیں سمجھا گیا اِسی طرح چینی فلسفے میں منطق اور مابعد الطبیعیات سے اعتنا نہیں کیا گیا۔ چینی فلسفہ سراسر عملی اور اِفادی تھا۔ چینی فلاسفہ نے حقیقت کبریٰ کی ماہیت پر کبھی بحث نہیں کی نہ ارسطو، کانٹ اور ہیگل کی طرح کسی قسم کا نظامِ فکر ہی پیش کیا۔ ان کا فلسفۂ عملی انسان دوستی پر مبنی تھا۔ وہ صرف انسانی علائق اور قدروں سے بحث کرتے تھے۔ اُن کی فلسفیانہ جستجو کا اصل مقصد یہ تھا کہ زندگی کو احسن طریقے سے گذارنے کے وسائل اختیار کئے جائیں۔ انہیں اِس بات سے بحث نہیں تھی کہ انسان کہاں سے آیا ہے اور موت کے بعد کدھر جائے گا۔ وہ اِس دنیا کی زندگی کو خوش آئند بنانے کے طریقوں پر غور کرتے تھے۔ انہیں عقلیّت پسند نہیں

کہا جاسکتا یعنی وہ نظامِ کائنات کو عقلیاتی نظام بنانے پر اصرار نہیں کرتے بلکہ دانش و خرد کے حصول کی دعوت دیتے تھے اور دانش کا تقاضائے اولین اُن کے خیال میں یہی ہے کہ اِس زندگی کی مسرّتوں سے پوری طرح حظ اندوز ہوا جائے۔ اُن کے ہاں یہ بات ناقابل فہم تھی کہ انسان کسی بھی صورت میں زندگی کی مسرّتوں سے دست کش ہو جائے۔ اُن کے فلسفے کے اصل اصول دو تھے ۱۔ معقولیّت ۲۔ میانہ روی۔ کنفیوشس کو چین قدیم کا سب سے بڑا مفکّر مانا جاتا تھا۔ اُس نے مغرب کے فلاسفہ کی طرح کوئی ایسا نظامِ فلسفہ مُرتّب نہیں کیا جس میں اِلٰہیات، منطق، سیاسیات، اخلاقیات اور جمالیات کو ایک ہی مرکزی خیال کے تحت مُنضبط کیا گیا ہو۔ اُس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے شاگردوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ معقول اور مربُوط طریقے سے مُعاشرے کے مسائل پر سوچ سکیں اور صفائی سے اظہارِ خیال کر سکیں۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ ذہنی پراگندگی کو دُور کر کے لوگوں میں زندگی کے مسائل کا صحیح شعور پیدا کیا جائے لن یوٹانگ مغربی اور چینی فلسفے کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[۱]

"چین میں کوئی نظامِ فلسفہ نہیں ہے نہ کوئی منطقی اصولِ استدلال ہے نہ فلسفے کی اصطلاحات ہیں نہ مابعدالطبیعیات کی مُوشگافیاں ہیں۔ اُن کا فلسفہ عملی ہے یعنی زندگی کو کس طرح احسن طریقے سے گذارا جائے۔ وہ مغربی فلسفے کو فلسفہ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اُن کے خیال میں اس کا زندگی سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہے اور محض چند نظریات پر مشتمل ہے۔ وہ فلسفے کو زندگی سے جُدا نہیں سمجھتے اور فلسفہ پڑھتے نہیں بلکہ فلسفہ بسر کرتے ہیں۔ مغرب میں فلسفے کے پروفیسر ضرور ہیں لیکن چینی مفہوم میں ایک بھی فلسفی نہیں ہے۔"

---

[۱] YUTANG, LIN.: WISDOM OF INDIA AND CHINA.

یونٹزے چین کا پہلا فلسفی تھا لیکن قدما میں جو عظمت اور شہرت کنفیوشس کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے کے حصّے میں نہیں آسکی۔ کنفیوشس (اصل نام: کنگ فو تسے) ۵۵۱ ق م میں پیدا ہوا۔ وہ سخت بدصورت تھا۔ اُس نے اُنیس برس کی عمر میں شادی کی۔ چار برس کے بعد بیوی کو طلاق دے دی اور باقی ماندہ عمر تجرّد کی حالت میں گذار دی۔ اُسے الٰہیات میں کوئی دلچسپی نہ تھی نہ اس موضوع پر وہ بات کرنا پسند کرتا تھا۔ اس لئے بُدھ کی طرح اصطلاح میں اسے لاادری کہا جا سکتا ہے۔ اُس کی کوئی مابعدالطبیعیات تھی تو وہ یہ تھی کہ وہ ظواہر میں توافق و اتحاد کی دعوت دیتا تھا اور کہا کرتا تھا "مجھے ہمہ گیر اتحاد کی جستجو ہے۔ اس کی تعلیمات کا اصول "سنہری میانہ روی" تھا۔ اُس نے تعلیم یافتہ فلسفی اہل کاروں کی ایک جماعت تیار کی جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے اور اس طرح گویا افلاطون کے خواب کی تعبیر پلیش کی۔ پچپن برس کی عمر میں وہ ایک ایسے حاکم کی تلاش میں نکلا جو اُس کے بتائے ہوئے اُصولوں کے مطابق حکمرانی کے فرائض انجام دے لیکن اِس تلاش میں اُسے ناکامی ہوئی۔ بہر حال اُس کے مسلک کو سرکاری لحاظ سے ہمیشہ تاؤمت اور بُدھ مت پر فوقیت حاصل رہی۔ کنفیوشس لاؤتسے کی طرح اِس بات کی تلقین نہیں کرتا تھا کہ برائی کا جواب نیکی سے دو۔ اُس کے ایک شاگرد نے پوچھا "آپ کا خیال کیا ہے؟ برائی کے عوض نیکی کرنا چاہیئے؟" اُس نے جواب دیا "پھر نیکی کے عوض کیا کروگے؟ برائی کے بدلے میں عدل کرو اور نیکی کا جواب نیکی سے دو!"

کنفیوشس نے اچھی حکومت کے تین لوازم قرار دیئے: خوراک کی افراط، فوجی سازوسامان کی فراہمی، اور حاکم پر عوام کا اعتماد۔ ایک شخص نے پوچھا "ان میں سے کسی ایک کو چھوڑنا پڑے تو کسے چھوڑیں"۔ جواب دیا "فوجی سازوسامان کو" سائل نے پھر پوچھا "اگر باقی دو میں سے کسی ایک کو ترک کرنا پڑے تو؟" وہ بولا "خوراک

کو ترک کردو - مرنا تو ایک دن ہے ہی لیکن جب حاکم پر سے اعتماد اُٹھ جائے گا تو مملکت تباہ ہو جائے گی۔" اُس کے خیال میں حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو کیوں کہ عوام ہمیشہ حکام کی تقلید کرتے ہیں، حاکم کا اخلاق اچھا ہو گا تو عوام کے اخلاق پہ صالح اثر پڑے گا۔ کنفیوشس فطرتِ انسانی کا بہت بڑا مُبصر تھا اور کہا کرتا تھا "میں نے ایک بھی شخص ایسا نہیں دیکھا جو نیکی کا بھی اتنا ہی خواہاں ہو جتنا کہ وہ حُسن و جمال کا شیدائی ہوتا ہے" اُس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ تھا کہ مناسب تربیت سے انسان کی مخفی تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ اِس لئے ہم اُس کے مسلک کو رجائی کہیں گے۔

ہَین خاندان کے عروج سے لے کر مانچوؤں کے زوال تک یعنی دو ہزار برس تک کنفیوشس کی تعلیمات چینیوں کے ذہن و قلب پر حاوی رہیں۔ اُس کے اقوال اور تحریریں نصابِ تعلیم میں شامل تھیں۔ نتیجتہً اِس دانش مند کی تعلیمات لوگوں کے مزاجِ عقلی میں نفوذ کر گئیں اور اُنہوں نے ایک ایسی مستحکم تہذیب کو جنم دیا جس نے مُلک کو صدیوں تک خلفشار و انتشار سے محفوظ رکھا۔ چینی دستورِ کنفیوشس کو مذہبی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ اِس دستور میں تین نظموں کے مجموعے ہیں اور چار نثر کی کتابیں ہیں جو کنفیوشس اور اُس کے شاگرد سن سی اس کے سوانح، خیالات اور آراء پر مشتمل ہیں۔ چینی طلبہ اور عُلماء ان کتابوں کے ایک ایک لفظ کو حفظ کر لیا کرتے تھے۔

فلاسفہ میں یانگ چُو نے کنفیوشس کے افکار پر سخت نقد لکھا۔ اُس نے کہا کہ انسانی زندگی دُکھ بھری ہے۔ انسان کا مقصدِ حیات حصولِ لذّت ہونا چاہیئے۔ وہ خُدا اور حیات بعد ممات کا مُنکر تھا اور کہتا تھا کہ انسان فطری قوتوں کے ہاتھوں میں محض ایک بے جان کھلونا ہے، عقلمند وہ ہے جو اپنے مقدّر کو قبول کرے۔ کنفیوشس نے جس فطری نیکی، ہمہ گیر محبت اور نیکوکاری کا ذکر کیا ہے وہ یانگ چُو کے خیال میں احمقانہ ہرزہ سرائی ہے۔ وہ کہتا

ہے کہ اخلاق دھوکا ہے جو چالاک اور عیّار لوگوں نے نادانوں کو دے رکھا ہے۔ ہمہ گیر محبت کا خیال محض ایک واہمہ ہے ، زندگی کا اصل قانون ہمہ گیر نفرت اور بُغض و عناد ہے۔ موت کے بعد کی نیک نامی سے کیا حاصل ہوگا ، زندگی میں اچھے بھی بروں کی طرح دُکھ جھیلتے ہیں بلکہ بُرے لوگ اچھے لوگوں سے زیادہ زندگی کے لذائذ سے بہرہ یاب ہوتے ہیں صرف احمق ہی کنفیوشس کی طرح اخلاق کے چکر میں پڑتے ہیں۔ اہلِ دانش دُنیا کی مسرتیں اِمکانی حد تک سمیٹتے ہیں۔

کنفیوشس کے پیرو من سی اس (۳۷۲-۲۸۹ ق م) نے یانگ چو کی لذتیت کی تردید میں قلم اُٹھایا۔ وہ افلاطون اور ارسطو کا معاصر تھا۔ اُس کا اصل نام مانگ کو تھا۔ اہلِ چین اُسے کنفیوشس کے بعد سب سے بڑا فلسفی سمجھتے تھے۔ من سی اس اُستاد کی طرح حقیقت پسند تھا۔ اُس کا ایک قول مشہور ہے "انسان کی بُنیادی خواہشات دو ہیں، عورت اور خوراک۔ والٹیر کی طرح من سی اس شخصی حکومت کو جمہوریت پر ترجیح دیتا تھا۔ والٹیر کا یہ خیال اُسی سے ماخوذ ہے کہ جمہوریت میں بے شمار اشخاص کی تربیت کرنا پڑتی ہے جب کہ شخصی حکومت میں بادشاہ کی تربیت کرنا کافی ہے۔ من سی اس کی تعلیمات کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک ہے ، غلط تربیت اور نامساعد حالات اُسے بُرا بنا دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرے کی اُلجھنیں اور بُرائیاں انسانوں کی بُری فطرت کے باعث پیدا نہیں ہوتیں بلکہ بُری حکومت اُنہیں پیدا کرتی ہے اِس لئے حکومت کی باگ ڈور فلاسفہ کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اُس کا یہ نظریہ بڑا مقبول ہوا کہ جس حاکم کے خلاف عوام نفرت کا اظہار کریں اُسے معزول کر دینا چاہیئے۔ اُس کا ہم قوم ہمسون تسے کہتا ہے کہ انسان فطرتاً بُرا ہے جو نیکی اُس میں دکھائی دیتی ہے وہ تعلیم و تربیت اور سیاسی اِداروں کی پیداوار ہے۔ انسان میں جلبِ منفعت کی خواہش پیدائشی ہے۔ اِس کے برعکس من سی اس کا عقیدہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک ہے ، بُرا ماحول اُسے بُرا بنا دیتا ہے۔

کنفیوشس کا ایک اور نامور پیرو چوہسی تھا جس نے اُستاد کی تعلیمات کو ایک باقاعدہ

نظامِ فکر کی صورت میں مرتّب کر دیا اور بوڑھوں اور تاؤمت والوں کی مردم بیزاری کے خلاف تعلیم دی۔ چو ہسی حقیقت کو دوگونہ قرار دیتا ہے۔ اس دوئی کے عناصرِ ترکیبی وہی ہیں جو قدیم چینی مذہب کے تھے یعنی یانگ اور ین یا حرکت و سکون جو مذکر و مونث کی طرح باہم ممزوج ہوتے ہیں اور عناصرِ خمسہ پر اثر انداز ہو کر اشیاء کی تخلیق کرتے ہیں۔ اِن کے ساتھ لی (قانون) اور چی (مادہ) اپنے تعاون سے تمام اشیاء کو صورت شکل عطا کرتے ہیں اور اُن میں ربط و نظم کو برقرار رکھتے ہیں۔ تمام اشیاء اور اُن کی تکوین پہ تائی چی یا وجودِ مطلق متصرّف ہے۔ چو ہسی نے تائی چی کو نئی ان یا راسخ العقیدہ پیروانِ کنفیوشس کے "آسمان" کے مترادف قرار دیا۔ چو ہسی شخصی خُدا کا منکر تھا اور خُدا کا تصوّر ایک عقلیاتی عمل کی صورت میں کرتا تھا۔ اُس نے کہا کہ فطرت محض قانون ہے اور کائنات کا قانون ہی اخلاقیات اور سیاسیات کا قانون بھی ہے یہ کہہ کر اُس نے روم کے رواقیئین کی پیش قیاسی کی۔ وہ کہتا ہے کہ فطری قوانین کے ساتھ موافقت پیدا کرنا ہی حُسنِ اخلاق ہے اور اخلاقی اُصولوں کی روشنی میں مملکت کا نظم و نسق کرنا ہی اعلیٰ سیاستدان کا کام ہے۔ فطرت بنیادی طور پر نیک نہاد ہے اور انسان فطرتاً نیک ہے۔ فطرت کی پیروی کرنے میں امن، سلامتی اور دانش کا راز مخفی ہے۔ انسان کی جبلتیں مادے (چی) سے متفرع ہوئی ہیں اس لئے اِن کو لی (قانون) کے تابع رکھنا چاہیئے۔

ہمارے زمانے میں چیر مین ماوزے تنگ اور ان کے پیروؤں نے کنفیوشس کے مسلک پر کڑی گرفت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کنفیوشس نے روساء اور اُمراء کے طبقے کی حمایت کی تھی اور وہ عوام کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اُن کے خیال میں کنفیوشس کا ہمہ گیر محبت کا درس گمراہ کُن ہے۔ اِس کا مطلب تو یہ ہوا کہ استحصالی طبقے سے بھی محبت کی جائے۔ انسان دوستی کا یہ تصوّر غلط ہے کیوں کہ ظالم سے نفرت اور ظلم کا استیصال کئے بغیر انسان دوستی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

چینی فلاسفہ کی اکثریت حقیقت پسند تھی۔ مثالیت پسندی کا رجحان بدھ مت کے ساتھ آیا چنانچہ ایک بودھ فلسفی وانگ یانگ کہتا ہے کہ چو ہسی کی غلطی یہ تھی کہ اس نے خارجی کائنات کے مشاہدے سے اپنے فکر و نظر کا آغاز کیا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اپنے من میں ڈوب کر صداقت کی جستجو کرتا جیسا کہ ہندوؤں کا شیوہ ہے کیوں کہ ان کے خیال میں ذہنِ انسانی سے الگ کائنات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن مثالیت پسندی کا یہ رجحان چین میں پنپ نہ سکا۔

اہلِ مغرب میں والٹیر، اور لائب نٹز نے خاص طور پر چینی فلسفے کی عظمت کا دل کھول کر اعتراف کیا۔ والٹیر کہتا ہے "میں نے کنفیوشس کی کتابوں کو نظرِ غور سے دیکھا ہے اور ان سے اقتباسات بھی لئے ہیں میں نے ان میں پاکیزہ ترین اخلاق پایا جس میں ہمارے ہاں کے ریاکاروں کی ظاہرداری کا شائبہ تک نہیں ہے۔ لائب نٹز نے مشرق و مغرب کے فلسفوں میں ربط و تعلق پیدا کرنے کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ اہلِ مغرب کو اخلاقی پستی سے بچانے کے لیے چین کے مفکرین کو یورپ میں مدعو کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ انھیں مقاصدِ حیات سے آگاہ کر سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ اگر کسی دانشمند کو اقوامِ عالم کی نیکی جانچنے کے لیے منصف مقرر کیا جائے تو وہ اپنی رائے لامحالہ چینیوں کے حق میں دے گا۔

چینی رسمِ تحریر کی ایجاد کم و بیش ۱۵۰۰ (ق م) میں عمل میں آئی تھی۔ یہ واحد رسمِ تحریر ہے جس کی بنیاد حروفِ تہجی پر نہیں رکھی گئی۔ اس رسمِ تحریر کو "خیال نگاری" کہا جا سکتا ہے یعنی چینی زبان کے الفاظ اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے کسی نہ کسی علامت، خیال یا فنی و علمی تصور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس میں کسی ایک خیال یا ایک تصور کو ایک ہی لفظ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے چینی زبان سیکھنے کے لیے عموماً تین ہزار علامتیں جاننے کی ضرورت ہے۔ اہلِ علم نے اس نوع کی تیس، چالیس

علامتوں کے لغات بنائے ہیں۔ چین میں بے شمار بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی "کوآن ہوا" تھی جسے غیر ملکی مندارین کہتے ہیں لیکن تحریر کی زبان ایک ہی ہے جس نے ملک بھر میں لسانی یکجہتی کو قائم رکھا ہے۔ چین کے ایک سرے کا عالم ہزاروں میل دور کے عالم کی تحریر کو بڑی آسانی سے پڑھ لیتا ہے۔ جاپانی زبان میں چینی کے صوتی عناصر شامل ہو گئے ہیں۔ چینی زبان دوسری زبانوں کی طرح محض مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ چینیوں کے جمالیاتی نصب العین کی ترجمانی بھی کرتی ہے۔ اہل چین خوش نویسی اور نقاشی کو ایک دوسری سے جدا نہیں سمجھتے، جس مُوقلم یا روشنائی سے لکھتے ہیں اُسی سے تصویر کشی بھی کرتے رہے ہیں۔ اِس طرح چینی رسم تحریر اور نقاشی ایک دوسری میں گھل مل گئی ہیں۔ چین میں آغازِ تاریخ ہی سے خوش نویسی کو فنونِ لطیفہ میں شمار کیا کرتے تھے۔

چین میں ٹائپ، چھاپے اور کاغذ کی ایجادات نے علوم و معارف کی اشاعت کو بڑا فروغ دیا۔ مشرقی چین میں بلاک کی چھپائی کا آغاز دسویں صدی کے اوائل میں ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے بلاک سے کاغذ کے کرنسی نوٹ چھاپے گئے۔ چھاپہ کی ایجاد تحریروں پر مُہریں ثبت کرنے کی رسم سے ہوئی چنانچہ چینی زبان میں چھاپے اور مُہر کے لئے ایک ہی لفظ ہے۔ بلاک کی چھپائی سے سُونگ عہد کی اِحیاءالعلوم کی تحریک کو بڑی تقویت بہم پہنچی اور ہر موضوع پر بے شمار کتابیں چھپنے لگیں۔ اس طرح اطالیہ سے دو سو برس پیشتر چین میں نشاۃ الثانیہ کی تحریک جنم لے چکی تھی۔ مذہبی، علمی اور ادبی کُتب کے ساتھ ساتھ لُغات اور قاموس کی ضخیم کتابوں کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ چھاپہ چینیوں کی ایسی عظیم ایجاد ہے جسے افادیت کے لحاظ سے صرف تحریر کی ایجاد ہی سے دوسرے درجے پر رکھا جا سکتا ہے۔ دُنیا کی قدیم ترین مطبوعہ کتاب ہیرا سُوتر ہے جو ایک بودھ سوامی وانگ چی نے ۱۱۔ مئی ۸۶۸ء کو چھاپی تھی۔ چین کے متعلق بجا طور پر کہا گیا ہے کہ وہ اہل علم کا ملک ہے جہاں صدیوں سے اہل علم حکومت کرتے رہے ہیں۔

کاغذ کی ایجاد بھی تاریخِ عالم میں بڑی اہم ہے چین کو اِس بات کا فخر حاصل ہے کہ اِس میں قدیم زمانے سے کاغذ کا رواج ہو گیا تھا۔ ابتدا میں توت کی چھال سے کاغذ بنایا جاتا تھا جب ہندوستان سے بودھ سوامی کپاس لائے تو روئی سے کاغذ بنانے لگے۔ لفظ 'کاغذ' چین کے لفظ 'کوکوذ' کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ روئی سے کاغذ بنانے کا طریقہ ترکستان والوں نے چینی قیدیوں سے سیکھا تھا اور سمرقند میں کاغذ کے کارخانے بھی قائم ہو گئے تھے۔ ۷۰۴ء میں سمرقند کی تسخیر کے ساتھ مسلمانوں کو روئی سے کاغذ بنانے کا راز ہاتھ آیا اور انہوں نے دمشق، حلب اور بغداد میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے۔ اطالیہ والوں نے یہ فن صقلیہ کے مسلمانوں سے سیکھا اور شدہ شدہ تمام یورپ میں اِس کا رواج ہو گیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے اہلِ چین تاریخ نگاری کو اہم سمجھتے تھے۔ اہلِ مغرب چین کو "مورخوں کی جنت" کہتے ہیں۔ دنیا کی کسی قوم میں اتنے مورخ پیدا نہیں ہوئے ہوں گے نہ کہیں اتنی سیر حاصل اور جامع تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ سرکاری مورخین اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمام واقعات بلا کم و کاست بیان کر دیتے تھے۔ انہوں نے تاریخ نگاری کو سائنس بنا دیا۔ تاریخ کے علاوہ اہلِ چین نے فلسفہ، قاموس، سیر و سوانح، فنِ طب اور فنِ زراعت پر بھی بلند پایہ کتابیں شائع کیں۔ اہلِ چین نے ریاضیات اور طبیعیات سے چنداں اعتنا نہیں کیا۔

چین کے ناقدین ادب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ادب جو حقائق کی ترجمانی کرتا ہے اور ادب جو مسرت بخشتا ہے۔ اول الذکر تشریحی اور معروضی ہے اور دوسرا موضوعی اور متغزلانہ ہے۔ وہ پہلی قسم کے ادب کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ اُن کے خیال میں اِس سے فکر و نظر کی تربیت ہوتی ہے اور لوگوں کے اخلاق پر صالح اثر پڑتا ہے۔ چین میں شاعری کے علاوہ ناول اور ناٹک کی اصناف بھی مقبول تھیں اگرچہ چینی انہیں ادبِ عالیہ میں شمار نہیں کرتے تھے۔ چینی ناولوں اور داستانوں میں قدیم اور وسطیٰ زمانوں کے معاشرے کی سچی تصویریں

دکھائی دیتی ہیں۔ پہلا ناول غالباً ۱۲ ویں صدی بعداز مسیح میں لکھا گیا تھا۔ "سان کواوچی" کا ضخیم ناول بڑا مقبول تھا۔ چینی ناٹک فی الاصل غنائیہ تھا جس میں اداکاری کی بہ نسبت موسیقی کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ چینی تھیٹر میں قدرتی مناظر کم دکھائے جاتے تھے۔ لباس البتہ بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ اداکاری کی مختلف علامات مقرر تھیں۔ جب کوئی اداکار جھکتا تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ وہ دروازے کے نیچے سے گزر رہا ہے، اُس کے ہاتھ میں جھنڈی ہوتی جس پر پہیوں کے نشان بنے ہوتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رتھ پر سوار ہے، اُس کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی جس پر گھوڑے کے بال لگے ہوتے تو اُس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کوئی فوق الطبع ہستی ہے۔ چینی سٹیج کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ پردہ نہیں گرایا جاتا تھا۔ تمثیل جاری رہتی تھی اور سٹیج کے ملازم بے تکلفی سے سامان اِدھر سے اُدھر رکھ لیتے تھے۔

اہلِ چین قدیم زمانے سے شاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ بعض شاعر صبح سویرے دس بیس نظمیں کہہ لیتے اور انہیں رنگ برنگ کے کاغذوں پر لکھ کر ایک بانس پر لٹکا لیتے اور بازار میں بیچتے پھرتے تھے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح چینی شاعری بھی فطرت پرستی کی لطیف مثالیں پیش کرتی ہے۔ اہلِ چین کا خیال تھا کہ نظم کو بے حد مختصر ہونا چاہیئے کیوں کہ وہ ایک لمحہ کے جذباتی اہتزاز کی تخلیق ہوتی ہے۔ طویل نظموں کو وہ شاعری میں شمار نہیں کرتے تھے۔ اُن کی نظم ایک ہی تاثر یا ایک ہی تمثالی پیکر پیش کرتی تھی۔ چینی نقاد شاعر کے کردار اور اُس کی نظم کے مابین گہرا اور محکم رشتہ مانتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اعلیٰ پائے کے شاعر کے لیئے اعلیٰ کردار کا مالک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ چینی شاعروں نے شاعری اور مصوّری کو ایک دوسری میں ضم کرنے کی کوشش کی۔ شاعر وانگ کے متعلق کہا گیا ہے "اُس کی ہر نظم ایک تصویر تھی اور ہر تصویر ایک نظم تھی"۔ نمونے کے بطور دو چینی نظمیں درج ذیل ہیں۔

۔" پھول کا عکس پانی میں دیکھو
اور حسینہ کا چہرہ چلمن کی تیلیوں میں سے دیکھو"

۔" جب تک میری آنکھیں ہیں
جب تک میری ٹانگیں ہیں
جہاں کہیں میں جاؤں میں کوہستانوں کا آقا ہوں
اور دریاؤں کا اور نسیم وصبا کا مالک ہوں۔"

چینی ادبیات میں چویوآن (۳۴۳ – ۲۹۰ ق م) کا شمار عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے اُس کی شاعری ہجر و فراق اور حسرت وحرماں کے پُرسوز جذبات کی نہایت موثر ترجمانی کرتی ہے۔ لی پو کو سب سے بڑا رُومانی شاعر سمجھا جاتا تھا۔ ایک چینی نقاد نے اُس کے بارے میں کہا تھا" وہ کوہ تائی کی بلند چوٹی ہے جس کے سامنے سب پہاڑ اور پہاڑیاں حقیر و صغیر ہیں۔ وہ سُورج ہے جس کے سامنے لاکھوں تارے ماند پڑ جاتے ہیں۔ لی پو کا انجام بھی رُومانی ہوا تھا۔ ایک رات وہ کشتی میں بیٹھا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ خوب پی رکھی تھی۔ سطحِ آب پر چاندنی کی جھالر جھلملا رہی تھی اور چاند کا عکس نیلگوں پانی میں لرز رہا تھا۔ لی پو نے جُھک کر چاند کے عکس کو پکڑنا چاہا۔ اُس کا پاوں رپٹا اور وہ چاند کی تلاش میں اندھیروں کو سدھار گیا۔

قدیم چینی غیر معمولی ذوقِ جمال اور اختراعی قابلیّت کے مالک تھے اور تمام فنونِ لطیفہ میں یکساں قدرت و دسترس رکھتے تھے اُن کے فنِ تعمیر میں پگوڈا کو وہی مقام حاصل ہے جو ہندوؤں کے شیکھر، بودھوں کے وہارا، یہودیوں کے ہیکل، عیسائیوں کے کلیسیا اور مسلمانوں کی مسجد کو دیا جاتا ہے یعنی وہ بہ یک وقت عبادت گاہ بھی تھا اور فنِ تعمیر کا حسین نمونہ بھی تھا۔ قصبوں اور دیہات میں ہر کہیں پگوڈے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی گھنٹیوں کی

سُریلی آواز دلوں کو موہ لیتی تھی۔

چینی اپنی عمارتوں کو اونچے چبوتروں پر تعمیر کرتے تھے۔ عمارت کہگل کی بنائی جاتی تھی اگرچہ سامنے کے حصے میں تراشے ہوئے پتھروں سے چُنائی کرنے کا رواج تھا۔ مکانوں میں لکڑی کی خوبصورت منقّش جالیاں دیواروں کا کام دیتی تھی۔ دالان ستونوں پر تعمیر کرتے تھے جنھیں شنگرفی سُرخ رنگ کیا جاتا تھا یا اُن پر شوخ رنگوں سے نقش و نگار کرتے تھے۔ چھتوں کو بھی رنگتے تھے۔ شاہی محلوں کی چھتوں اور دیواروں پر زرد رنگ کرتے تھے جو چین کا شاہی اور قومی رنگ تھا۔ چینی فنِ تعمیر کا عظیم کارنامہ دیوارِ چین ہے جس کی تعمیر تیسری صدی قبل مسیح میں شہنشاہ شی ہوانگ ٹی نے شروع کی تھی۔ یہ دیوار کم و بیش ڈیڑھ ہزار میلوں تک میدانوں، پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں میں سے گذرتی چلی گئی ہے۔ جا بجا برجوں میں فوجی چوکیاں قائم کر دی گئی تھیں۔ اس سے شہنشاہ کا مقصد مُلک کو شمال کے وحشی مغولوں کے حملوں سے بچانا تھا۔ چنانچہ جب دیوارِ چین ہنوں کی ترکتازیں میں حائل ہوئی تو انہوں نے مغرب کا رُخ کیا اور روما کی سلطنت کو تہ و بالا کر ڈالا۔ والٹیئر نے دیوارِ چین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اِس عظیم الشان تعمیری کارنامے کے آگے فراعینِ مصر کے اہرام محض ملبے کے ڈھیر دکھائی دیتے ہیں۔

چینی لکڑی اور سنگِ مرمر کے مجسّمے تراشتے تھے۔ کھنڈروں سے سیکڑوں بت جانوروں اور دیوتاؤں کے برآمد ہوئے ہیں۔ بُدھ مت کی اشاعت کے ساتھ بُت تراشی کا رواج عام ہو گیا اور چینی سنگ تراش کانسی کے مجسّمے بھی ڈھالنے لگے۔ وہ شبیہہ نگاری کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے۔ دسویں صدی عیسوی کے بنائے ہوئے مجسّمے فطرت نگاری کے خوبصورت نمونے ہیں سُونگ خاندان (۹۶۰ — ۱۲۷۹ء ب م) کے خاتمے کے ساتھ مذہبی مجسّمہ تراشی کو بھی زوال آ گیا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے چینی مُصوّری اور خُوش نویسی میں چنداں فرق نہیں کرتے تھے چینی جس مُو قلم سے لکھتے اُسی سے تصویریں بھی کھینچتے تھے۔ روشنائی کا لک، گوندا ور تیل کی آمیزش

سے بناتے تھے جو تحریر اور مُصوّری دونوں میں کام آتی تھی۔ بعد میں دوسرے رنگوں کا رواج بھی ہوگیا۔ چینی مُصوّر سایہ اور تناظر کی پروا نہیں کرتے تھے اور قُدرتی مناظر کو متوازی سطح سے نہیں بلکہ بالائی سطح سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اُن کے ہاں مُصوّری کا مقصد حقیقت کی نقاب کُشائی کرنا نہیں تھا بلکہ اسالیب کے وسیلے سے گریزاں رنگِ مزاج کی ترجمانی کرنا تھا۔ وہ ہیئت کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور اس کے لئے وہ رنگوں کی بجائے صحتِ خط کشی کا اہتمام کرتے تھے۔ چینی مُصوّروں نے کبھی بھی مُحاکات نگاری (نقالی) سے اعتنا نہیں کیا۔ وہ حقیقت کے بجائے حُسن کے ترجمان تھے۔ انہیں شبیہہ نگاری سے واجبی ہی سی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر پھُولوں، پرندوں، درختوں اور کُہساروں کی تصویریں کھینچتے تھے۔ ابنِ بطوطہ کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبیہہ نگاری میں بھی یدِطُولےٰ رکھتے تھے۔

"فنِ تصویر کی پختگی اور کمال میں کوئی قوم چینیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی نہ رُومی نہ اُن کے علاوہ اور کوئی کیونکہ یہ لوگ اِس بات میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ ہمارے مشاہدے کی بات ہے کہ چین کا کوئی شہر ہو جب ہم اِس میں پھر کر واپس آتے ہیں تو وہاں ہم اپنی تصویریں شہر کی دیواروں اور کاغذ پر بنی ہوئی دیکھتے ہیں۔ ایک دفعہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پائے تخت میں داخل ہوا اور ہم سب عراقی لباس پہنے ہوئے تھے ہم شام کو دربار سے واپس آئے اور بازار سے گُذرے تو اپنی تصویر اور ساتھیوں کی تصویریں سب کاغذوں پر بنی ہوئی پائیں جو دیواروں پر لٹکائی گئی تھیں ہم میں سے ہر ایک اپنی تصویر دیکھنے لگا اور اپنی شبیہہ میں کچھ بھی فرق نہ پایا۔"

چین میں جنابِ مسیح کی پیدائش سے سیکڑوں برس پہلے مُصوّری ترقی یافتہ صورت میں موجود تھی۔ سُونگ شہنشاہوں کے دورِ حکومت میں اہلِ چین کا شوقِ تصویر کشی جنوں

ا۔ MOOD

کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اِس عہد میں مصوری نے بدھ اسلوب سے گلو خلاصی کرالی تھی اور آزادانہ نشو و نما پانے لگی تھی شہنشاہ ہُوئی تسونگ خود بھی ایک بلند پایہ مصوّر تھا۔ اُس کے عہد میں آٹھ سوصف اوّل کے مصوّر موجود تھے۔ تانگ عہد میں اِس فن کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ اِس زمانے کا عظیم مصوّر وو تاؤ تسی تھا جو ریشم، کاغذ اور دیوار پہ یکساں مہارت سے تصویریں کھینچا کرتا تھا۔ شمالی چین کے مصوّر آخر تک کلاسیکی روایات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے رہے جب کہ جنوب میں رُومانی میلان رونما ہوا جس میں جذبات کے بے محابا اظہار پہ زور دیا جاتا تھا۔ چین کا عظیم ترین مصوّر تاؤ تزو تھا جس نے بودھوں کے معبدوں میں تین سو سے زیادہ نقوش بنائے تھے۔

چینیوں کا فطری مناظر سے عشق اُن کے ادب، شاعری، فلسفے اور مصوّری میں نفوذ کر گیا۔ اُنھوں نے قدرتی مناظر، پہاڑوں، جھیلوں، جنگلوں اور پھولوں کی بے مثال تصویریں کھینچیں۔ اُن کی اِصطلاح میں منظر کشی کا نام ''پہاڑ اور پانی'' تھا۔ چینی مصوّر فطری مناظر کی نقالی سے اِجتناب کرتا تھا۔ وُہ کسی منظر کو دیکھ کر پہروں اُس پر غور و تعمق کرتا رہتا اور جب تمثالی پیکر اس کی چشمِ تصور کے سامنے اُبھر آتا تو وہ اپنے مُوقلم کی چند تیز تیز جنبشوں سے اُسے کاغذ یا ریشمی پارچے پر منتقل کر دیتا تھا۔ اُن کے قدرتی مناظر میں انسان کو حقیر و صغیر دکھایا گیا ہے۔ سی۔ ای۔ ایم جوڈ لکھتے ہیں۔

''چینی آرٹ بڑا سکون بخش ہے کسی کا قول ہے کہ عظیم ترین موسیقی آواز میں نہیں بلکہ سکوت میں مخفی ہے.... چینیوں کی تصویریں اور منقش پارچے دیکھ کر مجھے یہ قول یاد آ گیا۔ چینی مصوّری سے میں نے ایک اور تاثر لیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کی تصاویر میں ہمیشہ بڑے بڑے کوہستان اور جھیلیں دکھائی جاتی ہیں جن کے سامنے انسان تنہا، مُنّا، تنہا، دُھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چینیوں کو انسان کی نقاشی میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور وہ اس کے جمالیاتی ممکنات سے بے

پروا تھے۔ ایسا غالباً ارادۃً کیا جاتا تھا کہ قدرت کے عظیم مناظر کے پس منظر میں اس حقیر و صغیر مخلوق کو گھرا ہوا دکھایا جائے۔۔۔ چینی آرٹ دُنیا بھر کا عظیم ترین آرٹ ہے"۔[1]

مُصوّری کے شوقین اساتذہ کی تصاویر کو دیواروں کے ساتھ آویزاں نہیں کرتے تھے بلکہ اُنہیں کاغذ یا ریشم پر بنوا کر لپیٹ کر رکھ دیتے تھے یا بعض اوقات مُرقّع کی صورت میں محفوظ کر لیتے تھے۔ اکثر شاہکاروں کو چُھپا کر رکھتے تھے اور تنہائی میں بیٹھ کر اُن کے حُسن سے لُطف اندوز ہوتے تھے۔ مہمان کی ضیافت اور تواضع میں یہ بات بھی شامل تھی کہ کھانے سے فارغ ہو کر اُسے تصویریں اور ریشمی پارچے دکھائے جاتے تھے۔

چینی مُصوّری نے اسلامی دَور میں بغداد، ہرات اور تبریز کے مکاتبِ مُصوری پر گہرے اثرات ثبت کئے تھے۔ ایل خانی سلاطین کے عہدِ حکومت میں جب چین پر اُن کے ہم نسل مغلوں کی حکومت تھی اسلامی ممالک اور چین کے مابین، سفیروں، تاجروں، عالموں، معماروں کاریگروں اور فن کاروں کی آمد و رفت رہتی تھی جس سے چین کی مُصوّری کے اسالیب اسلامی ممالک میں رواج پا گئے۔ بدالدین حئی چینی لکھتے ہیں[2]

"توہوان کے قول سے یہ شہادت ملتی ہے کہ چینی مُصوّر اور نقاش عہدِ عباسیہ کے اوائل میں کوفہ میں موجود تھے اور وہاں عربوں کو مُصوّری اور نقاشی سکھاتے تھے چینیوں کی مہارتِ فنِ مُصوّری میں مانی ہوئی تھی اور ۹ ویں صدی عیسوی کے مسلمان اِس سے بے خبر نہ تھے۔۔۔ ایران کے مشہور شاعر جامی نے ایک چینی مُصوّر کو آمادہ کیا کہ ایک ہی کاغذ پر زلیخا اور یوسف کی تصویریں بنائے۔ یہ تصویر اس وقت علمائے فن کے نزدیک یوسف و زلیخا کے نام سے مشہور ہے۔ اِسے دیکھ کر پروفیسر آرنلڈ

---

[1] JOAD, C.E.M.: TESTAMENT OF JOAD.

[2] چین و عرب کے تعلقات

کو اعتراف کرنا پڑا کہ واقعتاً اہلِ ایران چینی مصوروں سے کتابوں اور اشعار کی تزئین کرنے میں مدد لیتے تھے اور یہاں سے چین کے فنِ مصوری کا اثر ایران کے فنِ اسلامی پر پڑنا شروع ہوا اور وہ اپنی تصویروں میں طبیعی مناظر اور چینی مصوری کے خصائص داخل کرنے لگے... اس میں شک نہیں کہ عہدِ مغول کی اسلامی مصوری میں چین کا اثر اور زیادہ جلی اور قوی نظر آتا ہے۔ سبب یہ تھا کہ ان فاتحین نے چین کو بہت سے اہلِ فن اور نقاشوں کو بغداد میں ہجرت کرائی اور ان کے عوض بہت سے مسلم صناع فراقرم بھیجے گئے۔ پروفیسر آرنلڈ کا بیان ہے کہ ہلاکو نے نہ صرف چینی نقاشوں کو ایران بھیجا بلکہ بہت سی تصویر دار کتابیں بھی ساتھ کر دیں... مغولوں کی حوصلہ افزائی نے فنِ مصوری کو عالمِ اسلام میں اس درجے پر پہنچا دیا کہ جس کی نظیر اس سے پہلے عالمِ اسلام میں نہیں ملتی... ایران کی چینی مصوری کا فنِ اسلامی پر گہرا اثر پڑا۔ اس اثر کا عکس نہ صرف ہندوستان کے مغول آرٹ میں جو ایران کا مقلد تھا نظر آیا بلکہ اسلامی ادب میں بھی ان کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ چینی اثرِ فن شاہ عباس کے زمانے تک رہا بلکہ اب تک ہے۔ عام طور پر یہ اثر عنقا، تنین اور کیلین کی شکلوں میں، بادلوں میں نیلوفر اور خشخاش کے پھولوں اور پتیوں سے اور مناظرِ طبیعی میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ کو کسی عربی یا فارسی نسخے میں ان چیزوں میں سے کوئی چیز نظر آئے تو یقین کیجیے کہ چین کے فنِ مصوری سے متاثر ہے۔"

قدیم زمانے سے چینیوں کے پیشِ نظر دو مقاصد رہے ہیں۔ دانش کا حصول اور حسن و جمال کی ترجمانی۔ جس طرح دانش کے حصول کے لیے وہ مابعد الطبیعیات کو بے ثمر سمجھتے تھے اسی طرح وہ حسن و جمال کے نظریاتی پہلو سے بے توجہی کرتے تھے اور اس کے عملی اور افادی پہلو کو اہمیت دیتے رہے۔ ان کے ہاں شروع ہی سے کاریگر اور فن کار میں

کوئی فرق نہیں تھا اور وہ روزمرّہ کی مصنوعات کو بھی حسین بنانے کے تمنائی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے اِردگرد کی سا ری چیزیں خوبصورت ہوں۔ اُن کے اِس ذوقِ جمال کا ثبوت اُن کے برتنوں، ملبوسات، پردوں اور جالیوں میں ملتا ہے جن پر بے مثال گُل کاری کی گئی تھی۔ سُونگ خاندان کے عہدِ حکومت میں اہلِ چین اپنے گھروں اور معبدوں کو خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتے تھے۔ نساجی، دھات کے کام، یشب تراشی، کاشی، لکڑی اور ہاتھی دانت کے کام میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ یشب تراشی چین کا خاص فن ہے۔ وہ یشب کو ایسا پتھر کہتے ہیں "جو شبنم کی طرح نرم ہوتا ہے"۔ چینی صناعت کا ذکر کرتے ہوئے مسعودی لکھتا ہے۔

"خدا کے بندوں میں اہلِ چین دستکاری اور نقش گری میں کمال رکھتے ہیں۔ ہاتھ کے کام میں کوئی قوم اُن پر سبقت نہیں لے جا سکی۔ ان میں سے کوئی شخص جو ہاتھ کا ایسا کام کرتا ہے جو دوسرے لوگ نہیں کر سکتے تو وہ اُسے لے جا کر شاہی محل کے دروازے پر رکھ دیتا ہے اور سال بھر تک وہاں یونہی پڑا رہنے دیتا ہے۔ اگر اس اثنا میں کوئی دوسرا شخص اس میں کوئی عیب نہیں نکال سکا تو صانع کو بادشاہ کی طرف سے اِنعام ملتا ہے اور اُسے شاہی کاریگروں کے زُمرے میں داخل کر لیا جاتا ہے۔ اگر عیب نکالا گیا تو اُسے کچھ نہیں ملتا اور اُسے شاہی دروازے سے بھگا دیتے ہیں"

قزوینی بھی چینی صناعت کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

"باریک صناعات میں چینیوں کو ایسی مہارت ہے کہ دوسری کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اہلِ چین کوئی چیز دیکھیں تو اُس میں عیب ضرور نکالتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے سوا دُنیا کی کوئی قوم دست کاری نہیں جانتی اور اِس باب میں بالکل اندھی ہیں البتہ اہلِ بابل مُستثنیٰ ہیں اِنہیں کانے کہا جا سکتا ہے۔"

جاحظ کہتا ہے۔

"چینی صناعات میں یونانی حکمت میں، ساسانی نظمِ مملکت میں اور ترک فنِ حرب کے ماہر ہیں۔"

ریشم سازی اور ریشم بافی خالصتاً چینی صنعت تھی۔ چینی ریشم کو "سی" کہتے ہیں۔ ریشم کے کیڑوں کو شہتوت کے درختوں پر پال کران سے ریشم حاصل کیا جاتا تھا۔ ۵۵۲ء میں چند نسطوری راہبوں نے چین سے ریشم بافی کا طریقہ سیکھ کر مغرب میں رائج کیا۔ انگلستان میں اِس کا رواج پندرھویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ چین کے منقش پارچات دُور دراز کے ملکوں کو برآمد کئے جاتے تھے۔ ایک تجارتی راستہ منگولیا، ترکستان، ایران اور ایشیائے کوچک سے گذرتا تھا جسے "شاہراہِ ریشم" کہتے تھے اور جس پر قبضہ کرنے کے لئے صدیوں تک رُومیوں اور ایرانیوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دوسرا راستہ بقول رشیدالدین فضل اللہ کابل، پنجاب، دِلّی، بنگال اور تبّت سے گذرتا تھا۔ پروفیسر ہرتھ کہتے ہیں کہ شام کے بازاروں میں چین کا ریشم سونے کے ساتھ تُل کر بکتا تھا۔ روما میں چینی ریشم نہایت گراں قیمت تھا اور صرف سلاطین اور اُمراء ہی کو میسّر آسکتا تھا۔ چین کے ریشم باف پارچوں میں نہایت حسین فطری مناظر، رنگ برنگ کے پُھول اور پودے، پرندے اور پہاڑ کاڑھتے تھے۔ انہوں نے اِس فن کو مصوّری کا ہم پایہ بنا دیا تھا۔ چینی "کم خا" جو ایران میں آکر کمخواب بن گیا، مخمل، زربفت اور پرنیاں بیش قیمت سمجھے جاتے تھے۔

چین کی حسین ترین صناعت جسے اربابِ نظر تمدّنِ نوعِ انسان کا گراں قدر سرمایہ قرار دیتے ہیں اور جس کا جواب اپنی نفاست اور نزاکت کے لحاظ سے صرف چینی مصوّری ہی پیش کر سکی ہے چین کی سفال سازی ہے جس میں چین کا کوئی حریف نہیں ہے۔ چین میں چاک کا استعمال آج سے چار ہزار برس پہلے موجود تھا۔ روغنی برتن ہَین خاندان کے عہد (۲۰۶ - ۲۲۰ء ق م) میں بننے لگے تھے۔ اِس کے ساتھ ہی پورسلین کی ایجاد عمل میں آئی۔ پورسلین کا نام اہلِ مغرب کا دیا ہوا ہے جو پورسے لانا (کوڑی) سے مشتق ہے۔ چین کی اصل

پورسلین کی پہچان یہ ہے کہ اسے چاقو سے کاٹا جا سکتا ہے اور یہ چُور چُور نہیں ہوتی۔ سفال سازی کا بیان ابن فقہیہ کی کتاب میں ملتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عربوں کو نویں صدی عیسوی میں اس صناعت کا علم ہو چکا تھا۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ عرب تاجر چین کے برتن خُلفائے بنو عباس کے لئے بغداد لایا کرتے تھے۔ چینی سفالین کے ٹکڑے جو عہدِ تانگ کے بنے ہوئے ہیں حال ہی میں کھود کر نکالے گئے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں نے سفال سازی کا فن وینس والوں کو ۱۴۷۰ء میں سکھایا تھا۔

چینی سفال سازی کو محض ایک صناعت ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُسے فنِ لطیف بھی خیال کرتے تھے۔ سفال سازی میں اُنہوں نے جمالیت اور افادیت کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ چاء نوشی اُن کے لئے مُستقل مُعاشرتی اِدارہ بن گئی تھی جس کے لئے اُنہوں نے چینی کے نازک اور نفیس برتن تخلیق کیئے۔ مِنگ خاندان کے سفال ساز تین صدیوں تک محنت کرتے رہے کہ اِس فن کو سُونگ عہد میں جن بلندیوں پر پہنچا دیا گیا تھا اُنہیں برقرار رکھا جا سکے چنانچہ زرد رنگ، انڈے کی طرح کے ہلکے نیلے رنگ اور سفید براق رنگ تکمیل کو پہنچ گئے۔ سفید اور نیلے رنگوں کا ایک پیالہ جس کا نام شہنشاہ وان لی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سفال سازی کا ایک عظیم شاہ کار ہے۔ سُونگ سفالین کے ہاتھی دانت کی طرح سفید برتنوں کو ٹِنگ یاؤ کہتے تھے چینی کے برتنوں میں رنگ برنگ کے پھولوں، بیل بُوٹوں پہاڑی مناظر، اژدہے، عُقاب، چنڈول وغیرہ کے نہایت دلفریب نقوش بنائے جاتے تھے۔ اہلِ چین تصاویر کی طرح برتنوں کو بھی متاعِ عزیز سمجھتے تھے اور انہیں سنیت سنیت کر رکھتے تھے۔ سفال سازی کے ساتھ اُنہوں نے سنگِ یشب کی تراش کو بھی فنِ لطیف بنا دیا۔ کسی قوم نے یشب کو اتنی حسین صورتوں میں نہیں تراشا ہوگا۔

چینیوں کے عملی ذہن نے جس طرح مابعد الطبیعیات میں دلچسپی لینے کے بجائے اخلاق و عمل کو اپنا موضوعِ فکر بنایا تھا اسی طرح اُنہوں نے نظری سائنس، ریاضیات

اور طبیعیات کو درخورِ توجہ نہیں سمجھا اور بحیثیت سائنس کے عملی اور افادی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا چنانچہ اہلِ چین نے عملی سائنس میں عظیم ایجادات کیں جن میں سے بعض انقلاب آور ثابت ہوئیں۔ ان میں ٹائپ، بلاک کی چھپائی اور کاغذ کا ذکر آچکا ہے بارود اور قطب نما کی طرف توجہ دلانا باقی ہے۔ اہلِ مغرب ان ایجادات سے عربوں کے واسطے سے روشناس ہوئے تھے۔ ابتدا میں چینی بارود کو آتش بازی کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں جنگ میں بھی برتنے لگے۔ بارود تانگ عہد کی ایجاد ہے۔ سونگ خاندان کے دورِ حکومت میں اسے جنگی ہتھیار بنا دیا گیا۔ چینی میدانِ جنگ میں جلتی ہوئی ہوائیاں دشمن کی صفوں اور فرودگاہ پر پھینکتے تھے چنگیز خاں نے چین فتح کیا تو اپنے ساتھ ایسے قیدی بھی لے گیا جو اس فن کے ماہر تھے۔ ان کی مدد سے اس نے 'توپ خانہ' بنایا جس کے افسر کو تاتاری پاؤ پُو کہتے تھے یہ لوگ منجنیقوں سے اڑتی ہوئی آگ پھینکتے تھے۔ عربوں نے بارود سازی کا ہنر چینیوں سے سیکھا تھا مغرب میں اس کا رواج روجر بیکن کے زمانے میں ہوا جس نے عربی کتابوں سے بارود سازی کی ترکیب سیکھی تھی۔ صلیبی جنگوں میں عربوں نے آتش باری سے کام لیا۔ وہ پہلے دشمن کے قلعے پر منجنیق سے روغنِ نفت پھینکتے تھے اور پھر آتشی ہوائیوں سے اس میں آگ لگا دیتے تھے۔ ہندوستان میں ظہیر الدین بابر توپ خانہ لایا تھا۔

قطب نما چینیوں کی دوسری انقلاب آور ایجاد ہے۔ چینیوں نے اس سے بحری سفروں میں کام نہیں لیا۔ عرب جہازراں اس مقصد کے لئے قطب نما استعمال کرنے لگے۔ عربوں کے توسط سے اہلِ مغرب اس ایجاد سے روشناس ہوئے تو بحری سفروں میں آسانی ہو گئی اور اس کی مدد سے میجی لان، کولمبس، واسکوڈاگاما وغیرہ طویل بحری سفروں پر روانہ ہوئے اور نئے نئے برِاعظم دریافت کئے۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے چینیوں کی ایک اہم ایجاد کاغذ کے کرنسی نوٹ تھے جنہیں ابنِ بطوطہ نے دراہم الکاغذ کا نام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملک چین میں سکوں کی بجائے

انہی دراہم الکاغذ کا رواج تھا۔ جب کبھی کوئی کرنسی نوٹ پھٹ جاتا تو لوگ اُسے سرکاری خزانے سے بدلوا لیتے تھے اور اس کرنسی پر نہایت درجہ اعتماد رکھتے تھے۔ اہلِ مغرب نے کاغذ کے کرنسی نوٹ اہلِ چین سے اخذ کئے۔ تفریح کے میدان میں چینیوں کی دو ایجادات معروف ہوئیں فٹ بال اور تاش۔ تاش کے پتوں پر آج بھی چینی نقوش دکھائی دیتے ہیں اہلِ مغرب نے یہ کھیل چینیوں ہی سے لئے تھے۔

چینی معاشرہ مساوات کے اصول پر مبنی تھا۔ کسی شخص کو اُس کے پیشے کے باعث حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حکومت کے عہدوں کے انتخاب کے لئے مقابلے کے امتحان لئے جاتے تھے جن میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا۔ ذات پات کی تمیز کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود طبقاتی تفریق موجود تھی۔ اہلِ علم کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ چین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اہلِ علم کا ملک ہے جہاں صدیوں سے اہلِ علم حکومت کرتے رہے ہیں۔ عالموں کے بعد کسانوں کا درجہ تھا۔ ان کے بعد کاریگروں کا طبقہ تھا۔ سب سے ادنیٰ مقام تاجروں کا تھا، کیوں کہ چینیوں کے خیال میں یہ لوگ دوسروں کی محنت و مشقت سے بنائی ہوئی اشیاء کا محض تبادلہ کرکے دولت کماتے ہیں۔ دوسری قدیم اقوام کی طرح نظامِ معاشرہ جاگیردارانہ تھا۔ شہنشاہ مالیہ اور دوسرے محصولات جنس کی صورت میں وصول کرتا تھا۔ غلامی اور بردہ فروشی کا رواج عام تھا۔ منتخب حسین کنیزیں بادشاہ اور اُمراء کے شبستانوں میں داخل کی جاتی تھیں اُن کی نگرانی پر خواجہ سرا مامور تھے۔ شہنشاہ کے کارندے نوعمر پری چہرہ لڑکیوں کو اطرافِ ملک سے چُن چُن کر خرید لاتے تھے۔ محل میں عمر رسیدہ، تجربہ کار عورتیں مزید انتخاب کرتی تھیں۔ وہ انہیں دن رات زیرِ مشاہدہ رکھتیں اور بغور دیکھتی رہتیں کہ کوئی لڑکی سوتے میں خراٹے تو نہیں لیتی یا اس کے بدن پر کوئی داغ تو نہیں ہے یا سانس بدبودار تو نہیں ہے۔ پھر اُن کے بدن کو عطر میں بسا کر باری باری شہنشاہ کے شبستانِ شوق میں بھیجا جاتا تھا۔ شہنشاہ کی موت پر اُس کی محبوب کنیزیں بھی اُس کے ساتھ مقبرے میں

زندہ دفن کردی جاتی تھیں تاکہ اگلے جہان میں بھی وہ اُن کے حُسن و جمال سے تمتّع کر سکے۔ اُمراء اور روساء اپنی بیٹیاں شہنشاہ کے حرم کے لئے پیش کرتے تھے جن میں منتخب لڑکیوں کو شرفِ قبولیت بخشا جاتا تھا۔ قحط کے دنوں میں ماں باپ اپنے بچوں کو اونے پونے فروخت کر دیتے تھے۔ باپ اِس بات کا مجاز تھا کہ اپنی بیٹیوں اور سرکش بیٹوں کو لونڈی غلام بنا کر بیچ ڈالے۔ بالائی طبقے میں کثرتِ ازدواج کا رواج تھا۔ بیویوں اور کنیزوں کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ ایک فلسفی کو ہنگ منگ نے ایک دفعہ کثرتِ ازدواج کی حمایت میں کہا تھا "تم نے چاء دانی تو دیکھی ہوگی جس کے پاس چار پیالیاں رکھی ہوں، کیا تُم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک پیالی کے پاس چار چار چاء دانیاں رکھی گئی ہوں"۔ دوسری قدیم اقوام کی طرح چین میں بھی آغازِ تمدّن سے کسبیاں موجود تھیں۔ جو ناچ گا کر عیش و عشرت کی محفلوں کو گرم کرتی تھیں۔ چین کی سیاسیات، ادبیات، موسیقی، تمثیل اور قصوں میں ان کسبیوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ شادی شدہ مرد قحبہ خانوں میں جانا باعثِ ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے۔

چینی حُسنِ نسوانی کے بڑے مُبصّر تھے۔ اُنہوں نے ہوا و ہوس کی دُنیا میں بھی بڑی لطافتیں پیدا کیں۔ لڑکیوں کے پاؤں اوائلِ عُمر ہی میں باندھ دیتے تھے۔ جب وہ جوان ہو جاتیں تو اُن کے ننھے مُنّے پاؤں کو "سنہری کنول" اور "معطّر سوسن" کہا کرتے تھے۔ چینی عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کو اپنے پاؤں نہیں دکھاتی تھی اور اُنہیں چھپائے رکھنے میں وہی اہتمام کرتی جو دوسری اقوام کی عورتیں اپنی چھاتیاں چھپانے میں کرتی ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی نامحرم نے اتفاق سے کسی عورت کے پاؤں دیکھ لئے اور عورت نے مارے شرم کے خود کُشی کر لی۔ عورتوں کے ننھے مُنّے پاؤں چینیوں کے لئے بے پناہ جنسی کشش کا سامان رکھتے تھے کیوں کہ ان سے چلتے وقت بوجھل کولھوں میں نفس پرور تموّج پیدا ہوتا تھا اور سُرین کا اُبھار نمایاں ہو جاتا تھا۔ شادی کو خاندان کی بقا اور تقویت کا باعث سمجھتے تھے۔ خاندان

ہی تمام معاشرے کا مرکز و محور تھا خاندان کا سردار اور سربراہ سب سے بڑا بیٹا ہوتا تھا۔ بزرگوں کو دیوتا سمجھ کر اُن کی پوجا کرتے تھے، بیٹوں کی تعداد پر فخر کرتے تھے اور بیٹیوں کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھاتے تھے کیوں کہ اُن کے لئے جہیز فراہم کرنا پڑتا تھا۔ روساء اور اُمراء کی عورتوں کا مقام البتہ وقیع تھا۔ چین کی تاریخ میں کئی شہزادیوں کا ذکر آیا ہے جنہوں نے بے پناہ طاقت حاصل کرلی تھی۔ ملکہ تا، کی نہایت سفاک تھی۔ اُس کی عیاشی کی حد یہ تھی کہ اُس کی شبانہ محفلوں میں ننگی عورتیں مرد مل کر ناچا کرتے تھے۔ کچھ درباریوں نے تنگ آکر اُس کے خلاف سازش کی لیکن راز فاش ہو گیا اور باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ ملکہ نے عذاب دینے کا ایک نیا طریقہ اختراع کیا۔ وہ یہ تھا کہ ایک گڑھے میں آگ جلا دی گئی۔ اُس کے عین اوپر ایک اُفقی بانس گاڑ دیا گیا اور بانس پر چربی مل دی گئی۔ باغیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ باری باری نٹوں کی طرح بانس پر چل کر گڑھا پار کریں جب کوئی اجل گرفتہ بانس پر سے پھسل کر آگ کے الاؤ میں گرتا تو ملکہ خوشی سے تالیاں پیٹتی تھی۔

طبقۂ اُمراء کی عورتیں مرد نہایت بیش قیمت ریشمی لباس پہنتے تھے۔ اُن کی قبا کی آستینیں بڑی بڑی اور کھلی ہوتی تھیں۔ ان میں ہاتھ چھپا کر رکھتے تھے۔ اُمراء اپنے ہاتھوں کے ناخن بڑھا لیتے تھے جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرتے۔ رکشا کی سواری کا رواج عام تھا جسے قلی کھینچتے تھے۔ تخت رواں کو غلام اُٹھائے اُٹھائے پھرتے تھے۔ چینی عورت کا حُسن و جمال ضرب المثل بن چکا ہے۔ اُس کے جسم پر سر کے بالوں کے سوا کہیں بھی بالوں کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ چینی عورتوں کے بدن کو سنگِ مرمر سے تشبیہ دیتے تھے اور اُس کے جسم کی خوشبو کو "مرمر کی خوشبو" کہا کرتے تھے[1]۔ لعبتِ چین کی ترکیب فارسی ادب میں چینی عورت کے حُسن کی یاد دلاتی ہے۔

---

[1] YUTANG, LIN. : MY COUNTRY AND MY PEOPLE.

دیہات میں کہگل سے مکان تعمیر کرتے تھے جن کی دیواریں بانس کی بنائی جاتی تھیں۔
کھڑکیوں میں شیشے کے بجائے رنگین منقش کاغذ لگاتے تھے، درمیان میں کھلا صحن
ہوتا تھا جس کے گرد کمرے تعمیر کیئے جاتے تھے۔ ایک ہی مکان میں سارے کا سارا کنبہ دادا دادی
ماں باپ بیٹے پوتے مل کر رہتے تھے۔ نہر کے گھاٹ کو عورتوں کے آپس میں مل بیٹھنے اور
خوش گپیاں کرنے کا مقام سمجھا جاتا تھا۔ مرد بہنگیوں سے بالٹیاں لٹکا کر کھیتوں کو پانی
دیتے تھے، مٹی کے برتن استعمال کرتے تھے، چاول کھچیوں سے کھاتے تھے۔ گوشت
کمیاب تھا، سبزیاں تیل میں اُبالی جاتی تھیں اور شکر خاص خاص تقریبات ہی پر استعمال
کی جاتی تھی۔ قصبات میں متوسط طبقے کے مکان میں دیوان خانہ ہوتا تھا جہاں مہمان آکر بیٹھتے
تھے۔ دیواروں پر لکڑی کی تختیاں آویزاں کی جاتی تھیں جن پر گھر والوں کے آباء و اجداد
کے نام لکھے جاتے تھے۔ دیہاتی عورتیں کھیتی باڑی میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور اس سے
فارغ ہو کر سینے پرونے اور پکانے ریندھنے کا دھندا کرتی تھیں۔ مرد کھلے ازار پہنتے تھے
جن پر لمبے بھورے یا نیلے رنگ کے چغے پہنے جاتے تھے۔ خاص خاص مواقع پر ان چغوں
پر چھوٹی سی صدری بھی پہن لیتے تھے۔ جاڑے میں کپڑوں میں روئی بھر کر سی لیتے تھے۔
عورتیں چغے کی بجائے چھوٹی صدری پہنتی تھیں جن کا رنگ نیلا یا سیاہ ہوتا تھا۔ سر پر رومال
لپیٹ لیتی تھیں۔ شہری عورتیں اپنے لباس پر کشیدہ کاری سے خوبصورت بیل بوٹے
بناتی تھیں۔ گرمی میں مرد تنکوں کی بنائی ہوئی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ عوام کھردرے کپڑے
یا تنکوں کے بنائے ہوئے جوتے پہنتے تھے۔ چمڑے کے جوتے صرف اُمراء پہنتے تھے بچے
کی پیدائش کے دن ہی اُس کی عمر ایک برس کی فرض کرلی جاتی تھی۔ نوروز پر اُس کی
عمر میں ایک سال کا اضافہ کر لیتے تھے مثلاً جو لڑکا نوروز سے دس دن پہلے پیدا ہوتا وہ
نوروز کے آنے پر دو برس کا ہو جاتا تھا۔ بچہ ایک ماہ کا ہوتا تو اُس کا جشن مناتے تھے
اور اُسے "دودھ کا نام" دیا جاتا تھا۔ مدرسے میں داخلے پر "کتابی نام" رکھتے تھے۔

بیٹوں کے بڑے چھوٹے فیصلے کرتے تھے۔ لڑکیاں اپنے بھائیوں کی خدمت پر کمربستہ رہتی تھیں۔ بچوں کو بچپن ہی سے بڑوں کا ادب کرنا سکھایا جاتا تھا۔ شہروں میں لڑکوں کو کاریگروں کی شاگردی میں دے دیتے تھے دیہات میں لوہار، ترکھان، موچی وغیرہ سال بھر کی خدمت کا معاوضہ اناج کی صورت میں وصول کرتے تھے جیسے ہمارے دیہات میں سیپ کا رواج ہے۔

چینیوں کا سب سے اہم تہوار نوروز تھا۔ اپنی تقریب پر شکر سے بنے ہوئے کھلونے تقسیم کرتے تھے، ہر کہیں رنگین قندیلیں روشن کی جاتی تھیں۔ تہوار کی آمد سے کئی دن پہلے سے اس کی تیاریاں جوش و خروش سے شروع ہو جاتی تھیں۔ نوروز کی دعوتوں میں خاندان بھر کا اجتماع ہوتا تھا، مکانوں کو رنگ برنگ کی کاغذی جھنڈیوں اور پھریروں سے سجایا جاتا تھا۔ ان ایام میں محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے اور امیر غریب، چھوٹے بڑے سب مسرور و شادماں دکھائی دیتے تھے۔ نوروز کی رات کو بزرگوں کے شجروں کی تختیوں کے سامنے آگ روشن کی جاتی تھی اور پٹاخے داغے جاتے تھے۔ آتش بازی اور بازی گری کے پرجوش مظاہرے کرتے تھے۔ بازی گر افقی بانسوں پر ایسے حیرت انگیز کرتب دکھاتے تھے کہ تماشائی دنگ رہ جاتے تھے۔ یہ فن آج بھی چینی سرکس کی صورت میں زندہ ہے نوروز کی رات جاگ کر گزاری جاتی تھی۔ باورچی خانے کے دیوتا کو جلانے کی رسم بھی اسی رات کو ادا کی جاتی تھی۔ اس دیوتا کی تصویر دیوار پر لٹکائی جاتی تھی جہاں وہ سال بھر لٹکی رہتی۔ نوروز کی رات کو اسے نذر آتش کر دیتے تھے اور نئی تصویر لٹکا دیتے تھے۔ چودہ روز کے جشن کے بعد یہ تہوار "قندیلوں کی دعوت" پر ختم ہو جاتا تھا۔ جو چینیوں کی سب سے دلکش تقریب تھی۔ پانچویں چاند کے پانچویں دن "اژدہے کی کشتی" کا تہوار منایا جاتا تھا۔ اژدہا پانی کا مقدس دیوتا تھا۔ اس موقع پر کشتیوں کی دوڑیں ہوتی تھیں۔ آٹھویں ماہ کے پندرھویں دن بدر کے اعزاز میں خزاں کا تہوار منایا جاتا تھا۔ بدر کو امن اور

سلامتی کی علامت جانتے تھے۔ بچوں کا خاص تہوار پتنگ بازی کا تھا۔ نویں چاند کے نویں دن بچے اور جوان پہاڑیوں پر جا کر پتنگ اڑاتے تھے۔ یہ پتنگ رنگین کاغذوں کے بنائے جاتے تھے۔ ان میں سیٹیاں لگاتے تھے جو ہوا میں بڑی سُریلی آوازیں بکھیرتی تھیں۔ عام طور سے پتنگ اژدہے یا تتلی کی شکلوں کے بناتے تھے۔ بیاہ پر آتش بازی کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ آتش باز آن کی آن میں باغ لگا دیتے جن میں مختلف پھولوں اور درختوں کو بڑی چابک دستی سے دکھایا جاتا تھا۔ چینی تقویم قمری تھی۔ سال کے بارہ مہینوں کے نام جانوروں کے نام پر رکھتے تھے مثلاً سالِ موش، سالِ گرگ وغیرہ۔

چاول شروع سے چینیوں کا من بھاتا کھاجا رہا ہے۔ وہ مچھلی اور گھونگا بھی شوق سے کھاتے تھے۔ دریاؤں کے کناروں پر بسنے والے بے شمار لوگ مچھلیاں پکڑ کر گزر اوقات کرتے تھے۔ ماہی گیری بڑا منفعت بخش پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ چین کی کوئی دعوت چاول اور مچھلی کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چاء پر تو وہ جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے چاء نوشی کو ایک مقدس ادارہ بنا لیا تھا۔ چاء چین کے تحائف میں سے ہے جو اس نے دوسری اقوام کو دیے ہیں چینی زبان میں چاء اس پانی کو کہتے ہیں جو کھول کر چاء کا زعفرانی رنگ کا عرق نکالتا ہے۔ چائے پتیوں کو کہتے ہیں عربوں میں یہ لفظ شای بنا، ترکی، فارسی اور پرتگالی میں چائے کا لفظ موجود ہے۔ یہ لفظ انگریزی زبان میں ٹی (TEA) اور فرانسیسی میں تے بن گیا ہے۔ سلیمان سیرافی پہلا عرب تھا جس نے "ساخ" کا پتہ بتایا۔ اپنی تاریخ میں اس نے 'ساخ' لکھا ہے جو بعد میں شای بن گیا۔ اہلِ مغرب چاء کے رواج سے پہلے ناشتے میں بیئر پیتے تھے۔ پہلا یورپین جس نے چاء بنانا سیکھا ایک ایرانی تاجر حاجی محمد کا شاگرد تھا جس نے اُسے چاء کشید کرنے کا طریقہ بتلایا۔ یہ ۱۵۴۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد مغرب میں چاء نوشی کا رواج عام ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم چینیوں نے تمدنِ عالم میں بیش بہا اضافے کیے، ٹائپ،

بلاک کی چھپائی، بارود، قطب نما، روئی کا کاغذ، کرنسی نوٹ، مقابلے کے امتحان، گیٹ پاس، کمخاب، وپرنیاں، دیبا، چاء، تاش، یشب تراشی، سفال سازی اور مصوری کے شاہکار اس عظیم اور درخشاں تمدن سے یادگار ہیں۔ اِن سے بھی زیادہ قیمتی اُن کی معنوی میراث ہے۔ وہ عملی اخلاق کے قائل تھے جس میں کردار اور شخصیت کی تعمیر پہ زور دیا جاتا تھا۔ برٹرنڈ رسل نے کہا ہے۔

"آرٹ میں چینیوں کا نصب العین حسن و جمال ہے اور زندگی میں معقولیت پسندی"

چینی تمدن کا ذکر کرتے ہوئے ہردیال[1] نے لکھا ہے۔

"یہ عظیم خیال چینی تہذیب کی بیش قیمت میراث ہے کہ عقل و خرد کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کردار کی تشکیل کی جائے اور دونوں کو ریاست کی خدمت کے لیئے وقف کر دیا جائے"
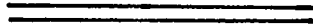
---

[1] DAYAL, HAR.: HINTS FOR SELF CULTURE.

کتابیات

(۱) ـــ رگ وید

(۲) ـــ اوستا

(۳) ـــ منوسمرتی

(۴) ـــ گیتا

(۵) ـــ ستیارتھ پرکاش ـــ دیانند سرسوتی

(۶) ـــ دبستان المذاہب ـــ محسن فانی

(۷) ـــ مقدمہ ـــ ابن خلدون

(۸) ـــ ابرامکہ ـــ عبدالرزاق کانپوری

(۹) ـــ تمدن ہند ـــ گستاولی بان ترجمہ علی بلگرامی

(۱۰) ـــ تاریخ سندھ ـــ ابوظفر ندوی

(۱۱) ـــ مقدمہ وکرم اروسی ـــ عزیز مرزا

(۱۲) ـــ سفرنامہ ـــ ابن بطوطہ

(۱۳) ـــ چین و ہند کے تعلقات ـــ بدرالدین حی

BIBLIOGRAPHY

ARISTOTLE,;POETICS

BURNETT,:EARLY GREEK PHILOSOPHY

CERAM,C.W.:GODS,GRAVES & SCHOLARS.

CHRISTENSON.:HISTORY OF THE SASSANIDS.

DAYAL,HAR.:HINTS FOR SELF CULTURE.

DUBOIS,ABBE,:HINDU CUSTOMS,MANNERS AND CEREMONIES.

DURANT,WILL.:OUR ORIENTAL HERITAGE.
LIFE OF GREECE.

FRAZER,J.G.:THE GOLDEN BOUGH.

FRAZER,J.G.:ADONIS.

GROUSSET,RENE.:CIVILAZATIONS OF THE EAST

HERODOTUS,:HISTORY.

HITTI,P.K:HISTORY OF SYRIA.

HITTI,P.K.:HISTORY OF LEBANON.

JOAD,C.E.M.:TESTAMENT OF JOAD.

KRISHNAN,RADHA.:INDIAN PHILOSOPHY.

MEW,JAMES.:TRADITIONAL ASPECTS OF HELL.

OLD TESTAMENT

PLATO,:DIDOGENES.

PLUTARCH,:LIVES.

SPENCE,LEWIS.:MYTHOLOGY.

YUTANG,LIN.:MY COUNTRY AND MY PEOPLE.

YUTANG,LIN.:WISDOM OF INDIA AND CHINA.

سید علی عباس جلالپوری کی فکری کتابیں

مقالات جلالپوری

رسوم اقوام

خرد نامہ جلالپوری

جنسیاتی مطالعے

عام فکری مغالطے

تاریخ کا نیا موڑ

روایات تمدن قدیم

روح عصر

کائنات اور انسان

اقبال کا علم کلام

مقامات وارث شاہ

روایات فلسفہ

وحدت الوجود تے پنجابی شاعری

سبدِ گلچین

تخلیقات

6۔ بیگم روڈ، لاہور فون 042-7238014

Email: takhleeqat@yahoo.com www.takhleeqatbooks.com

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوُٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنيٰ e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاريِ تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. بين لفظن ۾ پَنَ کا خُصوصي ۽ تالي لڳل کِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيِٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي ڪُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمتائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، چاڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ باروڊَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جِئن جِئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛

ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موتي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالههَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿيِ، هي بَم- گولو،

جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،

جنهن رِڻ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄاڻائي کي پاڻ تي اِهو سوچي مڙهڻ تہ ”هاٿي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڙهڻ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَرَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ بين

ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چـو، چـالاءِ ۽ ڪـينئـن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽـٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَـنَ پَـنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)